نومبر 2017

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ



سلسلے وار تحریر

زندہ موتی

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیرِ اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

MEMBER
APNS رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز





نومبر 2017ء قیمت 40 روپے جلد 47 شمارہ 07

ضمیر کی خلش

ایک عادی مجرم کے جیل سے رہا ہونے کا قصہ، جو اپنی سابقہ روش اپنائے ہوئے تھا

غلام

قتل کی ایک واردات کا قصہ، جس کے پس منظر میں کئی راز تھے

ناسور

نیکی اور بدی کی قوتوں کی ازلی پیکار کے ایک محاذ کا احوال

اُلٹ پھیر

بارش اور طوفانی رات میں گھر جانے والے اکمصنف کو پیش آنے والے واقعا ت کا پر تجسس احوال

شب جنوں

خیر و شر کی دلچسپ آنکھ مچولی کا احوال ایک قاتل کی کہانی

اظہار ذات

بھوجل دلوں کے لیے اکسیر ایک شوق و چنچلک ہنستی مسکراتی تحریر



آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

زندہ مورتی

پانچویں اور آخری قسط

ایم۔اے۔ راحت

ایم اے راحت اردو ادب کے چند بڑے ناموں میں سے ایک نام ہیں، آٹھ سو سے زائد ناولوں کے لکھاری، کالا جادو، ناگ دیوتا، کمند، کالے گھاٹ والی کفن پوش، صندل کے تابوت ان کی دیو مالائی تخلیقات ہیں۔

انہوں نے بچوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھیں۔ جب کہ تلفظ اور املا کے ساتھ ایسی لفاظی کی کہ بچے باآسانی پڑھ کر ان کے گرویدہ ہوئے۔

عمران ڈائجسٹ کے لیے بطور خاص انہوں نے ایک اچھوتی تحریر لکھی ہے جو وہ اپنی زندگی میں مکمل کر کے گئے تھے جو یقینا عمران ڈائجسٹ ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔

قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی طرف سے ایک خاص تحفہ





ریاض صاحب کے گھر والوں کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے چھوٹے تھے اور اسکول میں پڑھتے تھے۔ البتہ بیٹی جوان تھی اور کالج جاتی تھی اور ان کو اسکول و کالج اور بازار وغیرہ لے کر جاتا تھا اس دن ان کی بیٹی مریم باہر آئی۔ کڑی دھوپ کا وقت تھا۔ ریاض صاحب آفس میں موجود تھے۔ باقی سب گھر پر تھے۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی میں نے گاڑی کو پالش کر رہا تھا۔ قریب آکر اس نے کہا۔

"شاہو...."

"جی مریم بی بی...."

"چلنا ہے ذرا...."

"کہاں مریم بی بی...."

"اپنی ایک دوست کی طرف.... یہ چوکیدار کہاں سو گیا۔ چلو گیٹ میں کھول دیتی ہوں۔" میں نے گاڑی ریورس کر کے باہر نکالی اور مریم گیٹ بند کر کے گاڑی میں آ بیٹھی۔

"رستہ میں بتاتی رہوں گی.... فی الحال سیدھے چلو۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی شہر سے باہر آ گئی۔ میں نے چونک کر کہا۔

"بی بی جی...."

"چلتے رہو بس تھوڑا سا اور جانا ہے۔" تھوڑی دور جا کر ایک جگہ گاڑی رکوائی۔ سنسان سا علاقہ تھا۔ آس پاس اکا دکا گھر تھے۔ پھر میں نے بیک مرر سے دیکھا۔ وہ چہرہ.... وہ چہرہ خدا کی پناہ.... کار کی سیٹ پر مریم موجود نہیں تھی۔ بلکہ اس کی جگہ کرشنا بیٹھی تھی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"ارے بالک.... کرشنا رانی سے کیسے پیچھا چھوٹے گا تیرا.... کرشنا تو پاتال کی گہرائیوں تک پیچھا کرے گی تیرا.... دھوکا کیا ہے تو نے میرے ساتھ پاپی۔ دھوکا.... ارے کیا جاتا تیرا اگر تو مجھے اس لڑکی کا خون دے دیتا.... سنسار کے سارے عیش تیرے قدموں میں ہوتے.... پر نہیں.... بجائے اس کے تو میری بات مانتا تو ان پاپیوں کے پھیر میں آ گیا۔ خیر انہیں بھی دیکھ لوں گی۔ پہلے تو مجھے خون لا کر دے گا اس کا.... اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میں تجھے چھوڑوں گی نہیں.... جینا حرام کر دوں گی تیرا...."

خوف کے مارے میرے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ چیخنا چاہتا تھا، لیکن میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اچانک میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ وہ بھی جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ میں نے نیچے اترتے ہی ایک جانب دوڑ لگا دی۔ وہ بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔ پوری قوت سے شور مچاتی ہوئی۔

"ارے کہاں جائے گا بچ کر...." میں بھاگتا رہا.... بھاگتا رہا۔ پھر اچانک ہی ایک پتھر سے ٹکرا کر گر گیا۔ گرتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے اصل روپ میں تھی.... آہ.... اس کا چہرہ.... میں اپنی تکلیف بھول گیا جو گرنے کی وجہ سے میرے پاؤں پر لگی تھی اور اٹھ کر پھر سے بھاگنے لگا۔

پھر دور سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں بھاگ کر سڑک کے درمیان آ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ خوش قسمتی کی بات تھی کہ بس کا رخ ہمارے شہر کی جانب تھا۔ بس رکی تو کنڈیکٹر نیچے اترا۔

"بھائی کیا اوپر جانے کی بڑی جلدی ہے...."

"نہیں بھائی.... شہر پہنچنے کی جلدی ہے...."

"اچھا چلو بیٹھو گاڑی میں...." اور میں لپک کر بس میں بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اس جگہ دیکھا جہاں کرشنا میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ بہرحال جیب میں پیسے موجود تھے۔ ایک جگہ بس نے مجھے اتارا۔ یہاں میں ریاض الدین کے گھر جانے والی بس پر بیٹھ گیا اور وہاں جا کر اترا۔ چوکیدار نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"اوے.... تم کدر گیا تھا.... بی بی صاب کو باہر جانا تھا۔ تم بتائے بغیر چلا گیا۔"

"ابھی کچھ بتانے کا وقت نہیں ہے مجھے بی بی سے ملنا ہے...."
"وہ تو چلا گیا...."
"کہاں....؟"
"جہاں انہیں جانا تھا.... اگر ضروری کام ہے تو چھوٹی بی بی سے مل لو...."
"کس سے...."
"مریم بی بی سے...."
"وہ تو... وہ...." میں کہتے کہتے رک گیا پھر اندر گیا۔ ایک ملازمہ اندر جاتی نظر آئی میں نے اسے آواز دی۔
"کیا بات ہے...."
"مریم بی بی سے ملنا ہے.... کیا وہ اندر ہیں۔"
"ہاں کیوں....؟"
"ابھی تو وہ میرے ساتھ تھیں۔" میں نے کہا تو وہ یوں میری شکل دیکھنے لگی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ "کہاں تھیں تمہارے ساتھ۔"
"وہ میرے ساتھ باہر گاڑی میں بیٹھ کر...."
"تم نے کھایا کیا ہے آج.... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو.... خود ہی تو گاڑی دھونے کے لیے پیچھے لاکر کھڑی کی تھی بھول گئے ہو...."
"میں نے کھڑی کی تھی۔"
"ہاں جیسے ہر بار کھڑی کرتے ہو ویسے ہی کھڑی ہے۔"

میری عقل چکرا کر رہ گئی تھی۔ مریم بی بی بھی گھر پر ہیں تو میرے ساتھ کیا تھا.... آہ یہ سب کرشنا نے کیا تھا۔ صرف مجھے ڈرانے کے لیے.... وہ چاہتی ہے کہ میں کسی طرح اس کے کام کے لیے آمادہ ہو جاؤں.... پھر میں نے مریم کو دیکھا وہ ہمارے قریب آگئی تھی۔
"خالہ میں نے کب سے چائے کا کہا ہے اور تم یہاں باتیں کر رہی ہو.... شاہو تم نے چائے پی...."
"نہیں مریم بی بی...." میں اب بھی حیرانی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔
"چلو پی لو تم بھی.... خالہ اس کو بھی چائے بنا دو...."
"جی بی بی جی...."

وہ چلی گئی اور میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ اس عذاب سے جان چھوٹ گئی۔ مریم اور گاڑی دونوں موجود ہیں۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ یہ نوکری چھوڑ دوں.... نہیں میری وجہ سے اس گھر کے مکینوں پر کوئی مشکل نہ آجائے۔
"بیگم صاحبہ.... آپ لوگوں نے مجھے بہت پیار دیا ہے.... میرا خیال رکھا ہے۔ آپ کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن مجھے دوسرے شہر نوکری مل گئی ہے اور مجھے وہاں جانا ہے۔" بیگم صاحبہ حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگی۔
"اس طرح اچانک...."
"جی بی بی.... بس مجھے جانا ہے۔"
"جیسے تمہاری مرضی...." پھر انہوں نے حساب کتاب کے بعد میرے بقایا جات مجھے دیے اور میں واپس آگیا۔ کمبخت میری جان کے پیچھے آگئی ہے۔ اب وہ مجھے مجبور کرے گی کہ میں ڈر جاؤں یا گھبرا جاؤں' لیکن میں پکا ارادہ کر چکا ہوں کہ میں اس کا کام نہیں کروں گا۔ بس دل میں ایک ڈر تھا کہ کمبخت کہیں سنبل کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔
میں گھر جانے کے بجائے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ ایک بیرا میرے پاس آیا اور بولا۔
"جی صاحب...."
"چائے...."
"اچھا صاحب...." اس نے کہا اور چلا گیا اور میں اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چائے لا کر رکھی۔ تو اس کے ناخن کالے اور لمبے تھے میں نے اس کی شکل دیکھی اور چونک گیا۔ پھر وہی کرشنا کا بھیانک چہرہ میرے سامنے تھا۔ پھر میرے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔
"ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے۔ ہٹاؤ اسے یہاں سے ہٹاؤ۔"
دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ میری جانب متوجہ ہوئے۔ پھر ایک بیرا میری جانب آگیا تھا۔
"جی سر کیا بات ہے کیا ہوا۔"

”یہ.... یہ اس کا چہرہ....“ میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”کیا ہوا سر....“

”اس کے ہاتھ۔ ناخن۔“ میں نے کہا اور پہلے والے ویٹر نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور دوسرے والے ویٹر کو کہا۔

”پہلی بار اتنا ماڈرن سائیں دیکھا ہے.... دیکھو یہ کھانے کو جو بھی مانگے دے دو بے چارہ۔“ اس نے انگلی سر کے قریب لا کر اشارہ کیا۔ میں غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میں وہاں سے نکل پڑا۔ کرشنا ہر جگہ میرے سامنے آرہی تھی اور ظاہر ہے ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لوگ مجھے باہر جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں بیرے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس رہے تھے۔ بہر حال یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ میرا عام چھل پیری سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خطرناک بلا تھی۔ اس نے عہد کیا تھا وہ مجھے نہیں چھوڑے گی.... ہر جگہ میرا پیچھا کرے گی.... پھر میں گھر پہنچ گیا۔ صوفی صاحب گھر موجود نہ تھے۔ اماں نے کہا۔

”کھانا لگا دوں بیٹا....“

”نہیں بھوک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا.... طبیعت تو ٹھیک ہے....“

”جی بالکل.... بس راستے میں برگر کھا لیا اس لیے بھوک نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مطمئن ہو گئیں۔ پھر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ سنبل آرام دہ کرسی پر دراز تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”کیا تم سو رہی ہو....“

”نہیں....“ اس نے کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں بالکل....“

”اچھا ایک بات سنو....“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اس کے سامنے جانے کیوں میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا جیسے مجھے کوئی پریشانی نہ ہو.... میری بات کے جواب میں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ لیکن اتنی بھیانک آنکھیں.... ان میں تو پتلیاں بھی نہ تھیں۔ بس آنکھوں کے ڈھیلے نظر آرہے تھے۔ اس نے کہا۔

”ہاں شاہو.... تم کچھ کہہ رہے تھے.... کہو نا۔“ وہ اٹھلائے ہوئے لہجے میں بولی اور میں خوف زدہ انداز میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جھٹکے سے اپنی گردن کرسی کی پشت سے ہٹالی اور میرے قریب آکر بولی۔

”بول کمینے.... کیا کہہ رہا تھا اپنی محبوبہ سے.... شادی کرے گا اس سے ہاں.... لے کر شادی....“ اس نے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔

”بول نا رے.... کتنی بے تاب ہے تیری محبوبہ.... تیری باتیں سننے کے لیے۔ کتنی بے قرار ہے، تڑپ رہی ہے۔ تیری باتیں سننے کے لیے.... بول کمینے....“

”آہ.... یہ کرشنا کی ہی آواز تھی.... وہ کتیا یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ پھر مجھے شاہ صاحب کی بات یاد آئی کہ وہ سنبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی بس مجھے صبر اور حوصلے سے کام لینا ہے۔

”کرشنا....“

”کیا رے کتے....“

”ہاں میں کتا ہوں، ذلیل ہوں۔ میں نے تیرے کہنے پر عمل نہیں کیا نا۔ تیری بات نہیں مانی.... تجھے دھوکا دیا....“

”بڑی دیر سے سمجھا تو....“

”ہاں سمجھ گیا ہوں....“

”پھر کیا ارادہ ہے تیرا....“

”ارادہ یہ ہے کہ تو مجھے جتنا بھی ڈرا دھمکا لے میں تیرا کام نہیں کروں گا۔“

”مار دوں گی.... دیکھ مار دوں گی اس لڑکی کو....“

”ارے جا جا.... اگر تو اس لڑکی کو مار سکتی تو کب کی مار چکی ہوتی۔ تجھے میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ کتنی کمزور ہے تو کرشنا....“

”لونڈے.... منہ نہ لگ میرے....“

”میں کب منہ لگ رہا ہوں تیرے۔ تو ہی پیچھے پڑی ہے۔“

"شاہو تو جس کے بل بوتے پر اتنا اکڑ رہا ہے میں اس کو بھی دیکھ لوں گی اور تیرا تو ایسا ناش کروں گی کہ لوگ جوتے ماریں گے تجھے.... اتنا بے وقعت ہو جائے گا کہ دنیا تجھے مارنے پر تل جائے گی۔"

پھر اسی طرح کرسی پر ٹک گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ پھر اسی طرح خاموشی چھا گئی۔ وہ پرسکون ہو گئی تھی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا تماشا ہے۔ پھر اچانک ہی سنبل نے آنکھیں کھولیں لیکن اب اس کی آنکھیں اصل کیفیت میں تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم کب آئے شاہو...."

"ابھی آیا ہوں۔ تم آرام کر رہی تھیں اس لیے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اچھا...." پھر وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"شاہو.... تم پریشان لگ رہے ہو بات کیا ہے آخر...."

"کچھ نہیں.... کچھ بھی تو نہیں...."

"پھر بھی...."

"میں نے کہا نا کچھ بھی نہیں.... تم ماں جی کی مدد کیا کرو۔ سارا دن بے چاری اکیلی لگی رہتی ہیں۔"

"میں بہت کہتی ہوں، لیکن وہ کہتی ہیں کہ ابھی تم آرام کرو نئی نویلی دلہن ہو...." وہ کافی دیر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میں غائب دماغ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر صوفی صاحب آ گئے اور میں نے اکیلے میں اس کو آج پیش آنے والے واقعات بتائے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کافی دیر کے بعد مجھ سے لگے۔

"میری ایک بات مانو گے...."

"جی صوفی صاحب...."

"سنبل کو کچھ دنوں کے لیے تنہا چھوڑ دو.... بلکہ کچھ دن کے لیے اسے کمرے میں بند کر دو.... وہ صرف تمہیں تنگ کرنے کے لیے یہ حرکتیں کر رہی ہے۔ شاہ صاحب بھی جانے کہاں ہیں۔ وہاں اپنے ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ عزیزوں کے ہاں بھی پتا کروایا ہے۔ بہرحال جب تک مرشد واپس نہیں آتے یہ سب کرنا پڑے گا۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

جو کچھ نہ بھی ہوتا کم تھا۔ اب سنبل کو بند کرنا پڑے گا۔ اس پر یہ سب مصیبتیں میری وجہ سے آئی تھیں۔ ہم لوگوں نے اس کا جائزہ لیا وہ یوں ہی کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ ہم نے تمام کھڑکیاں اچھی طرح بند کیں اور دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سنبل کو مجھ سے دور کر دیا گیا تھا۔ وہ کیا سوچتی ہو گی کہ اتنے دعوے کرتا تھا اور ایک لمحہ کی خوشی بھی نہ دے سکا اور اب اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔

"کیا بات ہے شاہو.... پریشان ہو...." صوفی صاحب نے کہا۔

"کیا کہوں.... آپ بھی میری وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے۔"

"ایسا سوچتے ہو تم...."

"اور کیا سوچوں...."

"ہمارا کوئی اولاد نہیں.... تمہیں پیار سے بیٹا کہا نہیں ہے۔ سمجھتا بھی ہوں اور تم ایسی باتیں کرتے ہو۔"

"بجائے یہ کہ آپ کی خدمت کرتا.... آپ کو مشکل میں ڈال دیا۔"

"اگر تم سچ مچ ہمارے بیٹے ہوتے تو کیا ہم تم کو اس گھڑی میں چھوڑ دیتے...."

"وہ تو ٹھیک ہے...."

"یا پھر یہ کہو.... کہ تم نے ہمیں دل سے اپنا نہیں سمجھا...."

"ایسی بات نہیں ہے...."

"پھر کیا بات ہے...."

"میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں...."

"مجھے بتائیں میں کیا کروں.... نوکری بھی جلد بازی میں چھوڑ دی۔ اب افسوس ہو رہا ہے۔"

"اصل میں، میں نے تم سے کچھ نہیں کہا کہ تم یہ نہ سوچو کہ میں تمہیں نوکری پر مجبور کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تم نوکری کرتے رہتے.... حالات

جو بھی پیش آتے ہم نے اس کا سامان کرنا ہی ہے۔"
"ڈر گیا تھا۔۔۔"
"کیوں۔۔۔"
"یہ سوچ کر کہ ان کو میری وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ وہ سب اتنے اچھے ہیں کہ اگر ان کو میری وجہ سے نقصان پہنچتا تو میں خود کو معاف نہ کرتا۔"
"لیکن بیٹا جس طرح زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے تم نے۔۔۔ نوکری تو کرنا پڑے گی کہیں نہ کہیں یا اپنی دنیا میں واپس جاؤ گے۔۔۔"
"اللہ نہ کرے۔۔۔ چاہے مجھے کوڑھی ہو کر سڑکوں پر نہ آنا پڑے۔ میں اس کمبخت کی بات نہیں مانوں گا۔ وہ مجھ سے میرا ایمان چھیننا چاہتی ہے۔ وہ بہت معمولی سا آدمی ہوں۔۔۔ فقیروں کے درمیان زندگی گزاری ہے، لیکن میرے دل میں اپنے مذہب کا جو مقام ہے اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس شیطان صفت عورت کو میں اس کے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔ پتا نہیں اس نے میرا انتخاب کیوں کیا وہ کسی اور سے بھی یہ کام کروا سکتی تھی۔"
"اب یہ تو اللہ ہی جانے۔۔۔ بہرحال امتحان تو ہر شخص کا ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم اس امتحان میں کس حد تک سرخرو ہوتے ہو۔۔۔ تمہیں صرف اور صرف حلال روزی کمانی ہے۔ تم فکر نہ کرو تمہیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔۔۔ اللہ تمہیں کامیابی دے۔"
"پھر اب کیا کروں۔۔۔"
"جاؤ۔ اپنے لیے رزق تلاش کرو۔۔۔ یہ سب سے بہترین مشغلہ ہوتا ہے۔ اب جو چھوڑ دیا چھوڑ دیا۔۔۔ اب جو کرنا ہے اسی انداز میں کرتے رہو۔"
"جی۔۔۔" میں نے فیصلہ کیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے۔ مجھے کوشش جاری رکھنی ہے۔ میں گھر سے نکل پڑا اور نوکری کے لیے مارا مارا پھرنے لگا۔
اس دن میں نکلا ہوا تھا۔ گرمی بھی بہت شدید تھی۔ دوپہر کے وقت میں ایک سنسان علاقے سے گزر رہا تھا حالانکہ مطلب کچھ بھی نہیں تھا لیکن ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ ملازمت بھی نہیں ملی تھی اور کئی جگہ کوشش کے باوجود ملازمت نہ ملی تھی۔ عجیب ہو گیا تھا میں خود پر ہنستا رہتا تھا۔۔۔ سنبل میرے قریب تھی اور میں اس کی صورت کو ترستا تھا۔ صوفی صاحب کی بات رد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔۔۔ دل چاہتا اس کے پاس جا کر اسے حوصلہ دوں کہ یہ تھوڑا سا برا وقت میرے ساتھ کاٹ لے۔۔۔ مجھ سے بددل نہ ہو۔۔۔ تمہارے لیے دنیا کی ہر شے چھوڑ سکتا ہوں لیکن میں اسے یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا۔ جانے وقت کیسے گزرے گا۔
گرمی نے دماغ پگھلا دیا تھا۔ زبان پر کانٹے پڑ رہے تھے۔ سخت دھوپ تھی اور سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کدھر جاؤں، بڑی پریشانی کا احساس ہو رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حد سے بڑھ گئی تو میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی جگہ ملے جہاں تھوڑا سا پانی مل جائے۔ آسمان سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں تاریکیاں سی پھیلتی جا رہی تھیں۔ **دفعتاً** مجھے کچھ فاصلے پر سیاہ دھبے نظر آئے۔ غالباً" درخت تھے۔ میں درختوں کے اس جھنڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ عجیب سی جگہ تھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کون سے علاقے میں آ گیا ہوں۔ راستہ بھی نہیں بھٹکا تھا۔ جگہ بھی جانی پہچانی تھی۔ پھر بھی جگہ اجنبی لگ رہی تھی۔ راستے میں خاردار جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بعض جگہ درختوں کے ایسے جھنڈ تھے کہ راستہ بند ہو جاتا۔ پھر یہ دیکھ کر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑا اٹھی کہ وہ درخت نہیں اینٹوں سے بنی ایک عمارت ہے۔ میں یہ سوچ کر اس عمارت کی جانب چل پڑا کہ وہاں کوئی چوکیدار ہوگا اور اس سے پانی مل جائے گا۔ قریب پہنچنے پر عمارت کو دیکھا تو وہ کافی بڑی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ عمارت کو اپنے احاطے میں لے رکھا تھا عمارت کے اطراف میں عجیب سا سناٹا تھا۔
عمارت خاصی قدیم تھی اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی

تھی۔ اینٹوں کے ڈھیر بڑے بدنما لگ رہے تھے۔
دھوپ اتنی شدید تھی کہ اینٹیں بھی تپ رہی تھی۔ پتا نہیں یہاں کوئی موجود ہے بھی یا نہیں۔ میں دروازے پر پہنچا اور اس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ شدید گرمی سے بچنے کے لیے اس کے اندر داخل ہو گیا۔ اگر کسی نے کوئی اعتراض کیا تو معافی مانگ لوں گا۔
دروازے کے اندر جاتے ہی مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی جس کا اس گرمی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب ایک ویران سا صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر ایک اور بند دروازہ نظر آرہا تھا۔ میں اس دروازے کے قریب پہنچا۔ میں نے زور زور سے دروازے کو بجایا۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کا مطلب یہ تھا اندر کوئی موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک لمحہ کو میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کر دیکھوں۔ آہ کاش بس تھوڑا سا پانی مل جائے۔ اچانک دائیں جانب کی کھڑکی سی ہلکی سی چرچراہٹ ابھری۔ کسی نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھا۔ اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہاں کوئی ذی روح موجود ہے۔ اور یقیناً پانی بھی مل جائے گا۔ چنانچہ میں انتظار کرنے لگا۔ مجھ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز عجیب سی تھی جیسے زمین پر کوئی چیز گھسیٹ رہی ہو۔ پھر دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ابھری اور کسی نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا۔ مجھے سامنے ایک شخص نظر آیا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی جھرجھری دوڑ گئی۔
یوں محسوس ہوا جیسے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہو رہی ہو۔ وہ ایک چھوٹے قد کا مضبوط بدن کا آدمی تھا۔ اس کا گول چہرہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر کہیں بھی بال نہ تھا۔ نہ بھنویں۔ نہ مونچھیں۔ بڑا عجیب چہرہ تھا اس کا۔۔۔۔ اس کے پیچھے مجھے ایک عورت نظر آئی۔۔۔۔ عورت کا قد لمبا تھا۔ اور خوب صورت تھی۔ لیکن اس نے بھی سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں۔ ایسی عجیب آنکھیں دیکھ کر میرے دل میں خوف پیدا ہوا۔ مجھے اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ بڑی سفاک لگی تھی۔ جیسے کوئی بات ہی خوف ناک بات سوچ رہی ہو۔ اس کی آنکھیں میری نگرانی کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اسے دیکھا اور مجھے لگا کہ میرے سر کو جھٹکا سا لگا ہو۔ میں نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔۔۔۔ پھر میرے ہونٹ متحرک ہو گئے۔
”اس گرمی میں آپ لوگوں کو تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ بس ایک گلاس پانی مل جائے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ مجھے شدید پیاس لگی ہوئی ہے۔“
”اندر آجاؤ۔۔۔۔“ مرد کی بھاری آواز سنائی دی اور میرے قدم خود بخود دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ اگرچہ میں مکان کی ہیبت اور اس کے مکینوں کے چہرے سے خوف زدہ تھا۔ میں نا چاہتے ہوئے بھی مکان میں داخل ہو گیا۔ مرد دوسری طرف چلا گیا تھا۔ عورت نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔۔۔۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ یہاں بے حد سردی تھی۔ باہر سے موسم مختلف تھا۔ مجھے اتنی سردی لگ رہی تھی کہ میرا بدن کپکپانے لگا۔ اس نے بڑے سے ہال میں اوپر جانے کے لیے ایک زینہ بنا ہوا تھا۔ جس پر شاندار قالین بچھا ہوا تھا عورت نے کہا۔
”آؤ۔۔۔۔“
”بس ایک گلاس پانی۔۔۔۔“
”ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔“
اس نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک گلاس پانی کے لیے وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ بہرحال میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ عجیب سے انداز میں سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ میرے دل میں خوف سا پیدا ہوا۔ لیکن میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی قوت مجھے اوپر لے آئی ہو۔ پھر اس نے اوپر پہنچنے کے بعد ایک دروازہ کھولا۔ اور اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ اندر بڑا آرام

وہ بستر لگا ہوا تھا۔ وہ رک گئی اور بولی۔

”آؤ بیٹھو میں تمہیں پانی دیتی ہوں....“

اس کے ہونٹوں پر وہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

میں اندر پہنچا تو وہ باہر نکل گئی۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ مجھے شدید خوف محسوس ہوا جب دروازہ باہر سے بند ہوگیا۔ میرے خدا.... کہاں آپھنسا ہوں میں.... عجیب سا ماحول تھا۔ خوف کی لہریں میرے سارے وجود کو جکڑ رہی تھیں۔ آہ۔ کاش ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل جائے اور میں یہاں سے چلا جاؤں.... پتا نہیں کیا ہوگا۔ میں کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ مرد اور عورت.... ویران مکان میں کیا کررہے ہیں.... جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ انسانوں جیسے نہیں۔ کیا میں پھر بدروحوں کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔

میں نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ ایک طرف ایک دروازہ نظر آیا جس میں کوارٹر نہیں تھا.... عورت اگر پانی لینے گئی ہے تو اس نے دروازہ کیوں بند کردیا۔ میں اس دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور دروازے کے اندر جھانکا۔ دوسری طرف انتہائی بدنما کمرہ تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں باہر جھانک رہی تھیں بلندی پر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ جس سے روشنی آرہی تھی۔ یہ کمرہ بھی بے حد ٹھنڈا تھا۔ میں ابھی محسوس کررہا تھا کہ مجھے اچانک لگا کہ پانی کی دھار زمین پر گر رہی ہو۔ میں نے نگاہیں دوڑائیں تو مجھے قریب ہی ایک غسل خانے جیسا کمرہ نظر آیا۔ میں تیزی سے اس جانب بڑھا۔ پانی کی آواز نے میری پیاس اور شدید کردی تھی۔ کمرے کی روشنی مدہم ہونے کی وجہ سے میں کمرے کا جائزہ نہیں لے سکا.... بہرحال اتنا ضرور ہوسکتا تھا کہ میں غسل خانے میں داخل ہوجاؤں۔ چنانچہ میں داخل ہوگیا۔ میں نے نگاہ دوڑائی۔ ایک اونچی ٹونٹی سے مدھم دھار گر رہی تھی۔ میں نے اس دھار کو اپنے ہاتھوں میں پکڑنے کی کوشش کی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے لگا جیسے پانی میں بو شامل ہوا اور یہ پانی گاڑھا سا تھا۔ پتا نہیں کیا قصہ ہے۔ عورت کا انتظار ہی کرلوں.... چنانچہ میں اس غسل خانے سے نکل آیا۔ پانی کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے دونوں ہاتھ سامنے کیے۔ تو میرا سانس رک گیا.... یہ پانی نہیں تھا۔ یہ سرخ سرخ خون تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی۔ اور میں دروازے کی جانب بھاگا۔ پھر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ او میرے خدا.... پانی کی ٹونٹی سے رستا ہوا خون.... میری دماغی قوتیں سلب ہوتی جارہی تھیں.... مجھے یہ سب ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ خون کے بڑے بڑے دھبے اوپر سے گرتے ہوئے میرے بدن سے لپٹ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں.... میں دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ جہاں مسہری چھوڑ کر گیا تھا۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے حلق سے باہر نکل آیا ہو۔ لگتا تھا میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں اس خون آلود لباس کے ساتھ باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا.... اوپر سے دروازہ باہر سے بند تھا۔ **دفعتاً** مجھے آہٹ سنائی دی۔ اور میں پھرتی سے پیچھے ہٹا۔ میں آنکھیں پھاڑے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر کسی نے ہینڈل گھمایا۔ اور بنا آہٹ کے دروازہ دو انچ کھل گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میرا پورا بدن پسینے سے تر ہوگیا تھا آہ یہ ہیبت ناک اور بھیانک خاموشی.... میں.... میں یہاں سے نہیں نکل سکوں گا۔ میری دانت بری طرح بج رہے تھے اور ایک کیفیت میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میرے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکلی۔ دروازہ ایک دم سے کھلا اور بند ہوگیا۔ میں خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پھر دیر تک میں اپنے مفلوج بدن کو جنبش دینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بدن پتھرا گیا تھا جیسے میرے بدن میں خون منجمد گیا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کوئی ترکیب بھی ذہن میں نہیں آرہی تھی۔

دماغ اور آنکھوں پر بوجھ سا پڑتا جارہا تھا۔ آہ! میں

اس عمارت میں مرجاؤں گا۔ میں ایک آسیبی جال میں پھنس گیا تھا پیروں میں جان ختم ہوتی جارہی تھی۔ میں دیوار سے لگا کھڑا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اب پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنا بوجھ اٹھا سکوں۔ ذہن بند ہوتا جارہا تھا۔ زبان پر چھالے سے پڑگئے تھے۔ کافی دیر تک میں ایسے ہی بیٹھا رہا پھر ہمت کرکے آنکھیں کھولیں لیکن جلدی سے بند کرلیں ایک تیز روشنی کا احساس سا ہوا تھا۔ جو سیدھی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دوبارہ ہمت کرکے آنکھیں کھولیں پھر نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا اور چونک سا گیا۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں بند تھا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا جو چاروں طرف سے سپاٹ تھا اور سب سے خوف ناک چیز جو اس کمرے میں موجود تھی وہ ہیبت ناک جسم تھے ان میں سے کسی کا بھی سر نہیں تھا۔ کسی کے دانت آٹھ انچ نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ کسی کا منہ جلا ہوا تھا۔ کسی کی ایک آنکھ کی جگہ گڑھا تھا۔ کچھ کی زبانیں لٹکی ہوئی تھیں۔ کسی کے جبڑے کا گوشت نظر آرہا تھا۔ کسی کی آنکھوں کے ڈھیلے چہرے پر پڑے ہوئے تھے۔ اس منظر نے میرے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ میں اچھل کر کھڑا ہوگیا..... میں نے گھوم کر پیچھے کی دیوار کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں..... جو کچھ میں نے دیکھا میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ قطار میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے درمیان ایک سنگ مرمر کا تخت بنا ہوا تھا اور اس تخت پر کرشنا رانی بڑے رسان کے ساتھ براجمان تھی۔ اس وقت وہ اپنی اصل حالت میں تھی۔ سر پر تاج پہنے وہ راج کماری لگ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا ایک جانب سے ایک شخص اٹھ کر آگے بڑھا۔ اس شخص کی داڑھی بھی جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی۔ چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ چلتا ہوا درمیان تک آگیا۔ اب میرا اور اس کا فاصلہ ایک گز کا رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"بالک..... تیرا نام شاہو ہے نا....."

"ہاں..." میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"اور [illegible] جانتا ہے....."

"ہاں..." میں اسی انداز میں بولا۔

"جھوٹ بولتا ہے..... جھوٹ بولتا ہے یہ....." کسی کونے سے آواز آئی۔ اور میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بھی ایک مکروہ شکل کا بونا تھا۔ بوڑھے نے اس کی طرف رخ کرکے کہا۔

"مرلی تم چپ رہو۔ اس سے بات کررہا ہوں نا میں..... ہاں تو بالک یہ سچ ہے کہ تم کرشنا کو نہیں جانتے..... کرشنا..... ریاست چندنا کی راجکماری تھی..... بڑی شان تھی اس کی بڑی خوب صورت تھی وہ..... پھر اس کے رشتے آنے شروع ہوئے..... لیکن اس نے اپنی ہی ریاست کے ایک زمیندار کے بیٹے کو پسند کرلیا۔ اور من ہی من میں اس کو چاہنے لگی تھی۔ پھر رسم و رواج کے مطابق اس لڑکے نے اپنا رشتہ بھیجا..... لیکن کرشنا کے باپ نے بڑی صفائی سے انکار کردیا۔ دونوں طرف سے بات کو پی لیا گیا۔ اور عام لوگوں تک بات نہیں پہنچنے پائی۔ یہاں تک کہ کرشنا اور جیون کو بھی اس بات کی ہوا نہ لگنے دی۔ ایک دن جیون نے پھر اصرار کیا کہ اس کا رشتہ لے کر جایا جائے۔ تو اس کے باپ نے بتایا کہ وہ رشتہ لے کر گیا تھا۔ لیکن کرشنا کے باپ نے اسے بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا..... یہ سن کر جیون غصے سے آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اور ایک دن جب کرشنا اس سے ملنے کے لیے آئی تو اس نے اسے پہاڑی سے نیچے گرادیا۔ اور وہ مرگئی۔ مرتو گئی تھی۔ لیکن اس کی آتما بے قرار تھی۔ اسے دھوکے سے مارا گیا تھا۔ پھر وہ پریت آتما بن گئی..... اس کے پیر الٹ گئے اور اس نے کالی مائی کی پجارن بننے کا فیصلہ کرلیا۔ کالی مائی کے پجاری ایک عرصے تک جادو سیکھتے ہیں..... پھر اپنے اپنے دشمن کا خون بھی پیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کو امر شکتی ملتی ہے۔ کرشنا کی آتما نے بھی عہد کیا تھا کہ جیون کے پریوار کے پانچ انسانوں کا خون پیے گی۔ پھر ایک دفعہ جیون کے دو بھائی میلے میں گئے۔ اور وہاں ایک شخص نے ان دونوں کو اغوا کرلیا۔ اور ایک مسلے کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس مسلے کو

یہ دونوں بچے بھاگ گئے اس نے دونوں کو مسلمان نام دیئے۔ اور ان کی پرورش اسلام کے مطابق تھی۔ ان دونوں بھائیوں میں سے ایک دوسرے دیش چلا گیا۔ جبکہ دوسرا اور اس کی بیوی ایک گھٹنا میں مارے گئے۔ ان کی ایک بچی تھی وہ بھی یتیم خانے میں بھیج دی گئی۔ اور وہ بچی ہی کرشنا کا پہلا شکار تھی۔ وہ لڑکی سنبل ہے.... کرشنا کی بدقسمتی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا.... اسے خون حاصل کرنے کے لیے ایسے سہارے کی ضرورت تھی جو اس کا کام کرسکے۔ اس نے کئی لوگوں کو سمپورنی کا لالچ.... لیکن وہ لوگ جاپ مکمل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اور کرشنا بدلے کی آگ میں جلتی رہی.... تم جاپ میں کامیاب ہوئے.... لیکن تم نے اسے دھوکہ دیا۔ تم نے اس کا کام کرنے سے انکار کردیا۔ ارے تمہارا کیا جاتا۔ اگر تم کرشنا کو اس لڑکی کا خون دے دیتے....؟" اس دنیا میں ایسی ایسی خوب صورت لڑکیاں ملتیں جنہیں دیکھ کر تم حیران رہ جاتے.... پانچ لوگوں کا خون لانے سے تمہیں ایسی شکتی ملتی کہ تم عمر بھر تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم نے کرشنا کو دھوکہ دیا.... لیکن ہم تمہیں ایک اور موقع دینا چاہتے ہیں.... کہ تو اس کام کے لیے تیار ہوجا.... تیرے جیون میں بھی کایا جال ہے۔ اگر تو کرشنا کے ساتھ نہ جاتا تو کایا جال میں نہ پھنستا.... لیکن اب تیرے لیے کوئی راستہ نہیں.... تجھے یہ کام کرنا ہوگا.... بہرحال میں...."

میں اس ماحول سے بری طرح خوف زدہ تھا۔ کرشنا کی کہانی اب کھل کر سامنے آئی تھی۔ بہرحال اس کے ساتھ بھی ظلم ہوا تھا۔ اس نے دل سے اس لڑکے جیون کو چاہا تھا لیکن اس نے صرف اپنے ماں باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اسے جان سے مار دیا۔ اور اب.... اب کرشنا اس کے خاندان کے پانچ افراد کا خون چاہتی ہے.... لیکن میں.... میں کیوں اس کی مدد کروں.... یہ بھی تو وہی سب کچھ کررہی ہے جو اس لڑکے نے کیا.... نہیں میں اس کی مدد نہیں کروں گا.... پھر مارنے کے لیے کسے کہہ رہی ہے سنبل کو.... اگر یہ لوگ مجھے جان سے مار بھی دیں تو میں تب بھی سنبل کو نہیں ماروں گا.... اور اس خیال نے ایک بار پھر مجھے باہمت کردیا تھا۔ میرے خوف کی کیفیت زائل ہوتی جارہی تھی۔ بوڑھے نے پھر کہا۔

"لڑکے پھر تو نے کیا سوچا...."

"سوچنا کیا ہے.... میرا فیصلہ وہی ہے جو پہلے دن تھا۔ یعنی میں سنبل کا خون نہیں کروں گا...." میں نے اچانک کہا اور چاروں طرف سے ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب بھیانک انداز میں ہنس رہے تھے۔ میں ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے کرشنا کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اس کی آنکھوں میں وہ غیظ و غصہ نہیں تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ اداسی تھی جیسے وہ التجا کررہی ہو۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کردیا۔ اس کے بعد بولی۔

"شاہو.... شاہو دیکھ.... اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میری کہانی تیرے سامنے ہے.... کس طرح مجھے دھوکا دیا گیا۔ تم ہی بتاؤ.... کیا قصور تھا میرا.... اور اب تم بھی مجھے دھوکا دے رہے ہو۔"

"لیکن تم بھی تو انسانوں کی زندگی لینا چاہتی ہو...."

"وہ میرے دشمن ہیں...."

"میرے تو نہیں...."

"ہاں.... ہاں.... تیرے کیسے ہوسکتے ہیں.... تو پریم کرے ہے نا اس سنبل سے۔ لیکن تو سوچ مجھے نیا جیون مل جائے گا۔ کچھ تو ظلم کا بدلہ ہو...."

"ہمارے مذہب میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں.... ہمارے ہاں صرف ایک بار موت آتی ہے.... اس کے بعد زندگی کا تصور بھی نہیں، سب کو ایک بار ہی زندہ کیا جائے گا۔"

"تیرے مذہب میں تو سمپورنی کا حصول بھی ممکن نہیں۔"

"اور میں اس کے ذریعے حاصل ہونے والی ہر چیز چھوڑ چکا ہوں۔"

”بڑا پاک بنتا ہے تو۔۔۔ دیکھ مان جا۔۔۔ مان جا۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“

”نہیں تو کیا کرو گے تم لوگ میرا۔۔۔ مار دو۔۔۔ مار دو مجھے۔۔۔“

”دیکھ لڑکے ہم نہیں چاہتے کہ تیری جان کو کوئی نقصان پہنچے۔ یہ کرشنا رانی ابھی تک بڑا صبر کیے بیٹھی ہے۔ اگر یہ چاہے تو مار سکتی تھی تجھے۔۔۔“ بوڑھے نے کہا۔

”تو اب مار دے۔۔۔ میں نے کب منع کیا ہے۔۔۔“

”نہیں لڑکے ایسے نہیں ماروں گی تجھے۔۔۔ ابھی تو میں تجھے تڑپاؤں گی۔۔۔ تجھے کوڑھی بناؤں گی۔۔۔ پھر تیرے ہمدرد تجھ سے دور ہوتے جائیں گے۔ تو موت مانگے گا اور تجھے موت نہیں ملے گی تجھے۔۔۔ اب ہم تجھے اپنی مرضی سے ماریں گے تجھے۔۔۔ اپنی مرضی سے تیرا ناش کریں گے۔۔۔ ہاہاہا۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ اور باقی لوگ بھی ہنس رہے تھے۔ پھر میں ان لوگوں کو دیکھنے لگا تھا۔

اچانک ہی میرا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ پھر ایک عجیب سی تکلیف پورے جسم پر وجود پر چھانے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز اندر ہی اندر کاٹ رہی ہو۔ بے چین کر رہی ہو۔ پھر یہ تکلیف شدید ہو گئی کہ میں زمین پر گر گیا۔ اس تکلیف سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں اسی طرح زمین پر پڑا رہا۔ پھر میری تکلیف ذرا کم ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ منظر پھر تبدیل ہو گیا۔ اب نہ وہ کمرا تھا نہ وہ جگہ۔۔۔ نہ ہی وہ لوگ۔۔۔ میں ایک کھلے میدان میں تھا۔ پھر میں نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ آس پاس مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ مکان تو جانے پہچانے تھے۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ اب میری تکلیف بالکل ختم ہو گئی تھی۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ارے یہ کیا۔ اس کا مطلب۔ اس کا مطلب۔۔۔ ان لوگوں نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے آخری بار مجھے سمجھایا تھا۔ اور اب۔ اب وہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ خیر اب مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔۔۔ بس وہ سنبل کو نقصان نہ پہنچائیں۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ اس خیال کے تحت میں جلدی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

میں اندر کمرے میں داخل ہوا۔ تو وہاں صوفی صاحب اور ماں جی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور چونک پڑے پھر صوفی صاحب نے کہا۔

”کہاں چلے گئے تھے شاہو۔ یہاں ہم لوگ کتنے پریشان تھے۔۔۔“

”سنبل۔۔۔ سنبل کہاں ہے۔۔۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔ اور خیریت سے ہے۔۔۔“

”اس کی جان کو خطرہ ہے۔۔۔ وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔۔۔“

”لیکن تم کہاں تھے۔۔۔“

”بس وہ ایک چکر میں پھنس گیا تھا۔“

”تمہارے پیچھے شاہ صاحب آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تم کسی مصیبت میں ہو۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم اس مصیبت سے چھٹکارا پاسکو گے یا نہیں۔۔۔“

”ٹھیک کہہ رہے تھے وہ۔“ میں نے کہا پھر اپنے ساتھ ہونے والے سارے واقعات ان کو بتائے۔ ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر صوفی صاحب نے کہا۔

”اب تک جو واقعات تمہارے ساتھ پیش آئے۔ تم نے ان کے ساتھ جس طرح مقابلہ کیا۔ ان کے تحت یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ تم واقعی اہل ایمان ہو۔ ایمان کسی عالم یا کسی اور کی میراث نہیں۔۔۔ یہ تو نظر کرم کی بات ہے۔ بس جس پر نظر ہو جائے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جیت حق کی ہوگی۔۔۔ تم حق پر ہو۔ تم نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔۔۔ کسی کو نہیں مارا۔۔۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لیے جیت تمہاری ہوگی۔۔۔ صرف تمہاری۔“

”اچھا یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔۔۔ تم نہالو۔۔۔ میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔۔۔“

”ہاں بیگم۔۔۔ ہمیں بھی خیال نہیں رہا۔۔۔ ہاں شاہو

اٹھو نہا دھو کر کھانا کھالو۔۔۔ اور پرسکون رہو۔۔۔ تم دونوں محفوظ ہو۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔۔۔"

"اب بھی کچھ ہونا باقی ہے۔۔۔"

"نہیں بیٹے۔۔۔ اب تو تمہارا وقت ہے۔۔۔ یوں سمجھ لو۔۔۔ تمہاری تکلیفیں ختم ہونے والی ہیں۔ اس منحوس بدروح کا انجام ہونے والا ہے۔۔۔ صبر کرو۔۔۔ ہمت کرو۔۔۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

صوفی صاحب کی باتوں سے بڑا سکون ہوا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ کرشنا اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں تھی۔ وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ نہ ہی اس نے سنبل کو ابھی تک نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے اپنے کام کے لیے میری ضرورت ہے۔ اور میں نے انکار کر دیا ہے۔۔۔ اب کیا ہوگا۔

بہرحال خود کو سنبھالنا تھا۔۔۔ دل کو سنبھالنا ضروری ہے۔۔۔ چنانچہ میں باتھ روم میں گھس گیا۔ بے اختیاری میں واش بیسن کا نلکا کھولا۔۔۔ پھر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔۔۔ اچانک مجھے خون کی دھار یاد آگئی۔ وہ خون کے دھبے جو اب بھی میری آستینوں میں موجود تھے۔ کافی دیر تک میں پانی کی دھار کو دیکھتا رہا۔ پھر مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ پانی ہے۔۔۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔۔۔ باہر آکر کپڑے لیے اور نہانے لگا۔ نہا کر مجھے کافی فرحت ہوئی۔ میں نے باہر جا کر وہ خون آلود کپڑے پھینک دیے۔ اور اندر آگیا۔۔۔ وہ دونوں کھانے پر میرے منتظر تھے۔"

"شاہو بیٹا کھانا تیار ہے۔"

"جی صوفی صاحب۔" میں نے کہا اور ہم سب کھانے والے کمرے میں آگئے۔ پھر میں نے کھانا کھایا جیسے برسوں سے نہ کھایا ہو۔ اچانک مجھے ان کا خیال آیا تو میں نے کہا۔

"معاف کیجئے گا مجھے۔۔۔ خیال نہیں رہا۔ آپ بھی کھانا کھائیں۔۔۔"

"ارے نہیں بیٹا۔ ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ تم کھانا کھاؤ۔۔۔"

اور میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے بعد سیر ہو کر پانی پیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں برسوں سے بھوکا ہوں۔۔۔ کھانے سے فارغ ہو کر ماں جی نے فوراً ہی چائے ہمارے سامنے لا کر رکھ دی۔ پھر انہوں نے تینوں کے سامنے چائے رکھی چائے کے دوران میں نے کہا۔

"سنبل کو دیکھا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔"

"ہاں۔ ہم اس کمرے کے روشندان کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہیں سے اس کو کھانا وغیرہ دے دیتے ہیں۔۔۔ ہم نے اس کمرے میں جانے کی کوشش نہیں کی شاہ صاحب نے منع کیا ہوا ہے۔ اس کمرے میں جانے کی کوشش نہ کی جائے۔ ورنہ بچی کو نقصان ہوگا۔"

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔"

"نہیں بیٹا۔۔۔ ابھی نہیں شاہ صاحب نے منع کیا ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔۔۔ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔۔۔ اگر وہ اسے مار سکتی تو خود مار لیتی۔۔۔"

"تم سوچ لو بیٹا۔ ہم لوگ تو ہر احتیاط برت رہے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ میں اسے ایک بار ضرور دیکھوں گا۔۔۔ میں نے کہا اور چائے کا کپ ایک طرف رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے صوفی صاحب سے چابی لی۔ اور پھر تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ آدھے کھائے ہوئے پھل چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر نیچے گری ہوئی تھی۔ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ اور سنبل بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ کیا تھا یہ سب۔۔۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے سنبل کو آواز دی۔

"سنبل۔۔۔ سنبل۔۔۔" لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے صوفی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ تشویش زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے پھر اسے آواز دی۔

"سنبل میری طرف دیکھو۔۔۔" اور سنبل کی گردن

گھوم گئی۔ آہ۔۔۔ یہ منظر اتنا ہیبت ناک تھا۔ کہ ماں جی کی چیخ نکل گئی۔ سنبل کا بدن دوسری طرف تھا اور گردن گھوم گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں غائب تھیں۔ سفید ڈھیلے نظر آرہے تھے۔ زبان باہر کو لٹکی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گردن پھر واپس کو گھوم گئی۔ پھر گھومی۔ اور پھر چرخی کی طرح گھومنے لگی۔ بڑا بھیانک منظر تھا۔ پھر وہ ہماری طرف مڑی۔ اب اس کی گردن صحیح رخ پر تھی۔ لیکن اس پر بس نہیں ہوئی۔ وہ اچانک ہی بستر سے اٹھنا شروع ہوگئی۔ ماں جی باہر نکل گئیں۔۔۔ سنبل بنا کسی سہارے کے فضا میں معلق ہوگئی۔ اس کے بال چھتری کی طرح پھیل گئے تھے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ پھر وہ واپس بستر پر پہنچ گئی۔۔۔ یہ سنبل کو کیا ہوگیا تھا۔ میری وجہ سے وہ اتنی اذیت میں تھی۔ میں نے بے اختیار صوفی صاحب کو کہا۔

”کیا ہے یہ سب۔۔۔ کیوں وہ سنبل کو اذیت دے رہی ہے۔۔۔ میں اب اور برداشت نہیں کرسکتا۔“ میں نے کہا تو وہ خاموش ہوگئے پھر بولے۔

”آؤ باہر چلیں۔۔۔ اسے یہیں چھوڑ دو۔“

”میرا دل نہیں چاہتا۔۔۔“ میں رونے لگا۔

”آؤ بیٹے۔۔۔ ضد نہ کرو۔۔۔“ اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ سنبل کی حالت میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں کیا کروں اس کے لیے۔

”مجھے بتائیں۔۔۔ کیا کروں میں۔۔۔“

”جو کچھ کہہ رہی ہے وہ کرسکو گے تم۔۔۔“

”میں صرف ایک کام کرسکتا ہوں۔۔۔“

”کیا۔۔۔“

”اپنی زندگی ختم کردوں۔۔۔“

”یہ بزدلی ہے۔۔۔ اور خودکشی حرام ہے۔۔۔“

”پھر بتائیں۔۔۔ کیا کروں۔“

”صبر اور انتظار کرو۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔۔۔“ انہوں نے تسلی دی۔

”لیکن سنبل اس حال میں کیوں ہے۔۔۔“

”اس کے جسم میں کرشنا ہے۔۔۔“ صوفی صاحب نے خوف ناک انکشاف کیا۔ اور میں کانپ کر رہ گیا۔ میرے دل کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ دل میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر کسی نے باہر سے دروازہ بجایا۔

”شاہو۔۔۔ باہر آؤ۔۔۔ مرشد آئے ہیں۔۔۔“ اور میں اچھل کر بیٹھ گیا۔

شاہ صاحب نے ہمدردی سے مجھے دیکھا۔ پھر افسوس بھرے انداز میں بولے۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔۔۔“

میں رو پڑا۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ”حوصلے سے کام لو۔ اللہ تمہاری مشکل دور کرے گا۔۔۔“

”اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔“

”ہمت رکھو۔۔۔ اور کرشنا رانی کی کہانی سناؤ۔۔۔“

”کرشنا کی کہانی۔۔۔“

”ہاں تم نے سنی تھی۔۔۔“

”آپ کو۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔“

”یہ سوال نہ کرو۔۔۔“

”جی۔۔۔“ میں نے کہا اور پھر ان کو راجکماری کرشنا کی داستان سنادی۔ انہوں نے غور سے سنا پھر بولے

”ہوں۔۔۔ تو یہ معاملہ تھا۔۔۔ اب سمجھ میں آیا وہ چڑیل بن گئی۔ اور اب وہ اپنا انتقام لینا چاہتی ہے۔ نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے کیا حق کہ ایک مسلمان بچی بچے کو تنگ کررہی ہے۔۔۔ صبح فیصلہ ہوجائے گا۔“

”فیصلہ۔۔۔؟“ صوفی صاحب نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ کیا سمجھتی ہے وہ خود کو۔۔۔ میں نے بہت وقت دے دیا اسے۔۔۔ لیکن اب نہیں۔۔۔ اٹھو صوفی انتظام کرو۔۔۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔“ وہ دونوں ہال سے باہر نکل گئے اور میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

صوفی صاحب کے گھر کے پچھلے حصے میں ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ کچھ دیر بعد ماں جی آئیں اور بولیں کہ صوفی

صاحب تمہیں ہال کمرے میں بلا رہے ہیں۔"
"جی ماں جی۔۔۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا باہر نکل کر ماں جی نے کہا۔
"ٹھہرو۔۔۔ ذرا باہر کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔"
"آپ کہیں جا رہی ہیں کیا۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ میں پڑوس میں جا رہی ہوں اور جب تک کوئی بلائے گا نہیں۔۔۔ نہیں آؤں گی۔"
"کیوں۔۔۔"
"تمہیں نہیں معلوم۔۔۔" انہوں نے کہا اور باہر نکل گئیں۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ پھر بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک طرف مرشد آلتی پالتی مارے کچھ پڑھ رہے تھے اور دوسری طرف صوفی صاحب دوزانو بیٹھے تھے۔ مرشد نے مجھے اشارہ کیا اور میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔
"یہ تعویذ جیب میں رکھ لو۔۔۔" انہوں نے ایک تعویذ مجھے دیتے ہوئے کہا اور "اب وہاں صوفی صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔۔۔ اور سنو۔" میں رک گیا۔
"کوئی بھی صورت حال ہو خوف زدہ نہ ہونا۔"
"جی مرشد۔۔۔" میں آگے بڑھ گیا پھر میں نے کہا۔
"دروازہ بند کر دوں۔۔۔"
"نہیں۔۔۔ اس کے پٹ کھول دو۔۔۔" وہ بولے تو میں نے حیرانی سے ان کی بات پر عمل کیا جانے کون آنے والا تھا۔ میں صوفی صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور مرشد کچھ پڑھنے لگے۔ خاصی دیر ہو گئی۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے کہ اچانک دروازے پر سایہ سا نظر آیا اور میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ پھر میری ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔ وہاں سنبل تھی۔ بالکل بے جان۔ ہلدی کی طرح زرد چہرہ۔ وہ اندر آ کر شاہ صاحب سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔
میں نے خود کو مشکل سے قابو رکھا تھا۔ سنبل کو دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔ پھر اچانک میں نے اس کے نقش دیکھے تو میرا خون خشک ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ مڑ گئے تھے اور دانت باہر آ گئے تھے۔
شاہ صاحب نے اسے دیکھا اور نرمی سے بولے۔
"تمہاری کہانی مجھے معلوم ہو چکی ہے اور مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن میں چاہتا ہوں ان بچوں کو پریشان نہ کرو۔ اس میں ان بچوں کا کوئی قصور نہیں۔۔۔"
"تو کون ہوتا ہے ہمارے بیچ میں آنے والا۔۔۔"
سنبل نے کہا آواز کرشنا کی تھی۔
"میں مسلمان ہوں۔۔۔ کیا اتنا کہنا کافی نہیں ہے۔"
"میں تمہارا ستیاناس کر دوں گی۔۔۔"
"میری بات مان لو کرشنا۔ آبادیوں کو چھوڑ کر ویرانیوں میں چلی جا اور آئندہ کے بعد مجھے آبادیوں میں نظر نہ آنا۔۔۔"
"اور آج تو میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔۔۔"
"پھر ٹھیک ہے وار کرو۔۔۔" مرشد کا لہجہ سرد ہو گیا۔
سنبل نے منہ کھولا اور میں نے دہشت بھری آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے منہ سے بے شمار لمبی لمبی زبانیں باہر نکل آئی ہیں اور شاہ صاحب کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ شاہ صاحب نے برابر رکھے ہوئے پانی کے پیالے میں انگلیاں ڈبو کر پانی کی چھینٹیں اس زبانوں پر ماری اور وہ جل کر خاکستر ہو گئیں۔ تب وہ دھاڑی۔
"آؤ۔۔۔ میرے ویرو۔۔۔ آؤ۔۔۔ ختم کر دو انہیں۔۔۔ مار دو ان تینوں کو۔۔۔" روشنی چمکی اور ننگ دھڑنگ بونے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ ان کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر وہ ہم سب کی طرف بڑھنے لگے۔
خوف سے میرا دم نکل رہا تھا۔ لیکن مجھے ثابت قدم رہنا تھا' میں نے آنکھیں بند کر لیں پھر مجھے بہت سی چیخیں سنائی دیں اور میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ میں نے دیکھا۔ سب بونوں کب گردنیں غائب ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کو مار رہے تھے پھر میں نے انہیں دروازے کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا۔
"بس یا اور کچھ۔۔۔" مرشد مسکرائے۔

"میں کہتی ہوں چلا جا۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ میں یہ شہر ویران کردوں گی۔"

"آخری موقع دے رہا ہوں کرشنا رانی۔۔۔ اس کے بعد تیرے لیے کوئی راستہ نہیں۔۔۔"

"تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پاپی۔۔۔" اس نے کہا اور شاہ صاحب نے پانی کا پیالہ سنبل پر اچھال دیا۔ وہ ایک لمحے کو حیران کھڑی رہی اور پھر اس کے بدن سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ اس آگ کو اپنے بدن سے نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ دلدوز آواز میں چیخ رہی تھی۔

"آگ۔۔۔ ہائے آگ۔۔۔ جل گئی۔۔۔ مر گئی۔۔۔" وہ بری طرح چلا رہی تھی۔

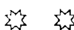
میں نے دیکھا سنبل کے پاؤں مڑے ہوئے ہیں۔ آگ اس کے خون کو جلا رہی تھی اور زمین پر قطرے ٹپک رہے تھے۔ پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ فضا میں گوشت جلنے کی چراند اٹھ رہی تھی اور میرا کلیجہ خون ہو رہا تھا۔ پھر اس کی چیخیں کراہوں میں بدل گئیں اور وہ زمین پر اوندھی لیٹ گئی شاہ صاحب اٹھے اور سنبل کو سیدھا کیا۔

"تم دونوں اٹھو اور اسے کمرے میں لے جاؤ۔ میں نے کرشنا کو خاکستر کردیا ہے۔۔۔ سنبل اب بالکل ٹھیک ہے۔" ان کا کہنا ٹھیک نکلا اور وہ دو گھنٹے بعد ہوش میں آگئی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔

شاہ صاحب اپنا کام ختم کرکے جا چکے تھے۔ صوفی صاحب اور ان کی بیگم بہت خوش تھے۔ اللہ نے ہماری مشکل حل کردی تھی۔ اب میں صوفی صاحب کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ دونوں میرے ماں باپ کی طرح ہیں۔

میں نے ایک ٹیکسی خریدلی ہے۔۔۔ ٹیکسی چلاتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔۔۔ کسی کو فقیر کو دیکھتا ہوں تو کچھ نہ کچھ دیتا ہوں کیونکہ وہی میرا اصل ہے۔

میرا ایمان ہے کہ محنت کی روزی اس کائنات کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ گندے علوم حاصل کرکے محل بھی تیار کرلیے جائیں تو وہ سکون نہیں ملتا جو خون پسینہ بہا کر کھانے میں ہے۔ دوسری بات یہ کہ انسان کو اپنا اصل کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ میری اور سنبل کی طرف سے آپ سب کو سلام۔





ایک معمر شخص ہر کام بڑے رکھ رکھاؤ سے کرتا تھا' ایک دن وہ حجام کی دکان پر گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے پہلے کوٹ پھر ٹائی اتاری اور نہایت نفاست سے ہینگر پر لٹکا دی۔ پھر قمیص کے دو اوپری بٹن کھولے اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

حجام کہنے لگا۔ "آپ بال کٹوانا چاہتے ہیں۔"

معمر آدمی نے کہا۔ "تو اور کیا۔"

"براہ کرم پھر اپنے سر سے ٹوپی بھی اتار دیجیے۔"

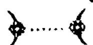


ماں اپنے چھوٹے بیٹے کے دماغ میں ریاضی کے پیچیدہ مسئلے بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ "تم یہ سوچو کہ دادا ابو' دادی امی' آپا اور منو کے ساتھ آئس کریم کھانے گئے ہو۔ تم دکان سے کتنی آئس کریم خریدو گے۔"

لڑکا کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔ "چار۔"

ماں نے غلطی درست کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھئی پانچ۔"

لڑکا اصرار کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں چار۔ میں بوتل پیوں گا۔"

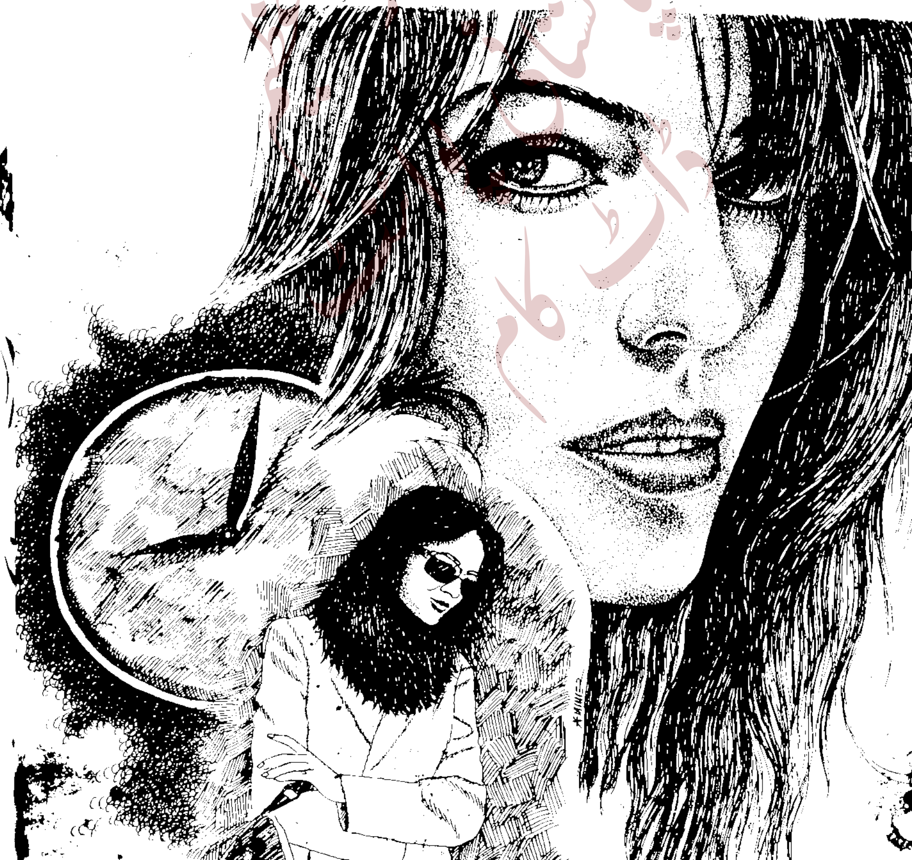


خونی پریم

ایم الیاس

عورت محبت ٹوٹ کر کرتی ہے ،انتظار بھی کرتی ہے ،بے رخی ،لاپروائی سب کچھ برداشت بھی کرتی ہے۔لیکن بے وفائی برداشت نہیں کرتی۔ کہتے ہیں ناکام عاشق اور بل کھاتی ناگن کا انتقام بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔اس میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔اس کی ناکامیوں نے اسے ایسی طاقت بخشی تھی۔جس کے بل پر اس نے اپنے پریم کو خونی پریم میں بدل دیا تھا۔

مردہ احساسات میں رشتوں کی بدصورتی اور محبتوں میں منافقت کا احوال





”کہانی جنم لیتی ہے تو وہ کسی بھی شہر‘ گھر‘ ملک‘ دور دراز افتادہ مقامات پر..... کہانی‘ کہانی ہوتی ہے۔
اس کہانی کا جنم ایک چھوٹے سے شروع ہوتی ہے۔ نصف صدی گزر جانے کے بعد وہیں ختم ہو جاتی ہے۔
صرف اس کہانی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا ہے بلکہ ہر کہانی کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ وہ خود ہی طے کرتی ہے کہ اس کا آغاز اور انجام کہاں‘ کب اور کیسے ہوگا۔
جس کہانی نے جہاں جنم لیا تھا اب وہ گاؤں یا قصبہ نہیں رہا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا گیا۔ صرف دنیا ہی میں بلکہ ہر سنسار میں ایسا ہوتا ہے۔ اب تو خیر وہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن پچاس سال پہلے وہاں ہزار دو ہزار گھر تھے ان میں بیشتر کچے تھے اور کچھ پکے بھی اور چند حویلی ٹائپ بھی جو ماضی کی کہانیاں سناتے تھے.....
آپ آج بھی کسی بھی سمت نکل جائیں ایسا ہی قصبہ آج بھی آسانی سے نظر آجائے گا۔ وہ لہلہاتے ہوئے کھیت ہوں گے جہاں فصل تیار کھڑی ہوگی یا کسان اگلی فصل کے لیے ہل چلا کر زمین تیار کر رہے ہوں گے۔ کسی جوہڑ‘ تالاب‘ ندی کنارے اور نالے پر کپڑے دھونے والی لڑکیاں عورتیں کپڑوں اور دل کا میل نکال رہی ہوں گی جس سے سینے میں بھرا غبار ایک ساتھ نکل رہا ہوگا اور ان کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہونے لگتے اور بڑی شانتی ملتی۔
”ساس کتنی کیسی چڑیل ہے۔ رات اس کا چہرہ دیکھو تو نیند اڑ کر رہ جاتی ہے۔“
”شوہر بھی کیسا جانور ہے۔ اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ میں دن بھر کام کر کے کیسی تھکی ہوئی ہوں.... کمر میں درد ہو رہا ہے۔ سارا دن ایک گھنٹہ بھی کمر سیدھی نہ کر سکی لیکن اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور بس اسے وحشیانہ انداز سے غرض پوری کرنے کی فکر ہو جاتی ہے۔ میرے کپڑے سارے اتار دیتا ہے۔ تن پر دھجی تک رہنے نہیں دیتا۔ میں کہتی ہوں کہ روشنی گل کردو لیکن سنتا ہی نہیں.... کہتا کہ عورت روشنی میں نہاتی ہے تو لطف آتا ہے‘ میں کہوں کہ ساس سسر اور اپنی جوان بہن کا خیال کرلو.... ان میں سے کسی نے جھری میں ہم دونوں کو باہم پیوست دیکھ لیا تو.....
بہو کیسی بے شرم ہے جو ایسے لباس میں ہوتی ہے کہ سب کچھ دکھاتی پھرتی ہے۔ بس چلے تو ستر پوشی بھی نہ کرے۔
”میری بھابھی اپنی پڑوسن سے بلیو فلمیں منگوا کر دیکھتی ہے۔ بچوں کو میرے پاس سلا دیتی ہے۔“
”دنیا کہاں جا رہی ہے! فلموں میں عورت کو جانور کی حالت میں دکھایا جاتا ہے اور ساس سسر بھی شوق سے دیکھتے ہیں۔ شاید وہیں پر ساس‘ بچوں‘ بہوؤں کا اور بہنوں کا اشنان بھی آزادانہ رہتا ہوگا۔“
”جیہ کو دیکھو.... اشنان کرتی ہے تو چولی بھی نکال دیتی ہے۔ اگر کوئی مرد جوان لڑکا آگیا تو.....“
”سرسوتی تو کون سی دنیا میں رہتی ہے.... ننگا پہناوا بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کا بس چلے تو بے لباس نکلیں۔“
اس قصبے کا نام پرکھوں نے آنند پور رکھا تھا جو آج وہی نام ہے۔
معمر اور عمر رسیدہ لوگ جو اسی اور سو برس کی عمر کے درمیان ہیں وہ بتاتے ہیں کہ آنند پور میں پہلے بجلی نہ تھی اور نہ ہی ٹیلی فون.... نہ ریڈیو تھا اور نہ ہی بے حیائی‘ عریانی اور جسم کی نمائش کرنے والا ٹی وی۔
آنند پور میں کیا مجال کہ اغوا کی واردات ہوتی ہو اور نہ قتل اور خون خرابا اور نہ ہی کوئی چاقو چھرا یا قلم تراش تک ہوتا تھا۔ نہ تو ڈاکا پڑتا تھا اور نہ ہی چوری ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی کسی مرغی‘ بکری اور گائے مانا لے جاتا تھا۔
نہ ہی کبھی زلزلہ آتا اور کئی دنوں تک مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی بھی سیلاب آتا اور ایک جھونپڑی تک بہہ جاتی یہ لوگ آہ بھر کے کہتے ہیں وہ وقت کتنا اچھا تھا اب آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔
ایک بھی پاپی مرد اور بدکار عورت لڑکی نہ تھی جس سے قصبہ سورگ بنا ہوا تھا۔

لیکن بڑے بوڑھے تو ہمیشہ ایسا ہی کہتے ہیں اور کہتے چلے آرہے ہیں۔

یعنی وہ بھی جو بچے سے بڑے ہوئے تھے اور سر پرست کے مرتبے پر قدم رکھ چکے تھے... پرکاش آنند دوٹوک الفاظ میں کہتا "آنند پور میں کبھی بھی بھولے سے کوئی نوجوان، شادی شدہ اور جواں سال عورت جاہے وہ تالاب، نہر اور ندی کے کنارے آزادی سے نہا کیوں نہ رہی ہو یا کسی ویران اور سنسان راستے سے اکیلی گزر رہی ہو۔

ڈکیتی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لوگ صبح سے شام تک گھر، دکان بغیر تالے کے چھوڑ جاتے تھے۔

چاہے کیسی ہی دشمنی، نفرت اور دیرینہ عداوت کیوں نہ ہو ایک دوسرے کو قتل کرنا تو در کنار زخمی تک نہیں کرتے تھے۔ آنند پور کے چوہدری امرناتھ نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ آنند پور میں اغوا، ڈکیتی، آبروریزی اور قتل جیسے سنگین جرائم کے آغاز کا ذمہ دار اشوک کمار ہے۔ وہ اشوک کمار نہیں جو ہندوستان کی فلمی دنیا کا مایہ ناز کیریکٹر ایکٹر تھا۔ راجا مانا جاتا تھا۔

یہ اشوک کمار جو اس کہانی کا ہیرو ہے۔ جو پہلے کوی تھا۔

اس کی عمر کے لڑکے پڑھنے بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جو زبردستی پرائمری اسکول میں بھرتی کروا دیے جاتے تھے وہ وہاں سے فراغت پانے کے بعد بھی وہی کرتے تھے جو ان کے پتا دادا کرتے آئے تھے۔

بکریاں چرانا گائے بھینسوں کو نہلانا... کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹانا... اس دوران جلد از بلوغت کی منازل طے کرنا اور ان میں شہوت اور لذت جو ہوتی تھی کسی لڑکے سے پیاس بجھا لیتے یا کوئی شادی شدہ گوالن جو سراب بیتی سے بھوکی پیاسی ہوتی تو یہ بھرپور، صحت مند اور توانا لڑکے ان کی ہر بات مان کر خوش کر دیتے تھے۔

عورت کے جسم سے ایسے آشنا ہوتے اور لطف و اندوز اٹھاتے کہ وہ گوالن عورتوں کی عمر میں نہیں دیکھتے تھے۔ یہ عورتیں انہیں دودھ بھی پلاتی تھیں۔

جب ان کے سرپرست جوانی کی غلط کاریاں اور کارد دیکھ لیتے تو ان کی خبر لینے کے بجائے وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں بھی کسی مے دوست یا گاؤں کی لڑکی سے بیاہ دیے جاتے تھے۔ چوں کہ یہ لڑکیاں بارہ تیرہ برس کی نورس کلیاں ہوتی تھیں اور گوالن عورتوں نے انہیں ایسی لذتیت سے آشنا کیا ہوتا تھا کہ وہ ان کی طرف نہیں جاتے تھے۔ کیوں کہ جانے کتنے مردوں اور لڑکوں کی دست درازیوں سے بدن اور تناسب ڈھل گئے ہوتے تھے۔ وہ بے کشش سی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ انہیں بد ذائقہ اور باسی کھانا لگتی تھیں۔ بدقسمتی سے اشوک کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہو گیا تو اس کے پتا نے مجبور ہو کر اسے قریب کے ایک شہر کے اسکول میں داخل کرا دیا وہ بڑا دور اندیش اور جہاں دیدہ تھا۔ کیوں کہ اس نے ایک روز بیٹے کو کھیت کے کنارے بنی کوٹھری میں ایک تیس برس کی عمر کی گوالن کے ساتھ دیکھ لیا تھا جو اس کے بیٹے کے ساتھ حیوان بنی ہوئی تھی اور اسے کھلونا بنایا ہوا تھا۔ اس عورت کو چار برس پہلے اس لیے طلاق ہو چکی تھی کہ وہ بانجھ تھی۔ اس کی گود ہری نہیں ہو سکتی تھی۔ جتنی جوان تھی اتنی ہی حسین اور پرکشش... وہ صرف پندرہ سولہ برس کے لڑکوں پر نظر رکھتی تھی۔ اس لیے کہ ان میں جوانی کی گرم جوشی ہوتی تھی۔

باپ کا خیال تھا کہ کہیں وہ اس گوالن کے جسم اور نشیب و فراز کا اسیر ہو کر تعلیم کی طرف توجہ نہ دے؟ لیکن بیٹے نے باپ کے اس اندازے اور قیاس کو غلط ثابت کیا۔ اس کا باپ بھی اپنی نوجوانی میں شادی شدہ عورتوں کا کھلونا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شباب کا نشہ اور عورت کا جسم اور اس کے نشیب و فراز ایک بار خون کی طرح منہ کو لگ جائیں تو شادی تک ان کا ذائقہ رہتا ہے۔ بیٹا ہر روز سائیکل پر دس کوس کی آمد و رفت کرتا رہا۔ سردی گرمی کی چنتا کیے بغیر... پرانی سائیکل کچے راستوں پر خراب یا پنکچر بھی ہو جاتی تھی جو اس وجہ سے وہ دوبار امتحان بھی نہ دے سکا۔ وہ ایک بار عین امتحانات کے زمانے میں وہ بیمار پڑ گیا۔ دوسری بار وہ

وقت پر امتحان کی فیس جمع نہ کرا سکا۔ اس میں ایسی لگن اور جذبہ اور جنون تھا کہ آخر کار اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو اس کے باپ نے مٹھائی تقسیم کی ....ماں نے بلائیں لیں۔

بہت جلد اس سوال نے جنم لیا تھا کہ اب وہ کیا کرے گا؟

اس کی عمر سترہ برس ہو گئی تھی۔ ماں کا ایک ہی خیال تھا جو ہر ماں کے دل میں بیٹے کو جوان دیکھ کر آتا ہے کہ اب بیٹے کا بالا خر بیاہ کر دینا چاہیے۔ اس کی نظر میں نصف درجن ایسی خوب صورت اور پیاری پیاری لڑکیاں تھیں جو بہو بننے کے معیار پر اترتی تھیں۔

لیکن باپ کی سوچ اپنی پتنی کے برعکس تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کام میں ہاتھ بٹائے۔ سونے کے زیورات بھی ڈھالے۔ شادی ہو جانے کے دو تین برس تک بیوی کا غلام بنا رہے گا۔ اس کی ناز برداریاں اٹھائے گا۔ کمانے کی سوچے گا بھی نہیں 'اصل میں عورت' اس کا جسم اور حسن کی کرشمہ سازیاں' قربت اور لمس دن رات کی باہم پیوستگی اس کا اسیر بنا دیتی ہے۔ وہ بھی تو اپنی پتنی کے ایسے ہی رسیا تھے ایک لمحے کے لیے ان کا دل اس سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا تھا۔

اشوک کی پہلی جھڑپ جو بڑی باقاعدہ اور زوردار تھی اپنی ماں سے ہوئی تھی۔

”وہ دیکھو.... شامو.... !میں تم سے آج ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔“

”پھر وہی شامو! تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میرا نام اشوک کمار ہے اور جب میں نے جنم لیا تھا یہ نام رکھا۔“ اس نے چڑ کے کہا۔ ”تم باز نہیں آتی ہو شامو شامو.... !یہ نام پسند تھا تو شامو ہی کیوں نہ رکھ دیا تھا۔“

”بکواس مت کر.... ہم پیار سے شامو کہتے تھے اور تو شامو ہی رہے گا۔ جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دے منے!؟“

”میں تمہاری اس تجویز پر غور کر رہا ہوں ماتاجی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہر بار یہی بات کہہ کر بڑی خوب صورتی سے ٹال دیتا ہے۔ آخر کب تک غور کرے گا؟ سر کے بال سفید ہو جانے تک؟ تجھ سے بڑی دو اور تین چھوٹی بہنیں اپنے گھر کی ہو گئیں.... دیپک تجھ سے ایک برس چھوٹا ہے۔ اس کی بیوی کا دوسرا بچہ ہونے والا ہے۔“

”تجھے سب معلوم ہے۔ لیکن میں اشوک کمار ہوں۔ آخر اتنی تعلیم کس لیے حاصل کی تھی میں نے ماتاجی! کیا غور کرنے کی بات نہیں؟“

”آدمی پڑھ لکھ کر کوئی کام نہ کرے کیا۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ شادی کر کے گھر نہ بسالے۔ بس سوچتا ہی رہے۔“ ماں نے ہزیانی لہجے میں کہا۔

”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔“ اشوک نے دروازے کا رخ کیا ”اس میں غلط کیا ہے؟“ ماں تیزی سے اس کی راہ میں حائل ہو کر بولی۔

”بہت غور کر چکے ہیں ہم بھی.... وہ تیرے باپ کا خیال ہے کہ رانی اچھی لڑکی ہے۔ چاند کا مکھڑا۔“

”پھر وہ خود اس سے شادی کر لیں۔ اگر ان کا دل اس پر آ گیا ہے۔“

”بے حیا.... بے غیرت.... وہ تیرے چاچے کی لڑکی ہے۔ اسے بیٹی کی طرح کھلایا ہے۔“ ماں نے اسے ایک دو ہتڑ مارے اشوک نے منہ بنایا جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز آ گئی ہو۔ پھر اس نے تلخی سے کہا۔

تم اس کی بات کر رہی ہو جس کا رنگ اور وزن بھینس جیسا ہے اور تم جانتی ہو کہ میری کبھی اس کے پتاجی سے نہیں بنی۔“

ماں ایسے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے ایک اور امیدوار کا نام پیش کر دیا۔ پھر دو ایک اور امیدوار.... یہ تینوں لڑکیاں بارہ اور پندرہ برس کے درمیان کی تھیں۔ جن لڑکیوں کے ہاں کھانا پینا اچھا ہوتا تھا۔ آسودگی اور فراغت تھی وہ دس گیارہ برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی تھی ورنہ عموماً گاؤں میں لڑکیاں گیارہ برس کے بعد ہی سیانی ہوتی تھیں۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جسمانی نشوونما کچے پھل سے پکے پھل میں تبدیل ہونے لگتا تھا۔ ان کی اٹھان غضب کی ہونے لگتی

تھی۔
ابھی ہندوستان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ ترقی یافتہ ممالک میں کوئی مقام بنالیتا۔ گاؤں، دیہات اور قصبے پس ماندہ تھے رہن سہن جو ہندوانہ تھی وہ ابھی چلی آرہی تھی۔ شادی شدہ ہی نہیں کنواری اور جواں سال عورتیں بھی ساڑھی، لہنگا اور چولی پہنتی تھیں۔ لیکن عموماً "پیٹی کوٹ اور چولی میں ملبوس ہوتی تھیں۔ چولی اور لہنگے کے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا تھا کمر، پیٹ اور ناف اور کمر کے خم عریاں ہوتے تھے۔ کسی کی چولی کا گریبان اتنا کھلا ہوتا نظارہ چھپتا نہیں تھا۔ سیانی لڑکیاں بھی ایسی ہی چولیاں پہنتی تھیں۔ کسی تقریب میں جاتی تھیں تو ایک اوڑھنی کو سینے اور شانے سے ڈھک اس کا کونا کمر میں اڑس لیتی تھیں۔ ماں نے جن لڑکیوں کا نام لیا تھا انہیں سن کر اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی ماں سے کیا کہتا۔ آخر ماں بیٹے کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے۔ وہ ماں سے کیا کہتا اور کیا بتاتا کہ وہ ان تینوں لڑکیوں کو جانے کتنی مرتبہ بے نیام تلوار کی حالت میں وحشیانہ انداز سے کونے کھدروں میں بھنبھوڑ چکا ہے بلکہ جی بھر کے من مانیاں اور سارے ارمان پورے کر چکا ہے۔ صرف حد سے تجاوز نہیں کیا اور نہ ہی ان کی آبرو کو داغ دار کیا اس لیے کہ اس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہو جائے۔ جب کہ گاؤں میں دو ایک واقعات پیش آچکے تھے۔ وہ بڑا محتاط تھا۔ وہ چوں کہ دراز قامت تھا اس لیے صرف کنواری لڑکیاں ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتیں اس کی تمنا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی ان شادی شدہ عورتوں کو مایوس اور نامراد نہیں کیا جن کے پتی باپ کی عمر سے بڑے تھے اور سراب ہو چلے تھے۔

جب اس نے ان تینوں لڑکیوں کو کوئی بہانہ کر کے رد کر دیا تو ماں نے حوصلہ نہیں ہارا اور بولی۔
"مالا کتنی حسین ہے اور پیاری پیاری سی ہے۔ چاند کا کیا ٹکڑا نہیں ہے؟"
"ماں تو تو پاگل ہے... اس پر بھوت پریت آتے ہیں۔ اس کی تو منگنی ہو چکی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کے یوں بھاگ گیا اور لوگ اسے بھولیوں ٹیں بناتے ہیں... کیا میں ایک ہی رہ گیا اس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے۔"
اصل بات وہ جانتا تھا کہ مالا کے تعلقات ایک لڑکے سے تھے۔ اس کا باپ مالا کا اس گھر میں رشتہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ جس لڑکے سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا مالا کو وہ پسند نہیں تھا۔ وہ ایسی حرکتیں کرتی تھی کہ جیسے اس پر آسیب آگیا ہو۔
ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بیٹے نے غلط نہیں کہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ تب ماں نے اس سے پوچھا۔
"تجھے سب میں خرابی نظر آرہی ہے۔ ان میں کیڑے نکال رہا ہے۔ سچ سچ بتا... کیا تجھے کوئی اور پسند آگئی ہے؟"
"ہاں ماں...! مجھے ایک نہایت حسین اور چاند سی لڑکی پسند آئی ہے جو میرے سپنوں میں بھی آتی رہتی ہے؟" اس نے جواب دیا۔
"ایسی کون سی حسین لڑکی ہے جسے میں نہیں جانتی... اس کا نام بتا اور اس کے باپ کا بھی۔" ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔
"اسے تو ہی نہیں بلکہ سارا گاؤں جانتا ہے بلکہ سارا سنسار جانتا ہے۔ لڑکے اور مرد اسے پر مرمٹتے ہیں۔ مرمٹے ہیں۔"
"آخر وہ ہے کون؟ تو اس کا نام کیوں نہیں بتاتا ہے؟" ماں نے تیز لہجے میں کہا۔ "جلدی سے بتا تاکہ تیرا رشتہ کر دوں۔"
"ماں اس حسین اور نوجوان لڑکی کا نام ہے مدھوبالا... ! تو اس کے نام اور خوب صورتی سے واقف ہے نا؟"
"مدھوبالا... وہی نا جس نے فلم مغل اعظم میں کام کیا تھا دلیپ کمار کے ساتھ؟ فلم کا گانا پیار کیا تو ڈرنا کیا..."
قصبہ شہر سے دور تھا۔ قصبہ میں کوئی سینما گھر نہیں تھا۔ فلم مغل اعظم کا بڑا شہرہ تھا جو برسوں کے بعد مکمل اور مشہور ہوئی تھی۔ بہت کم لڑکیوں اور عورتوں کو ان

کے گھر والے فلم دکھانے لے جاتے تھے۔ اس لیے بھی کہ فلم سے اخلاقاً خراب ہوتا تھا۔ لڑکیاں گھروں سے آشناؤں کے ساتھ ہیروئن بننے یا لومیرج کرنے بھاگ جاتی تھیں.... اس فلم کے گانے نے جب پیار کیا تو ڈرنا کیا.... خصوصاً لڑکیوں میں مقبول ہوا تھا اور گاؤں کی فضا اور لڑکیاں رومان پرور ہوگئی تھیں۔ وہ اپنے محبوب کی جھولیوں میں پکے پھل کی طرح گرجاتی تھیں کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا.... گاؤں میں کچھ گھروں میں ریڈیو ہوتا تھا۔ ان دنوں صرف ریڈیو سیلون سنا جاتا تھا جو کمرشل تھا۔ ٹی وی، موبائل اور کمپیوٹر کا جنم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی تصور تھا۔ ایک ہوٹل تھا جو گراموفون پر ریکارڈ بجایا جاتا تھا۔ اس گانے پیار کیا تو ڈرنا کیا سے لڑکوں نے ہم عمر لڑکیوں سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ مغل اعظم کا چوں کہ بہت شہرہ ہوا تھا اس لیے اس کا باپ اس کی ماں کو لے گیا تھا۔ چوں کہ ٹکٹ نہیں ملا تھا اس لیے اس کی ماں فلم نہ دیکھ سکی۔ البتہ پوسٹرز دیکھے جو مدھوبالا کے دلیپ کمار کے ساتھ رومانی مناظر اور جذباتی مناظر کے تھے۔

"وہ فلم کی اداکارہ ہے تجھ سے کیوں شادی کرنے لگی؟ عمر میں تجھ سے بڑی بھی تو ہے؟" ماں نے کہا۔

"پسند میں عمر کوئی دیوار نہیں بنتی ہے۔ بہت سی اداکاراؤں نے اپنی عمر سے کم لڑکوں سے شادی کی ہے۔" اس نے کہا۔ "پتا کے دوست امر سنگھ بتا رہے تھے کہ مغل اعظم فلم کی شہر میں پھر نمائش ہو رہی ہے۔ میں تمہیں کسی دن سائیکل پر بٹھا کر فلم دکھانے لے جاؤں گا۔" ماں کی زبان اک دم سے گنگ ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو جو فلم میں کام کرنے والی عورت کو دل دے چکا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ماں باپ نے اپنی جوان بیٹی کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ فلموں میں ہیرو ہیروئن کو نہ صرف آغوش میں لے لیتا ہے بلکہ سنا کہ چومتا بھی ہے۔ بوس و کنار جی بھر کے کرتا ہے.... کیا ایسی لڑکی کو وہ بہو بنائے گی؟ پھر ماں کو کچھ یاد آیا تو اس نے چمک کر کہا "وہ تو مسلمان ہے شاید؟ ہم ہندو ہیں.... اس نے اپنا نام کیا ہندوانہ رکھا ہوا ہے یا وہ مسلمان ہے....؟ مسلمان ہے تو تیری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"میں اسے ہندو بنا لوں گا.... فلمی دنیا میں کسی کا کوئی دھرم اور مذہب نہیں ہوتا ہے۔" اشوک نے لطف لینے کے خیال سے کہا۔

"بیٹے کا دماغ یقیناً چل گیا ہے یا کسی نے اس پر جادو منتر کر دیا ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اس کا باپ سنے گا تو کتنا غصہ کرے گا۔ اسے کتنا صدمہ ہوگا۔ اسے بھی بتانا پڑے گا کہ وہ ایک فلم ہیروئن کا عاشق ہوگیا ہے۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اشوک کمار کا باپ اپنی بیوی کی بات سن کر ہنس پڑا۔ پھر اس کا منہ چوم کر بولا۔

"چنتا نہ کر.... وہ تجھے تنگ کر رہا ہوگا۔ ٹالنے کے لیے اس نے مدھوبالا کا نام لے لیا۔ میں بات کروں گا اس سے۔"

پر کاش آنند کو بیٹے سے بات کرنے کا موقع تین دن بعد ملا۔ ہر صبح وہ دکان پر جاتا تھا اشوک سو رہا ہوتا تھا۔ تاکید کر کے جاتا تھا کہ اشوک اٹھے تو اسے دکان پر بھیج دینا۔ میں اس سے معلوم کروں گا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟

پھر وہ اٹھتا اور سائیکل لے کر نکل جاتا اور پھر رات کو دیر سے لوٹتا۔ بتاتا نہیں تھا کہ کہاں گیا تھا اور نہ ہی بتایا جا سکتا تھا اور نہ ہی بتانے والی بات ہوتی تھی۔ وہ ایک شکاری تھا۔ شکار کھیلتا تھا۔ ایک کھیت کے کنارے ایک غیر آباد کوٹھری تھی۔ کھیت ویران ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے کوٹھری آباد کر دی تھی۔ کسی کلی کو اٹھا کر لے جاتا۔ کلی بے تاب ہوتی تھی کہ وہ حد سے تجاوز کر کے اسے پھول بنا دے۔ وہ دوشیزہ نہیں عورت رہنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اسے سمجھاتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لڑکی کی سمجھ میں آجاتا.... اس لیے بھی وہ کلیوں سے دور رہتا تھا کہ صرف عورتیں جو شادی شدہ ہوتی ہیں ان کے ساتھ وقت گزاری سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہو کر

اسے ہر طرح سے خوش کرتی تھیں اور اس کی کسی بات سے انکاری نہ ہوتی تھیں۔ اس کے لیے دودھ اور خوردونوش بھی لاتی تھیں۔

پرکاش آنند اس قدر تھکا ماندہ ہوتا تھا کہ دکان سے گھر آنے کے بعد کھانا کھا کر بیوی سے لڑتا تھا۔

"آخر تو پوچھتی کیوں نہیں ہے کہ آخر وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا رہتا ہے سارا دن...."

"کہاں بتاتا ہے وہ مجھے، الٹے سیدھے جواب دیتا ہے وہ تو مجھے پکا یقین ہے اس پر کسی کا سایہ ہے۔"

"نہیں .... اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے دس جماعت پڑھ کے .... وہ دکان پر میرے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتا ہے۔"

باپ کا اندازہ درست تھا۔ اگلے دن اس نے اشوک کے اٹھنے کا انتظار کیا اور دکان پر نہیں گیا۔ اشوک سے چھوٹا پہلے ہی بیوی کی باتوں میں آکر گھر سے چلا گیا تھا اور سسرال والوں کے ساتھ گھر داماد بن کر بے غیرتی کی زندگی گزار رہا تھا۔ سبھی پرکاش آنند کو طعنے دیتے تھے بے شک وہ بے حد قریبی رشتہ دار تھا۔ اب اس کی دکان سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ مگر دنیا کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ اب اس کی ساری امیدیں اپنے بیٹے اشوک سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے توقع تھی کہ بیٹے کو سمجھانے پر وہ شاید سدھر جائے۔

یوں تو اس کا باپ بھی دراز قد تھا لیکن اشوک کا قد اس سے بھی نکلتا ہوا تھا جس نے اس کی وجاہت اور کشش میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ اور فولادی بازو لڑکیوں عورتوں کو متاثر کرتے تھے اور وہ اس سے ہم آغوشی کی تمنا کرتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ ماں کا رنگ روپ جو اس پر آیا ہوا تھا۔

اشوک نے باپ کی بات بڑے تحمل اور دھیان سے سنی اور پھر اس نے جواب دیا۔

"پتاجی....! میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا.... صاف بات یہ ہے کہ میں یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔" پرکاش آنند کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔

"کیوں.... کیا خرابی ہے اس میں؟ کیا یہ ذلت کا کام ہے؟"

"ذلت تو نہیں .... البتہ خرابی نظر آتی ہے مجھے دکان پر بیٹھنا ہی تھا تو مجھے اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت تھی....؟"

"اوئے پاگل.... میٹرک کیا ہے نا تو نے.... وہ بی اے، ایم اے، بی کام اور بی ایڈ نہیں.... تجھے کہاں ڈپٹی کمشنر لگ جانا ہے.... کسی بھی اسکول میں تجھے استادی کی ملازمت بھی نہیں مل سکتی۔ اس کے لیے بی ایڈ ہونا ضروری ہوتا ہے۔" اشوک باپ کی بات سن کر مسکرایا اور پھر کسی فلسفی کے انداز میں کہا۔

"پیارے پتاجی! عقل اور ذہانت کا تعلق کسی ڈگری سے نہیں ہوتا۔"

"اوئے.... لوہار کا بیٹا لوہار ہی رہتا ہے۔ میرا باپ زرگر تھا۔ مجھے بھی یہی کام کرنا ہے بالاخر...."

"نہیں پتاجی! مجھے بڑا آدمی بننا ہے میں آپ کو ایک درجن مشہور لوگوں کے نام بتا سکتا ہوں جو میٹرک پاس بھی نہیں تھے **مثلاً** "مرزا غالب۔"

"مرزا غالب...." پرکاش آنند نے حیرانی سے کہا۔ "کون سا مرزا؟ میں نے تو کبھی کسی مرزا کا نام نہیں سنا؟ اپنے شیخ صاحب نے بڑی ترقی کی ہے.... باپ ان کا گلی گلی پھیرا لگا کے کپڑا بیچتا تھا اور آنند پور میں.... اب اس کے بیٹوں نے **بنگلور** شہر میں جا کر کپڑے کی مل لگائی ہے اور اس کے کپڑے کا نام آنند پور **فیبرکس** ہے۔"

"پتاجی! آپ نہیں سمجھیں گے۔" اشوک نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ "مرزا غالب کی غزل ہر کتاب میں ہوتی ہے اور بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔"

"زرگری بھی بہت مشکل ہے۔ ہم نے عمر لگا دی۔ آج ہمارا نام ہے اس علاقے میں.... تو یہ بات کیوں نہیں سمجھتا۔"

اشوک کمار نے باپ کو سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی اور کسی ڈگری کے بغیر شہرت حاصل کرنے والوں کے ایک درجن سے زیادہ نام گنوائے مگر جوش اور

جذبات میں وہ سارے نام گنوا دیے جن کے ساتھ باپ کو عقیدت تھی۔

"او گستاخ۔" "او بے ہودا۔" بار بی پرکاش آنند نے اشوک پر ایک جوتا فائر گیا۔

اشوک کمار نے راہ فرار اختیار کرنے میں اپنی عافیت اور عزت سمجھی۔ دروازے میں تھا کہ دوسرا جوتا کسی میزائل کی طرح آیا اور وہ پھرتی سے غوطہ نہ مارتا تو یہ بھی نشانے پر بیٹھتا۔ اس کی زد میں آنے والی ایک بڑھیا نے بہت واویلا کیا جو گلی سے گزر رہی تھی۔ اس وقت اشوک خطرے کی سرحد سے کافی دور نکل آیا تھا۔ باپ کوئی اور چیز کو راکٹ کی طرح فائر کرنے سے رہا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ آج وہ اپنے سنہرے مستقبل کا پورا منصوبہ پتا جی کے سامنے رکھ دے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ سارا خاندان اس پر اش اش نہ کرے۔ مگر جنہیں غور کرنے اور سمجھنے کی عادت نہ ہو وہ بات کہاں سنتے ہیں۔ خیر وہ اپنے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش جاری رکھے گا۔



اشوک کمار کے خیالات میں یہ تغیر اچانک نہیں آیا تھا اور نہ اسے اپنے آبائی پیشے سے نفرت تھی اور نہ ہی کبھی اسے حقیر جانا تھا اور نہ اس کے ذہن میں اپنے مستقبل کے لیے کوئی متبادل راستہ تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ دس جماعتیں پڑھ لینے کے بعد وہ کالج میں داخلہ لے گا۔ اس کے لیے باپ کو منانا ایک مشکل کام ہو گا۔۔۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے کا زرگر تھا چناں چہ اس کی آمدنی محدود تھی۔ اس کے علاوہ اب بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کے کام میں دونوں بیٹے بھی ہاتھ بٹائیں۔ اس سے پہلے کہ اس کی نظر بالکل ہی جواب دے جائے اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ آجائے۔ وہ نقاشی اور سونے میں گل کاری کے اس فن کو بیٹوں میں منتقل کر دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ کاروبار کو آگے بڑھائیں۔ وہ نت نئے اور جدید فیشن کے ایسے پرکشش ڈیزائن لائیں کہ جو بھی عورت لڑکیاں اور دلہنیں دیکھیں تو پھڑک اٹھیں۔ ان کا دل زیورات بنانے کو للچائے۔ زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ نئے ڈیزائنوں سے فائدہ یہ ہوگا کہ خاندانی گاہکوں سے رابطہ ہوتا رہے گا اور نئے گاہک بھی آتے رہیں گے۔ آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ سب اس کا سپنا تھا جو پورا نہ ہو سکا شادی کے بعد اشوک کا چھوٹا بھائی بیوی کے کہنے پر سسرال کا ہو کر رہ گیا اور گھر داماد بن گیا تو صورت حال بدل گئی۔ اس نے اپنے سسر کی دکان سنبھالی اور اس پر بیٹھ گیا۔ سسر کون تھا۔ اس کا سگا رشتہ دار نہیں تھا اور اس کا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا اور گھر چلاتا اور کاروبار کی دیکھ بھال کرتا۔ وہ اچانک بیمار ہو کر اس قابل نہ رہا کہ کاروبار چلا سکے۔ اشوک کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے چھوٹے بھائی نے ہم دردی میں نہیں لالچ میں آکر اپنا گھر چھوڑ کے گھر دامادی کی ذلت قبول کی تھی۔ اس کے دل میں یہ لالچ پیدا کرنے والی اس کی خوبرو بیوی تھی جس کا وہ زر خرید غلام کی طرح تھا۔ یہ رائے صرف ساس کی نہیں بلکہ پورے خاندان کی تھی جو سو فیصد درست تھی۔ صرف چھ ماہ بعد سسر کا دیہانت ہو گیا تو اس کا بھائی دیپک ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان کا مالک ہو گیا۔ کیوں کہ اس کی ساس بہت پہلے اس سنسار کو خیرباد کہہ کر پر یوک میں جا چکی تھی۔

اشوک کمار کو اپنا کالج میں داخل ہو کے بی اے، ایم اے اور بی ایڈ کرنے کا منصوبہ فلاپ ہوتا نظر آیا۔ اس طرح جس طرح فلم فلاپ ہو جاتی ہے۔ اب اس کے پاس باپ کے خاندانی زرگری کا پیشہ اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ اس کا بھائی دیپک دکان چلاتا تو وہ کاروبار کے بجائے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔ باپ بہت شور غوغا کرتا کہ اس کے کالج کے تعلیمی اخراجات پورے کرنا اس کے بس اور اختیار میں ممکن نہیں۔ اماں الگ فساد برپا کرتی کہ کیا وہ بڑھاپے میں شادی کرے گا اور اس وقت اسے اپنی بیٹی دے گا کون؟ ایک بیٹے کو اس کی بہو اپنے جسمانی نشیب و فراز کے خزانے

گوری چمڑی اور دل کشی دکھا اور کسی فلمی ہیروئن کی طرح رومان لڑا کے چھین کر لے گئی۔ دوسری آنے سے پہلے وہ خود چلی جائے گی۔

ماں کی بات تو ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑائی جاسکتی تھی۔

باپ کی تعلیمی امداد روک لینے کی دھمکی کا جواب بھی اس نے اس طرح سوچ رکھا تھا جس طرح میدان جنگ میں دشمن کے حملے کے بارے میں تیار ہوا جاتا ہے۔ وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھائے گا اور اس طرح اپنے اخراجات پورے کرے گا اور بوڑھے باپ پر بوجھ نہیں بنے گا۔ بھائی کی گھر دامادی اور اس کے نتیجے میں عاق کیے جانے کے بعد اس نے اپنے منصوبے پر نظرثانی کی اور بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ اس کے مقدر میں بھی زرگری لکھ دی گئی ہے تو اسے ہر قیمت پر یہی کام کرنا پڑے گا۔ آدمی سوچتا کیا ہے اور کیا کیا سپنا دیکھتا ہے جو پورا نہیں ہوتا ہے۔ وہ تو اب سپنے میں بھی پروفیسر نہ بن سکے گا۔ اس کے بھائی کی شادی اور گھر داماد بننے کا جو پس منظر تھا وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے کارن آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔

اس کا بھائی دیپک اس سے عمر میں دو برس چھوٹا تھا وہ بھی اس کی طرح خوب صورت اور دراز قد اور اپنی عمر سے چھ سات برس بڑا دکھائی دیتا تھا۔ بری صحبتوں کا شکار تھا۔ گولیاں کھیلتا اور جوا بھی اور لڑکوں کا ذوق رکھتا تھا۔ ایک روز وہ پرساد لے کر اپنی سسرال گیا تو اس وقت گھر میں کوئی نہ تھا۔ اس کی بیوی بھانو متی غسل خانے میں نہانے کی تیاری کر رہی تھی اور اس نے اپنے کپڑے نکال کر کھونٹی پر ٹانک دیے تھے۔ اس نے آہٹ سن کر پلٹ کر دیپک کو دیکھا۔ دیپک نے جو اسے دیکھا تو اس کے جذبات میں تندی آگئی اور خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر اندر کے کمرے کے بستر پر لے گیا۔ بھانو متی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پھر طوفان آیا تو دونوں اس کی زد میں آگئے دیپک نے تہس نہس اور تاخت و تاراج کر دیا۔

طوفان گزر جانے کے بعد وہ دونوں پیار و محبت کی باتوں میں کھو گئے۔ پھر دوسرا طوفان آیا پھر اتفاق سے اس کی ماں جلد لوٹ آئی تھی۔ دیپک اپنے کپڑے اٹھا کر باہر بھاگ گیا۔ دیپک کو اس سے اس لیے شادی کرنی پڑی تھی کہ ساس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا تھا۔ اگر دیپک کی شادی نہ ہوئی ہوتی اور گھر داماد نہ بنا ہوتا تو وہ دکان سنبھال لیتا باپ کی۔

امتحان سے فراغت اور نتیجہ آنے تک اس نے تمام امکانات پر غور کیا لیکن ہر بار اس کی سوچ کا دائرہ وہیں آکے ختم ہوگیا جہاں اس کا مستقبل اپنے باپ کے ماضی سے مل جاتا تھا۔ اب وہ بھی کرے گا اور دو بندے.... دو جھومر.... نیکلس اور چوڑیاں.... جو اس کی ماں کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ زیور میں نئے ڈیزائن کے نقش و نگار تراشنے میں اس کی آنکھوں میں ایک دن موتیا اتر آئے گا اور مجبور ہوگا کہ اپنے آباو اجداد کی طرح کاروبار اپنی اولاد کے سپرد کر کے ریٹائر ملازم کی طرح گھر میں چارپائی توڑ تا رہے۔

اشوک کے لیے زرگری کا پیشہ قابل نفرت ہرگز نہیں رہا تھا۔

یہ جوتے گانٹھنے.... گٹر صاف کرنے اور سڑکیں کھودنے کے مقابلے میں لاکھوں درجہ بہتر اور معزز پیشہ تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ بڑھانے کے بجائے روز بہ روز یہ کام اس کے خاندان کے لیے خوش حالی کے مواقع کم کر رہا تھا۔ قصبے میں نئے سنار آگئے تھے۔ جو خود کو جیولر کہتے تھے۔ ان کے پاس باہر کے ڈیزائن تھے جو وہ فیشن کے رسالوں سے کاپی کرتے تھے۔ آنند پور کے رہنے والے بھی شہر جا کے خریداری کرنے لگے تھے۔ یہ روز کی خریداری نہیں تھی۔ جب کسی کی بیٹی یا بیٹے کی شادی قریب آتی تھی تو خوب سے خوب تر کی جستجو اسے قریب کے چھوٹے بڑے شہروں تک لے جاتی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دبئی سے زیورات لاتے تھے۔ جب کبھی دہلی یا ممبئی سیر و سیاحت کے لیے جاتے تو تجارت کو نہیں بھولتے تھے اور وہاں سے چوبیس قیراط خالص سونے کے بسکٹ تک لے جاتے

تھے۔

ان حالات میں ایک پرانے خاندانی زرگر کی بقا کا انحصار ان چند خاندانی لوگوں پر رہ گیا تھا جو کتے بھی خاندانی رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ ایسے اب پرانے لوگ پرکاش آنند زرگر کو یاد کرتے تھے نہ صرف وہ سر کے بل دوڑتا ہوا ان کے در دولت پر حاضری دیتا تھا بلکہ اس گھر کی بہو بیٹیوں سے عمر رسیدہ' معمر اور پرانی بڑی بوڑھیوں تک سب کی سنتا تھا اور سب کو قائل کرنے کے لیے اپنی چرب زبانی سے زیادہ خوشامد اور انکساری سے کام لیتا تھا کیوں کہ اب وہ پہلی والی بات نہیں تھی کہ ڈیزائن سامنے رکھ دیے اور جو کہا بنا دیا۔ پرکاش آنند کے ڈیزائن اب آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر مسترد زیادہ کیے جاتے تھے۔ جو آرڈر دیتے تھے وہ بھی سو چکر لگواتے تھے۔ سو اعتراض کرتے تھے اور سو احسان جتاتے تھے کہ تم اس قابل تو نہیں مگر ہم صرف از راہ بندہ پروری تمہیں یہ آخری موقع دے رہے ہیں۔ اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو۔

پرکاش آنند ان کے حکم کا غلام ہو گیا تھا۔ اسے عزت کم اور ناقدری زیادہ ملتی تھی۔ آمدنی کم ہونے یہ نوبت آ گئی تھی کہ اسے گھر کا خرچ چلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی اولاد یہ کاروبار نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق چلائے کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔

ایک بیٹے نے پرچون فروشی کا بڑا آسان راستہ اختیار کیا۔

صرف یہی نہیں کیا بلکہ گھر چھوڑا' ماں باپ کی ذمے داری سے بڑی بے حسی اور بے رحمی سے ہاتھ کھینچا اور خود اپنی دکان داری سے مال دار بن گیا تو پرکاش آنند کے لیے ساری توقعات دوسرے بیٹے سے وابستہ کرنا جائز تھا۔ یہ بیٹا ذہین اور تعلیم یافتہ تھا۔ اسے وہ جیولر بنا سکتا تھا۔ ایک ایسی چمکتی دمکتی اور صاف ستھری دکان کا مالک جس کی پیشانی پر۔۔۔ "پرکاش آنند اینڈ سنز" کا بورڈ جگمگاتا ہو۔

ہر قسم اور ہر وقت اور ہر طرح کے سپنے دیکھنے کا حق تو سبھی کو ہے۔ دنیا میں کون ایسا ہے جو سپنے نہیں دیکھتا ہے۔ اسے یوں بھی آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق میں شامل ہونا چاہیے۔ اصل مسئلہ تو تعبیر کا ہے جس کی ضمانت بھلا کون دے سکتا ہے۔

ہر وقت غور و فکر کرنے والا اشوک کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک دست غیب نے جیسے لیور کھینچ پٹڑی ہی بدل دی تھی۔ جس پر زندگی کی گاڑی ایک ہی سمت میں اس سرعت سے دوڑ رہی تھی کہ جس کا رکنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

ہر روز سائیکل پر آنند پور سے شہر آمد و رفت کرنے والا اشوک کمار زندگی کے فرق کو دیکھتا تھا تو اسے سارا فرق معاشی نظر آتا تھا۔۔۔۔ پیدل' سائیکل سوار' موٹر سائیکل دوڑاتا اور کار میں زن سے گزر جانے والا سب اسی فرق کی علامت تھے۔ اسکول کے راستے میں ایک کونے میں کنج تھا باہر سے اس کا اندرونی حصہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک روز اس کی نظر معاً" سینڈل اور چپلوں پر پڑی تو وہ ٹھٹک گیا اور ایک ان جانے خیال سے اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے سائیکل وہیں چھوڑی۔ تجسس کے اشتیاق کی زد میں دبے پاؤں بڑے محتاط انداز سے بڑھا کہ آہٹ نہ ہو۔ قریب پہنچا تو اس نے سرگوشیاں سنیں۔ وہ ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ اندر سے کوئی اسے دیکھ نہ سکے لیکن وہ دیکھ سکے۔۔۔۔

فرش پر ایک عورت کے زیر جامے اور کپڑے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہوئے تھے اور ایک مردانہ لباس دوسری طرف فرش پر ایک اتنی بڑی نیلے رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی جس پر بیک وقت چار فرد آسانی سے لیٹ سکتے تھے۔ اس پر ایک خوب صورت' متناسب اور چھریرے بدن کی عورت دراز تھی جس کا پرشباب بدن گداز سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے عورت کو پہچان لیا۔ یہ چودھرائن تھی۔ چھتیس برس کی عمر کی تھی۔ سولہ سترہ برس کا لڑکا جس کا نام داس تھا وہ باہم پیوست تھا۔ چودھرائن اس سے کھلونے کی طرح کھیل رہی تھی۔ وہ نوجوان لڑکوں سے دل بہلاتی رہتی ہے اس نے سن رکھا تھا آج وہ

بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔ چودہری چوں کہ ہم جنس پرست تھا اس لیے چوہدرائن لڑکوں سے دل بہلا کر انتقام لیتی تھی۔ چوہدری اس لیے لڑکوں سے جذبات کی تسکین کرتا تھا کہ چوہدرائن ایک عورت ہونے کے ناتے پتی کی غیر فطری خواہش پوری نہیں کرتی تھی۔ وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کھیل جاری رہا۔ اس کا اختتام نہ ہو گیا۔ پھر چوہدرائن نے اپنے پرس سے رقم نکال کر لڑکے کی طرف بڑھائی.... "یہ سو روپے ہیں۔ جب بھی تم سے کہوں یہاں آجانا۔ سو روپے دیا کروں گی۔ اب تم جاؤ.... ویسے تم نے میری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دی.... تم بڑے طاقت ور ہو۔ تم نے میرا رواں رواں خوش کر دیا۔"

لڑکا اور چوہدرائن کپڑے پہننے لگے تو وہ فوراً ہی اپنی سائیکل کی طرف لپکا۔ یہ بھی ایک معاشی مسئلہ تھا۔ داس کا گھرانہ بھی بہت غریب تھا۔ اس کا باپ اسے ایک رپیا بھی نہیں دیتا تھا۔ سو کا نوٹ ہزار سے کم نہیں تھا۔ چوہدرائن کے لیے ایک روپے۔

پھر وہ دونوں اس کنج میں نہیں آئے۔ انھوں نے ملاقات اور کیف نشاط کا وقت شاید بدل دیا تھا۔ پندرہ بیس دن بعد اس نے داس کو دیکھا تو وہ اسے پہچان نہ سکا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بیمار بیمار سا لگتا تھا۔ چوہدرائن نے اسے جیسے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور خود روز بہ روز جوان اور پرشباب ہوتی جا رہی تھی اور اس کے بدن میں گداز بڑھتا جا رہا تھا۔

اسکول کے راستے میں ایک نہر کے پل پر بار بار دیکھا۔ ایک ہاتھ سکہ اچھالتا تھا۔ سردی کی پروا کیے بغیر تین چار ننگ دھڑنگ بچے سکہ حاصل کرنے کے لیے پانی میں کود پڑتے تھے۔ سارا کھیل سکے کا تھا۔ یہی سکہ کرکٹ کے میدان میں ٹاس جتواتا تھا اور اکثر ٹاس جیتنے والی ٹیم ہی میچ بھی جیت جاتی تھی۔ اس نے شاید ہی کبھی ٹاس ہارنے والی ٹیم کو میچ جیتتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک کہر آلودہ دوپہر تھی جو جسم میں دھوپ کے باوجود کپکپی دوڑا رہی اور خون کو برف کی مانند سرد کر رہی تھی۔ ایسے سمے میں جب نہر کے پل پر اشوک نے ایک شخص کو پانی میں سکے اچھالتے دیکھا۔ وہاں ایک نہیں دو بچے تھے۔ جو سخت سردی کے باوجود سکہ فضا میں بلند ہوتے ہی غوطہ مارتے تھے۔ چند فٹ میں کوئی ایک بچہ تہ سے سکہ نکال لاتا تھا۔ سکے فضا میں اچھالنے والا خود پوری طرح گرم اونی کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کھیل سے پوری طرح لطف لے رہا تھا اور اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

اشوک کمار کے لیے بھی یہ نظارہ نیا نہیں تھا لیکن ایک تو سخت سردی میں یہ کھیل کوئی نہیں کھیلتا تھا۔ ایسی سردی میں تو مرد اور عورتوں کا جسمانی لطف اٹھانا اور باہم پیوست ہونا ہوتا تھا.... دوسری بات یہ کہ اتنی دیر تک اس کھیل کو جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ رکھتا۔ اشوک نے بھی گرم کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے باوجود سرد ہوا اس کے جسم کو کاٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تو گوالن کے چکر میں آیا ہوا تھا جس کا قرب، خود سپردگی اور والہانہ پن جسم میں خون کی گردش اور حرارت تیز کرتا تھا اور لمحات پر کیف ہو جاتے تھے۔ ابھی اس کے آنے میں دیر تھی۔ اس کا پتی شاید گھر پر تھا۔ بھیگے کپڑوں والے کم زور سے بچے ٹھٹھر کر کانپ رہے تھے۔ مگر وہ شخص تھا کہ انسانیت، رحم دلی کے احساس سے عاری اپنے کھیل میں مگن تھا اور جی بھر کے ہنس رہا اور قہقہے بھی لگا رہا تھا۔

بالآخر اشوک کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے انتہائی غصے کی حالت میں ہذیانی لہجے انداز میں چیخ کر کہا۔

"اوے ظالم کے بچے.... دیکھتے نہیں کیا حالت ہو رہی ہے ان بچوں کی.... مٹانے کے لیے اتنا ہی پیسہ ہے تو انہیں ایسے ہی دے دو۔" سکے اچھالنے والے گردن گھما کے دیکھا۔ نظریں ملتے ہی وہ حیرت اور خوشی سے چلایا۔

"ارے اشوک کمار تو؟ کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

پھر دوسرے لمحے دونوں دوست بڑی محبت اور گرم

جوشی سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور ایک دوسرے کو چوما بھی۔۔۔ وہ دونوں بچے کچھ مایوس ہوئے۔ کیوں کہ ان پر ہونے والی سکوں کی بارش رک گئی تھی۔

مہندر ناتھ نے اس سے الگ ہو کر ہنسا اور اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے بولا۔

"سنار کی اولاد۔۔۔ تو یہاں کھڑا کیا کر رہا تھا۔۔۔ میں تو ان بچوں کو پیسے دے رہا تھا۔"

"میں دیکھ رہا تیری دریا دلی اور سنگ دلی کہ ہلاکو کی اولاد کو۔۔۔ کپتان! ارے پیسا پانی پھینکنے کو نہیں ایسے دے دے؟"

"تو نہیں جانتا ہے کہ ان بچوں کی ماں اور بہن کے بارے میں۔۔۔ یہ ان کا پیشہ ہے ذریعہ معاش ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" اشوک نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا "میں سمجھا نہیں۔"

" یہ دونوں بھائی ہیں اس کے عادی ہیں۔" مہندر ناتھ کہنے لگا۔ "ان کی ماں اور بہن بھی بے لباس سکوں کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔۔۔ دونوں بھائی تو ایک ساتھ آتے ہیں لیکن ان کی ماں اور بہن اکیلی آتی ہیں۔"

"میں نے تو کبھی ماں بیٹی کو نہیں دیکھا بے لباسی کی حالت میں سکوں کے لیے پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے؟" اشوک متعجب لہجے میں بولا۔

"کوئی تین چار ماہ سے اس خاندان نے ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔" مہندر ناتھ بتانے لگا۔ "ماں بیٹی دونوں نہایت خوب صورت' پرکشش اور متناسب جسم کی ہیں۔ ان کے نشیب و فراز میں بڑی دل کشی ہے۔ ماں اور بیٹی جڑواں بہنیں لگتی ہیں۔ کہنے کی دیر ہوتی ہے وہ لباس اتار کر چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ میں نے اب تک کوئی چھ سات مرتبہ ماں بیٹی پر سکوں کی بارش کی ہے۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔۔۔ ان کی بے حجابی کے نظارے۔۔۔ پانی میں عورت کا بدن قیامت' ہیجان خیز بن جاتا ہے۔ بھیگے بدن میں بڑا جادو ہوتا ہے۔"

"انہیں اس حالت میں دیکھ کر جذبات قابو میں کہاں رہتے ہوں گے۔ آدمی بہک جائے۔" اشوک بولا۔

"بات آگے بڑھ جاتی ہے۔۔۔ وہ اپنے ساتھ تولیا اور دری چٹائی بھی لاتی ہیں۔ وہ جو کنج ہے ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔" مہندر ناتھ نے کہا۔ "تو تیار ہے تو میں ان لڑکوں سے پیغام بھیج کر بلا لیتا ہوں کسی دن۔"

"دیکھ تو سہی یہ ان دونوں معصوم کے ساتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں۔" اشوک نے کہا۔

"انہیں ذرا غور سے دیکھو۔۔۔ یہ حقیر نہیں ہیں اور نہ ہی میں انہیں بنانا بھی چاہتا ہوں۔ دراصل یہ اور ان کی ماں بہن بڑی محنت سے کماتے ہیں اور کما رہے ہیں۔ ماں بیٹی اور یہ لڑکے بھی قسمت آزما رہے ہیں۔ جسم فروشی سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی۔"

"یار۔۔۔! تو ان کی حالت دیکھ۔۔۔ میں ڈر رہا ہوں ان کی حالت کے ڈر اور خوف سے۔۔۔ کہیں انہیں نمونیہ ہو گیا تو۔۔۔؟" مہندر ناتھ ایک قہقہہ مار کے ہنسا اور پھر مسکرا کے بولا۔

"اوئے نہیں یار! یہ عادی ہیں ان کا روز کا ہی یہ کام ہے۔ یہ ہم دونوں اور عام لوگوں کی طرح نازک مزاج نہیں ہیں۔۔۔ ماں بیٹی بڑی گرم ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوا۔ انہیں بھی کچھ نہیں ہوگا۔ خیر تو کہتا ہے کہ میں انہیں ایسے ہی دے دیتا ہوں۔"

مہندر ناتھ نے دونوں بچوں کو اشارے سے قریب بلایا اور کوٹ کی جیب سے سکے نکال کر ایک بچے کو دے دیے۔ پھر دوسرے کے لیے اس نے دوسری جیب خالی کر دی۔ ان کے چہرے دمک اٹھے اور انہوں نے اپنے کپڑے اٹھا لیے۔

"دیکھو۔۔۔ جیسا میں نے کہا اور سمجھایا تھا ویسا ہی کرنا۔۔۔ اپنی ماں اور بہن سے کہہ دینا۔۔۔ ٹھیک اب جاؤ۔"

دونوں بچوں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور پھر وہ تیزی سے مخالف سمت دوڑ گئے۔

اشوک نے شدید حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا اور بولا

"تو اتنے سکے لایا تھا؟ جب بھی آتا ہے تو کیا اتنے ہی سکے لاتا ہے؟"

"ہاں یار! اس لیے کہ جب کبھی ان کی ماں اور بہن سے رابطہ پڑتا ہے تو میں دیر تک سکوں کی بارش کر کے ان کے بھیگے بدن کا ہیجان خیز نظارہ کرتا ہوں.... جب کنج میں لے جاتا ہوں تو سکون کے علاوہ کچھ نوٹ بھی دیتا ہوں ان کے مہربان ہونے فیاضی پر...."

"کیا تو ماں بیٹی کو ایک ساتھ ایک وقت میں پانی میں نہاتا دیکھتا اور کنج میں لے جاتا ہے؟"

"نہیں یار! ایک وقت میں ماں اور دوسرے وقت میں بیٹی۔ وہ غریب ہیں لیکن اتنے بے غیرت بے حیا اور بے شرم نہیں ہیں کہ ماں بیٹی ایک وقت میں میرا دل بہلائیں۔ غور کرنے کی بات ہے کوی غور صاحب!"

اشوک شاعری کرتا تھا اس نے اپنا تخلص غور رکھا ہوا تھا۔ دوست اسے غور اور غوری بھی کہتے تھے۔

"ایک ایک اور پانچ پانچ روپے کے اتنے سارے سکے کہاں سے آ گئے تیرے پاس؟ کیا تجھے کہیں بھیک ملتی ہے یا تم نے ٹکسال بنا رکھی ہے؟"

"میں نے یہاں آنے کے لیے بینک سے بہت سارے سکے لے رکھے ہیں۔" مہندر ناتھ نے جواب دیا۔

تو ڈیڑھ دو برس سے نظر نہیں آیا.... نہ ہی تیرے بارے میں تیرے گھر جا کر معلوم کر سکا تھا؟"

"میں بہت سارے درہم دبئی سے بھی تو لایا ہوں۔ ماں بیٹی پر درہم کے سکے کی بارش کرتا ہوں۔ ماں بیٹی سے کہہ دیا اور سمجھا دیا ہے کہ ان سکوں کی ہندوستانی کرنسی میں زیادہ قیمت ملتی ہے۔ اس لیے تو وہ دونوں مجھ پر اس لیے بڑی فیاضی سے ہر طرح مہربان ہوتی ہیں۔ میری کسی بات سے انکاری نہیں ہوتی ہیں.... وہ اتنی خوب صورت، پیاری اور پر کشش ہیں کہ دیکھے گا تو دل تھام لے گا.... اچھا یہ بتا کہ تو یہاں کیسے....؟ کیا شاعری کرنے نکل آیا تھا؟ کوئی نیا گیت سیکھ رہا ہے؟"

"یار! مجھ پہ ایک گوالن مرمٹی ہے جو دودھ کی رنگت کی ہے.... اس کی اجلی رنگت بڑے غضب کی ہے.... پھر اس کا تناسب اور چھریرا جسم بڑا گداز اور پر شباب ہے۔ عمر چھتیس برس کی ہے اور رسیلا پھل.... اس کے انگ انگ سے صرف مستی ہی نہیں دودھیا رس بھی ابلتا ہے۔ اس کی شادی کو بارہ برس ہو چکے ہیں۔ ماں نہ بن سکی۔ اس کا پتی بوڑھا اور ہم جنس پرست ہے۔ اس لیے وہ مجھ پر بڑی مہربانی اور فیاض ہے۔ شاید پتی گھر پر ہو گا۔ اس لیے وہ آئی نہیں۔"

"ہم جنس پرستی کی لعنت اور لت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ امریکہ اور یورپ میں تو ان کے کلب بھی ہیں...." مہندر ناتھ بولا "ایسی عورت، جو پتی سے متنفر ہو جاتی ہے وہ انتقاماً" جوان لڑکوں اور مردوں سے دل بہلاتی ہیں۔ تیرے مزے آ رہے ہوں گے۔ کیوں اس عمر کی عورت میں، جو خود سپردگی اور فیاضی ہوتی ہے وہ ایک لڑکی میں نہیں.... گویا تو مفت میں عیش کر رہا ہے۔ تیری پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔"

"تو دبئی کیا لینے گیا تھا؟" اشوک نے موضوع بدلا۔

"مجھے یہ بات کسی سے بھی معلوم نہیں ہوئی؟"

"مہندر ناتھ نے پل کے پاس، جو درخت تھا اس کے نیچے کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

اشوک کی نظر ابھی تک گاڑی پر نہیں پڑی تھی۔ اس نے گاڑی کی طرف دیکھا جو نئی، لمبی اور کسی نئی نویلی دلہن کی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ اشوک کا ہاتھ بڑے پیار سے پکڑ کے گاڑی کے پاس لایا اور گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا۔

"چل بیٹھ...." جب وہ گاڑی میں بیٹھ گیا تو مہندر ناتھ اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "تو نے سکوں کے بارے میں پوچھا.... میرے پاس درہم کے سکے حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی غور کیا تو نے آدمی پردیس کیوں جاتا ہے؟ دولت کمانے اور دولت وہیں مل سکتی ہے جہاں دولت ہو.... آج سے بیس برس پہلے دولت کے حصول کے لیے لوگ سنگاپور جاتے تھے لیکن اب دبئی جاتے ہیں اور جا بھی رہے ہیں۔"

”کیا یہ گاڑی بھی تیری اپنی ہے؟“ اشوک نے سکتے کی سی حالت میں پوچھا۔
”نہیں تو کیا میرے پتاجی نے مجھے ہیروئن بیچ کر اس میں کما کر تحفے میں دی ہے؟ وہ تو ابھی تک اپنی دیسی سائیکل پر پھرتا ہے.... وہی پرانی لال رنگ کی ٹوپی پہنے رہتا ہے جو بیس برس سے اس کے پاس ہے۔“ ”مجھ سے بھی ناراض ہے چاچا سے بھی۔“
”تیرا چاچا تو شاید ڈپٹی کمشنر تھا؟ کیوں؟“ اشوک کو اک دم یاد آگیا۔
اس نے تو مجھے باہر بھجوایا تھا تا کہ میں اپنا مستقبل بناؤں.... پتاجی نے بڑی مخالفت کی تھی تو میں نے اس سے کہا تھا کہ.... میں دبئی جا کر ڈاکا نہیں ڈالوں گا۔ محنت کروں گا وہاں محنت سے ذہانت اور صلاحیت سے دولت کمائی جا سکتی ہے اور کہاں کہاں سے لوگ آکر دولت نہیں کما رہے ہیں۔ وہ سونے کی کان بنی ہوئی ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کیوں کہ اس نے کبھی اپنی دنیا سے نکل کر باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔ اس کا آج بھی یہ خیال ہے کہ وہاں صرف بے حیائی اور فحاشی ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ کیا ہمارے ہاں نہیں ہے۔ بدکاری‘ لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کے تعلقات.... وہ اس بات کو نہیں مانا اور آج بھی نہیں مانتا ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ غربت و افلاس اور بدحالی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسے اپنی آخرت سنوارنے کی فکر رہتی ہے۔ میں نے پتاجی سے کہا کہ میں ہر قیمت پر دبئی جاؤں گا۔“ تو پھر دبئی چلا گیا.... اچھا تو اب بتا.... تو یہ اچانک اور غیر متوقع دبئی کیوں اور کس لیے چلا گیا؟ کیا لینے گیا تھا؟“
”وہ تو میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا؟ لیکن تو یہ بتا کہ کیا کر رہا ہے؟ کیا غور صاحب کوئی اچھا گیت لکھنے پر غور کر رہا ہے؟“
”میں رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں جو شاید دس پندرہ دنوں میں آنے والا ہے۔“ اشوک نے بتایا۔
”میری ماں میری جان! گیت کا خیال اور روپے پر غور کرنا چھوڑ دے.... رزلٹ تو ایک دو دن آگے پیچھے آئے گا۔ اس طرح جس عورت کی کوکھ سے بچہ جنم لیتا ہے.... پھر اس کے بعد وہی ستاروں والا کام؟ کیوں؟“ وہ ہنس کر بولا۔
”میں نے بہت غور کیا رات دن.... کوئی کام سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ گھر کے حالات میں پھنس گیا ہوں .... کہاں جاؤں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔
مہندر ناتھ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر وہ شہر لے آیا۔ سب سے بہترین ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ پھر اس نے آملیٹ اور کافی کا آرڈر دیا۔ پھر اس سے بولا۔
”دیکھ یار....! وقت کسی کا نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی بار بار ملتا ہے۔ ہر عمر کی لڑکیاں عورتیں روز ہی مل جاتی ہیں۔ سونے کا کاروبار کوئی معمولی نہیں ہوتا ہے۔ یہ سبزی یا کریانے کی دکان نہیں کہ جو چاہے کر لے۔ لیکن اب بڑے بزنس کے لیے سرمایہ بھی بڑا چاہیے۔ حالات اور وقت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ وہ تیرے پاس کیا تیرے پتاجی کے پاس بھی نہیں ہے۔“
”اس لیے تو میرے گھر اور دکان کے حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے جیولرز کا مقابلہ ہم کیسے کریں اور کبھی دوسرا کام کیا نہیں؟“
”میرے بیٹے غور کر لیا! غور کرنا چھوڑ دے۔ ٹکٹ کٹا اور دبئی آجا.... اگر تو اس قصبے میں رہا تو کنگال ہی رہے گا۔“
”یار....! اب بات ایسی بھی نہیں.... سڑکوں پر گاڑیوں کو اور ان کی تعداد کہ ان میں کون سا ماڈل نہیں ہے۔ اب تو پرانے مکانوں کی جگہ کوٹھیوں نے لے لی ہے.... بنگلے بھی بن رہے ہیں۔ لڑکیاں عورتیں بھی کیسی بولڈ نظر آتی ہیں.... اپنا جسم اور نشیب و فراز جو چھپانے کا ہوتا ہے اس کی نمائش کرتی نظر آتی ہیں۔“
”تو خود کو دیکھ تجھ میں کتنی صلاحیت ہے اور تو کیا کر سکتا.... ؟ نہ تو تیرے پاس مال بنانے کے لیے مال ہے؟ پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے یہ پرانی بات ہے لیکن آج بھی سو فیصد درست ہے.... تیرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں .... تجھے کوئی کام نہیں آتا.... یہاں کیا پلمبر‘ الیکٹریشن

اور موٹر مکینک سب کا حال خراب ہے۔ بڑا افسر بننا بھی تیرے بس کی بات نہیں۔"

"تو کہتا تو سچ ہی ہے... لیکن بتا کہ پھر میں کیا کروں؟ شہر جا کر کسی بینک میں ڈکیتی ماروں۔"

"وہ بس تیرے بس کی بات نہیں... بتایا ہے نا... دبئی آجا میرے پاس جیسا تو ہے اپنا ایسا ہی تھا حال کچھ نہیں آتا تھا۔ کچھ دن دھکے کھائے اور سیکھ لیا... گیا تو مزدور تھا... پھر راج بن گیا اور کام کرتے دیکھا دوسروں کو تو سمجھ میں آگیا... دبئی میں دنیا کے دولت مند آتے ہیں۔ وہ شیوخ ہیں جو پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ ایک کی جگہ دس لٹاتے ہیں۔ پھر میں نے ان سب سے تعلق پیدا کر لیا۔"

"مگر یار! مجھے اردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی آتی ہے نہ عربی۔"

"یار! تین مہینے لگتے ہیں۔ آدمی کا بچہ خود ہی اپنے گھر کی زبان بولنے لگتا ہے یا نہیں؟ اسے کون پڑھاتا ہے۔ میں بھی تو ٹوٹی پھوٹی بولتا تھا مگر کام چلاتا تھا۔ رفتہ رفتہ روانی آگئی۔ صرف دو برس ہوئے ہیں بیٹا۔" میں ٹھیکے دار بن گیا ہوں۔ ابھی بہت چھوٹا ٹھیکے دار ہوں۔ لیکن تو دیکھنا کہ دس برس میں کیا بنتا ہوں... مجھے اس وقت ایک قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے... تاکہ اسے پارٹنر بنا سکوں۔ جو بھروسے کے قابل ہو اور تو نے کرکٹ کے میدان میں جس طرح میرا ساتھ دیا... میری مدد کی... میری کپتانی کا بھرم رکھا۔ وہ مجھے یاد ہے۔"

"لیکن میری جان! میں کیسے آؤں؟ تیرا چاچا تو ڈپٹی مشنر تھا؟" اشوک نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

مہندر ناتھ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اوے زرگر کی اولاد... یہ جتنے ایجنٹ ہیں... یہ تیرے چاچے اور مامے ہیں سمجھ لے... کوئی بھی تجھے بھجوا سکتا ہے اس کے لیے کسی سفارش اور جھن جھٹ کی ضرورت نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں... صرف اور صرف ایک لاکھ ڈالر ہے۔"

"ایک لاکھ...؟" اشوک کی سانس رک گئی "وہ میں کہاں سے لاؤں؟ تو ایسا کہہ رہا ہے ایک لاکھ جیسے ایک ہزار ہو۔"

"جہاں سے مرضی سے لا... یہ تیرا مسئلہ ہے... اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ چوری کر... ڈاکا ڈال... تو نے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ ایک اکیلے ڈکیت نے صرف ایک ریوالور کے زور پر دن دہاڑے ہمت بہادری اور جرات اور ذہانت کی صلاحیت سے منصوبہ بندی کی اور بینک لوٹ لیا... اس کے علاوہ دو ایک وارداتیں ایسی بھی ہوئی ہیں جن میں صرف ایک ہی شخص نے اسلحہ کے زور پر کوٹھی میں ڈاکا مارا... نہ صرف تمام زیورات اور رقم بلکہ وہاں کی لڑکیوں عورتوں کی آبرو ریزی کی... تو بھی کر سکتا ہے۔ نہ صرف نوجوان بلکہ وجیہہ اور دراز قد بھی ہے... گوالن اور جانے کتنی لڑکیوں سے دل بہلاتا ہے۔ یہ تو قسمت کی لاٹری ہے۔ آج لاکھ کل کروڑ بنا لو... ہمت اور صلاحیت نہیں تو پھر یہاں بیٹھ کر غور کرتا رہ وہ اسی طرح جی اور مر جیسے تیرے باپ دادا جیے اور مرے اسی طرح کنویں کے مینڈک کی طرح زندگی گزار... ورنہ زندگی کیا ہے... تو برا نہ ماننا۔ زرگر کے بھی بڑے مزے ہوتے ہیں۔ تیرے پتا جی نے لڑکیوں عورتوں کی سونے کے زیورات کی کم زوری سے اپنی جوانی میں خوب مزے لوٹے... ان سے کھلونوں کی طرح کھیلا لیکن اپنا مستقبل نہ بنا سکا... دولت کے مزا کا جب پتا چلتا ہے جب دولت ہاتھ میں آئے۔ پہلے سکھوں کے پانچ کاف تھے۔ کنگھی... کیس کڑا کرپان اور کچھار... اب ساری دنیا کے ہیں۔ کیش... کاروبار... کوٹھی... کار کڑی... دنیا کی سب سے سوہنی کڑی بھی اپنی... کار بھی اپنی... کوٹھی بھی اپنی... تو دبئی آیا تو ایک نئی دنیا دیکھے گا... جو خوابوں اور فلموں میں بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اتنی حسین کہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کون سا ایسا ملک ہے جس کے مرد، لڑکیاں اور عورتیں نہ آتی ہوں وہاں جو حسن و شباب کا دریا ہے وہ دل کو

برماتا ہے۔ حسن و شباب اسی کا اسیر اور غلام ہے جس کے پاس دولت کی فراوانی ہو۔ دولت سے کیا کچھ نہیں خریدا جاسکتا ہے؟"

اشوک ہکا بکا بیٹھا دوست کی باتیں سنتا رہا اور غور کرتا رہا کہ اس کی پیش کش سے فائدہ کیسے اٹھائے مہندر ناتھ نے اپنی چرب زبانی کی عادت کے مطابق دبئی کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں خاص مبالغہ آرائی کی تھی اور اس کی عادت سے واقفیت کے باوجود اشوک اسے اپنے سپنوں کی حسین خزانوں سے بھری وادی کا نظر آیا جہاں دولت کا حصول آسان تھا اور عیاشی کے سارے اسباب ہر ایک کی دسترس میں تھے۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ "دبئی چلو" ہر نوجوان احساس محرومیوں کے گھرانے اور بے روزگار مرد کے دل یک صدا بن گئی تھی۔ امریکہ اور یورپ جانے کی خواہش اتنی عام نہ تھی۔ امریکہ جانے کا جو کریز تھا وہ ختم تو نہیں ہوا اس کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ بڑے شہروں کی لڑکیاں عورتیں امریکہ جانے کے لیے مری جا رہی تھیں۔ بڑی رقم خرچ آتی تھی۔ بعض ایجنٹ ایسے تھے جو بھاری رقوم کے عوض جعلی ویزا بنوا دیتے تھے۔ اور جن کی قسمت اچھی تھی وہ نکل گئے تھے۔ نوجوان اور حسین اور پرشباب کنواری لڑکیوں کو چوں کہ ہر قیمت پر امریکہ جاکر مستقبل بنانا تھا لہٰذا انھوں نے اپنی دوشیزگی کو کالی راتوں کی بھینٹ بڑی فیاضی سے چڑھایا تھا۔ یہ سلسلہ گو ابھی بھی جاری تھا لیکن دبئی جانے کے لیے یہ پاپڑ بیلنا نہیں پڑتے تھے۔ اس لیے کہ امریکہ یورپ کے بجائے وہ کویت، مسقط، دبئی یا سعودی عرب چلا جاتا۔ مہندر ناتھ نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھ کر کہا۔

"میری جان! اگر تیرا ارادہ بن جائے تو.... تو مجھے فون کرلینا.... یہ میرا کارڈ رکھ لے۔ زیادہ غور مت کرد ورنہ درمیان سوچ کی پھانسی پر لٹک جائے گا۔"

اشوک نے کارڈ کو تھام کر اسے اس طرح چوم لیا جس طرح وہ گوالن کے نشیب و فراز اور ہر گوشے کو چومتا تھا۔

"کیوں نہیں میرے یار! میں ضرور آؤں گا۔ سر کے بل آؤں گا۔"

پھر وہ ہوٹل سے نکل کر نہر کے پل کے پاس آئے۔ اس لیے کہ اشوک کو اپنی سائیکل لینی تھی۔ اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی اور خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ مہندر ناتھ نے گاڑی روک کر مخالف سمت اشارہ کیا۔ ایک عورت اس شدید سردی میں ململ کی سفید اوڑھنی کو جسم کے گرد لپیٹے پل کی طرف آرہی تھی۔ سکڑی سمٹی اور تھر تھر کانپتی ہوئی۔ اوڑھنی میں سے اس کا سانولا جسم جھانک رہا تھا۔ اس کے بدن پر زیر جامہ نہیں تھا۔ جیسے جیسے اس کا فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا اس کا جسم، نشیب و فراز، گوشے، خطوط اور عضو عضو اجاگر اور نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ باریک سے باریک خدوخال بھی پردے میں نہیں تھا۔ گو اس عورت کی عمر چونتیس پینتیس برس کی معلوم دیتی تھی۔ چوں کہ وہ چھریرے اور متناسب بدن کی تھی۔ اس کا رنگ مستی ابلتا اور ستار کے تاروں کی طرح کسا کسا تھا وہ دوشیزہ لگ رہی تھی۔

"یہ عورت کامنی ہے اور ان دو بچوں کی ماں ہے۔" مہندر ناتھ نے کہا۔ "کیسی ہے؟"

"نہایت پرکشش اور جاذبیت سے بھری ہوئی ہے۔ یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ ان بچوں کی ماں ہے۔ لیکن وہ بے نیام تلوار کی سی حالت میں کیوں چلی آرہی ہے۔؟" اشوک نے حیرت سے کہا۔ "کیا یہ تیری تلاش میں آرہی ہے؟"

"جب بھی اسے کسی شکار کی تلاش ہوتی ہے تو وہ اسی حالت میں نکلتی ہے تاکہ کوئی شکار پھنس جائے۔" مہندر ناتھ نے کہا۔ "چل اتر.... تاکہ اس پرسکوں کی بارش کی جائے.... پانی میں بھیگا بدن قیامت ڈھائے گا۔"

"لیکن، ہم دو مردوں کے سامنے کیا وہ اس حالت میں آجائے گی؟" اشوک نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیا بچوں جیسی باتیں کرتا ہے۔" مہندر ناتھ نے کہا۔ "وہ اس حالت میں تین تین چار چار مردوں کے

سامنے چلی جاتی ہے اور جانا پڑتا ہے۔ ان سب کو خوش کرنا پڑتا ہے اور ہر طرح سے خوش کرتی ہے۔ ان کے کسی نامناسب فعل اور حرکتوں پر احتجاج نہیں کرتی اور نہ انکار.... اس لیے اسے مال چاہیے.... غربت، مفلسی اور ضرورت بھی اسے اس راستے پر لاتی ہے۔ آدمی کتنا مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کی نوجوان بیٹی سولہ برس کی ہے لیکن اپنی ماں سے زیادہ پرکشش نہیں ہے۔ اس لیے کہ ماں کے بدن میں جو گداز اور جاذبیت ہے وہ ابھی بیٹی میں نہیں آئی ہے۔"

دونوں گاڑی سے اتر آئے۔ کامنی گاڑی کے قریب آئی تو مہندر ناتھ نے اسے آغوش میں لے کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس عورت کے چہرے پر جذباتی انداز سے جھکا رہا۔ کامنی نے اس سے الگ ہونے کے بعد اپنی اوڑھنی کار میں ڈال دی۔ پھر وہ بے نیام تلوار کی حالت میں پانی میں کود گئی۔ مہندر ناتھ اس پر سکوں کی بارش کرتا رہا۔ پھر اس سے باہر آنے کو کہا اور ڈگی سے تولیا نکال کر اس کے جسم سے پانی خشک کر رہا تھا کہ گوالن آگئی اور اس نے آتے ہی مہندر ناتھ کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" اشوک نے حیرت سے کہا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"ہم دونوں پرانے پاپی ہیں۔" گوالن ہنسی۔ "تین برس بعد اس سے ملن ہو رہا ہے.... میں تمہاری تلاش میں آئی تھی۔"

تھوڑی دیر بعد مہندر ناتھ گوالن کو کنج میں لے گیا اور اشوک کامنی کو کار کی پچھلی نشست پر.... جب وہ دونوں سرفراز ہو کر کنج اور کار سے باہر آئے دن ڈوب رہا تھا۔ مہندر ناتھ نے کامنی کو سو کا نوٹ دیا تو وہ تیزی سے اس سمت دوڑتی لپکتی چلی گئی جس سمت سے آئی تھی۔ کیوں کہ سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ گوالن نے قدرے تذبذب سے سو کا نوٹ لے لیا۔ وہ رقم کے عوض دل نہیں بہلاتی تھی۔ اسے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنے پتی سے انتقام لیتی اور اپنی پیاس بجھاتی تھی۔

اشوک کے لیے مہندر ناتھ کی آمد اور اس سے ملاقات گویا قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی تھی۔ کامنی نے اسے جتنا خوش کیا۔ اس میں جو والہانہ پن اور خود سپردگی تھی اس نے کبھی گوالن میں اور کسی بھی عورت اور لڑکی میں نہیں پایا تھا۔ اس پر جو اس کے شباب کا نشہ چھایا تھا اس کا خمار دو دن تک طاری رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سکے جمع کرنا شروع کر دے گا۔

رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو اس نے سوچا کہ قسمت کی مہربان دیوی اسے راستہ دکھا رہی ہے اور موقع فراہم کر رہی ہے۔ اس کی زندگی میں جو یہ سنہرا موقع آیا تھا پھر کبھی نہیں آ سکتا تھا۔ اگر اس نے کھو دیا تو پھر اسے اس قصبے میں ہی رہنا پڑے گا۔ وقت سے فائدہ اٹھانا خود اس کی اپنی کوشش اور ہمت پر منحصر تھا۔ حوصلہ کرنے والی صرف ایک بات تھی۔ ایک لاکھ کے حصول کا خیال کسی سمندر کی پرجوش لہر کی طرح آتا تھا تو اس کے خوابوں کے ریت سے بنے محل ڈھا دیتا تھا۔

دو تین صورتیں ایسی تھیں جن پر عمل کر کے وہ ایک لاکھ کی رقم حاصل کر سکتا تھا۔

ایک صورت لال کوٹھی کی تھی جس میں رنجنا عورت اکیلی رہتی تھی اور اس کے ملازم جو میاں بیوی تھے وہ نیچے رہائش رکھتے تھے۔ رنجنا چھبیس ستائیس برس کی گوری چٹی اور دراز قد عورت تھی۔ بھرے بھرے جسم کی تھی۔ اس کے انگ انگ میں بجلیاں بھری تھیں۔ اس کا پتی سنگاپور کاروبار کے لیے جاتا تو پندرہ بیس دنوں یا مہینے دو مہینے لوٹتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے ایک رات اس کوٹھی کے بیڈ روم کی کھڑکی پر رنجنا کو ایک مرد کے ساتھ بوس و کنار کی حالت میں دیکھا تھا۔ چوں کہ وہ اس کوٹھی میں ایک دو مرتبہ کسی کام سے جا چکا تھا لہٰذا وہ سیوریج کے پائپ سے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے مرد کو پہچان لیا۔ وہ فٹ بال کا کھلاڑی رام ناتھ تھا۔ رنجنا اور اس کے کپڑے فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں غلاظت

کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ جیسے اس میں سے نکلے اور رام ناتھ کپڑے پہن رہا تھا تب رنجنا نے دیوار میں نصب تجوری کھولی۔ اس میں زیورات کے علاوہ نوٹوں کی گڈیاں بھی تھیں۔ رنجنا نے ایک ایک کے نوٹوں کی گڈی نکال کر رام ناتھ کو دی تو وہ اتنا خوش ہوا کہ رنجنا کو آغوش میں لے کر بے تحاشا چومنا شروع کیا۔ پھر وہ رنجنا کو بے حال کر کے چلا گیا۔ رنجنا بہت دیر تک بے لباس کی حالت ہی میں پڑی رہی۔ اس کے جذبات میں ہل چل سی مچی رہی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ بیڈ روم میں گھس کر رنجنا کو قابو میں کر کے بے بس کر دے۔ لیکن وہ اس کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے سوچا کہ کیا رنجنا کو بلیک میل کر کے ایک لاکھ حاصل کر سکے گا۔

دوسری صورت سیٹھ لال چند کی تھی جس کی کریانہ کی آڑھتی تھی۔ اس کے نوکر نے اسے بتایا ہوا تھا کہ وہ رات دکان بند کر کے گھر آ کر اور کھانا کھا کر دو گھنٹے تک رقم گنتا رہتا ہے۔ پھر وہ نقاب پوش بن کر نقلی ریوالور لے کر گھس جائے۔ ایک لاکھ کیا وہ دو تین لاکھ بھی اسلحہ کے زور پر لا سکتا ہے۔ اس کے لیے جس ہمت اور جرات کی ضرورت ہے اس میں کہاں ہے۔

مارواڑی جگ دیپ جس نے دوسری بیوی کے دیہانت کے بعد تیسری شادی سولہ برس کی لڑکی سے کی تھی وہ نہایت حسین تھی۔ وہ زیورات سے لدی پھندی رہتی تھی۔ وہ اپنے گھر کے عقب کے تالاب میں جو جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے درمیان تھا بڑی دیر تک بڑی آزادی اور اطمینان سے نہاتی تھی۔ نہ صرف لباس بلکہ زیر جامے بھی ایک پتھر کے نیچے دباتی تھی۔ تمام زیورات بھی ایک پوٹلی میں رکھ دیتی تھی۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی پر کشش اور دل کشی اور رعنائیوں سے بھرپور۔ اس نے دو ایک مرتبہ اسے جی بھر کے نہاتے اور تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مارواڑی نے اسے ایک لاکھ میں خریدا تھا لیکن وہ جو زیورات سے لدی پھندی رہتی تھی۔ وہ تین لاکھ کی مالیت سے کم نہ تھے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ریوالور کے زور پر نقاب پوش بن کر اس کی عزت پر ڈاکا مارے اور زیورات لے کر چمپت ہو جائے.... ایک سوال جو اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اسے کہاں فروخت کرے؟ سب سے مشکل زیورات کا بیچنا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ نوجوان تھا دکان دار مشکوک ہو جاتے۔ یہ زیورات قصبے سے باہر ہی فروخت ہو سکتے تھے۔ اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔ مہندر ناتھ سے بعد میں صرف ایک بار نہر کے پاس ملا تھا۔ گوالن اور کامنی بھی آئی تھیں۔ مہندر ناتھ نے ان دونوں کو برانڈی پلا کر کنج میں اس کے ہمراہ جشن منایا تھا۔ برانڈی نے اس سردی میں گوالن اور کامنی کو بہت خوش کیا تھا۔

اس ملاقات سے پہلے پورا ہفتہ اشوک نے دن رات غور و فکر اور منصوبے میں صرف کیا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا اس نے مارواڑی کی نوجوان بیوی کی آبرو اور زیورات پر ڈاکہ مارنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک روز اس نے میک اپ سے اپنا حلیہ ایک ڈاکو جیسا بنایا اور دوپہر کے سناٹے میں تالاب پر پہنچ گیا۔ جس وقت مارواڑی کی نوجوان بیوی نے زیورات کی پوٹلی لباس اور زیر جامے نکال کر پتھر کے نیچے رکھے تو اس نے درخت کے پیچھے سے نکل کر مارواڑی کی بیوی کو دبوچ کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کی مہر ثبت کر دی کہ کہیں وہ مزاحمت اور شور شرابا نہ کرے یہ دیکھ کر اس کی حیرت نہ رہی کہ اس نے پوری خود سپردگی سے خود کو اشوک کے حوالے کر دیا۔ اشوک کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شاید یہ کوئی چال نہ ہو۔ فریب نہ ہو۔ ایسی وارفتگی اور والہانہ پن.... جب وہ سرشار، سرفراز اور کیف و سرور اور طوفان سے گزر کر پوٹلی لے کر فرار ہونے لگا تو وہ بولی تھی کہ تم کبھی کبھی آجایا کرنا۔ میں پیاسی رہتی ہوں۔ اس نے نشاط انگیز لمحات کے دوران محسوس کیا تھا کہ وہ واقعی پیاسی تھی۔ اس کا بوڑھا شوہر کوئی جوڑ تھا اور نہ ہی اس کی پیاس بجھا سکتا تھا۔ ایک اور حیرت اس بات کی تھی کہ جب وہ اسے تاخت و تاراج اور تہس نہس کر کے زیورات کی پوٹلی اٹھا کر فرار ہو رہا تھا تو اس نے شور و غل نہیں مچایا پھر بعد میں

اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ سارے زیورات جن میں کڑے، چوڑیاں، نیکلس اور آویزے تھے وہ سب نقلی تھے اور ان کی مالیت تین سو سے بھی کم تھی۔ مارواڑی نے جھوٹی شان دکھانے کی غرض سے یا پھر چوری ہونے کے خیال سے نقلی زیورات اس کے بدن پر سجائے ہوئے تھے۔

وہ ایک ہفتہ بڑا فکر مند اور پریشان تھا کہ آخر یہ ایک لاکھ کہاں سے اور کیسے فراہم ہوں۔ آنند پور میں اس کے دوست اور خاندان کے لوگ جان چکے تھے کہ اشوک کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے... ظاہر ہے اس کے دوست مذاق اڑا سکتے تھے۔ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔ اس کا باپ اس سے الگ ناراض تھا اور ماں کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو اشوک کو گھر میں گھسنے نہ دیتا۔ وہ اپنے بیٹے کے مستقبل سے سخت مایوس اور پریشان اور فکر مند تھا اور اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔

اشوک کو چوری ڈکیتی کا راستہ اختیار کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا مگر آنند پور میں صرف ایک بینک تھا۔

اسے لوٹنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اشوک کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ اور دروازے پر کھڑا گارڈ بڑی آسانی سے ایک گولی چلا کے اشوک کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتا۔ یہی صورت حال جیولرز کی اور مالدار لوگوں کی تھی۔ وہ سب اسلحہ رکھتے تھے اور خود اس میں اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ بالآخر اس نے بے شرمی کا لبادہ اوڑھ کے اور اپنی انا اور بڑے پن کا گلا گھونٹ اپنے چھوٹے بھائی سے رجوع کیا۔

اس کے بھائی دیپک نے اپنے کریانہ اسٹور کو بہت پھیلا لیا تھا۔ اس نے گھر کی بیٹھک کو بھی دکان میں شامل کرلیا تھا اور کریانہ شاپ کا بورڈ ہٹا کر دگنی چوڑائی کے بورڈ پر دیپک جنرل اسٹور لکھوا لیا تھا۔ اندر سے بھی دکان کی حالت میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اس میں سامان بڑھ گیا تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر شیلف لگ گئے اور پارٹیشن بھی بنا لیا تاکہ سامان اندر رکھا جاسکے اور پھر اس نے سامان تولنے کے لیے چاق و چوبند اور مستعد لڑکا ملازم رکھ لیا تھا۔ اب وہ خود کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا صرف پیسے وصول کرتا تھا۔

اشوک کو اپنی دکان پر دیکھ کر وہ نہ صرف خوش ہوا بلکہ حیران بھی۔ کیوں کہ اسے توقع نہیں تھی۔ اس نے بھائی کو اپنی کرسی دی اور خود اسٹول پر ٹک گیا۔ ٹھنڈی بوتل کا موسم نہ تھا۔ اس نے لڑکے کو بھیج کر ہوٹل سے پکوڑے، سموسے اور کافی منگوائی۔

''تمہارا کاروبار بہت ترقی کر رہا ہے؟'' اشوک نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''بھیا جی! محنت کرو اور توجہ دو تو پھل ملتا ہی ملتا ہے۔'' دیپک ذرا غرور سے بولا۔

اشوک نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ اسے تو بغیر محنت کیے ہی پھل دار درخت مل گیا تھا۔

''اچھا تو بھرجائی کیسی ہے؟'' اشوک نے رسمی انداز سے پوچھا۔

''اندر گھر میں جا کر خود ہی دیکھ لیں... آج کتنے عرصے بعد تو آپ نے اپنی شکل دکھائی ہے۔ وہ تو بہت یاد کرتی ہے آپ سب کو۔'' اشوک نے پھر سچ بات زبان پر لانے سے گریز کیا تھا کیوں کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کی بھابھی نے ہی اپنے پتی ہی کو ورغلایا تھا، اکسایا تھا، مجبور کیا تھا اور اس طرح گھر سے نکال کر لے جانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ گھر میں کتنا فساد برپا کرچکی تھی اور ساس جیٹھ سب سے کہہ چکی تھی... یہ اشوک بھیا بھولا نہیں تھا۔ اس کے سامنے جا کے اس کی خیریت دریافت کرتا۔ کسی پاگل کتے کے سر پر دست شفقت رکھنے کے مترادف ہوتا اور پھر اس کے بھائی نے ایک بار بھی گھر آنا اور بیوی کو لانا پسند کیا تھا۔

''بھابھی سے پھر آؤں گا تو ملوں گا... ابھی تو ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ جو صرف تم کرسکتے ہو؟'' اشوک نے سموسہ اٹھا کر کہا۔

دیپک نے پکوڑا اٹھا کر مسکرا کے سرہلایا اور پھر بولا۔

''ہاں... ویسے تو کسی کو ہماری یاد آتی نہیں... ماں باپ تک غیر ہوگئے ہمارے لیے... نہ پوتا پوتی اپنے

رہے اور نہ ہی بیٹا ہو۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں اچھا آپ کام تو بتائیں؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ انکار تو نہیں کرو گے؟" اشوک نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھیا جی! غصہ مت کرنا آپ کے بارے میں عجیب باتیں سنی ہیں میں نے۔۔۔ خاندان والے بھی کہتے ہیں اور آپ کے کچھ یار دوست بھی۔"

"ایسی کیا بات ہے دیپک! بتانے میں حرج نہیں ہے تو میں بھی تو سنوں؟" اشوک کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"ایک تو یہ آپ فلمی اداکارہ مدھوبالا سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو فلموں میں کام کرتی ہے۔ آپ نے ماں سے یہ کہا تھا؟" اشوک کو یہ بات بڑی ناگوار لگی تو اس نے برہمی سے کہا۔

"دیپک! کیا تمہیں اس دکان میں فروخت کے لیے رکھی ہر چیز کا تھوک اور پرچون بھاؤ معلوم ہوگا۔۔۔ یا نہیں؟"

دیپک حیرانی سے بولا "ہاں ہے کیوں نہیں لیکن میری بات کا اس سے کیا تعلق؟"

"کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ مدھوبالا جس نے فلم مغل اعظم میں کام کیا تھا اور فلموں میں ہیروئن آتی تھی اس کا دیہانت ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ تمہاری شادی ہونے اور میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ماں چاہتی تھی کہ میں بھی شادی کر لوں۔ اس نے کوئی چھ سات لڑکیوں کے نام پیش آ گئے۔ اتفاق سے مجھے اس میں سے ایک لڑکی بھی پسند نہیں تھی۔ میں نے اپنا پیچھا چھڑوانے کے لیے مدھوبالا کا نام لے لیا تھا۔"

دیپک اس کی بات سن کر بری طرح جھینپ گیا اور پھر خجل ہو کر کہنے لگا۔

"بھیا! آپ جانتے ہیں کہ یہاں کوئی سینما ہال نہیں، شہر میں سینما ہال ہیں۔ میں نے تو زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی۔۔۔ مجھے کیا معلوم کہ مدھوبالا کون تھی؟ آپ کی شادی کے لیے ان کا فکرمند ہونا بھی غلط نہیں تھا۔ آپ کی بھی ضرورت تھی اور اس کی بھی ضرورت تھی۔"

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم نے میرے متعلق اور کیا کیا سنا اور سن رہے ہو؟" اشوک نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ بات تو ہر کوئی کہتا پھر رہا ہے کہ آپ نے پتا جی کے ساتھ کام کرنے اور دکان سنبھالنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ دبئی جا رہے ہو؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن ایک مسئلہ ہے جس کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔" اشوک نے کہا۔

دیپک چونک پڑا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا سینہ دھڑک اٹھا۔

"مسئلہ کیا؟ کیا دبئی جانا مشکل ہو رہا ہے؟"

"بندوبست سارا ہو گیا ہے۔ دبئی میں نوکری بھی بہت اچھی ملی ہے۔ جس کی توقع نہیں تھی۔ قسمت کی دیوی نے کام بنا دیا۔ کل پاسپورٹ بھی بنا لوں گا۔"

چھوٹے بھائی نے سکون کا سانس لیا کہ دبئی جانے والا اس سے ماں باپ کی ذمے داری کے موضوع پر بات کرنے نہیں آیا کہ یا انہیں اپنے پاس لے آیا۔ خود ان کی ساتھ رہو۔ تم نے اب تک پلٹ کر ان کی خبر نہیں لی اب ان کا خیال رکھنا۔

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔۔۔ ایجنٹ تو دو تین دن میں پاسپورٹ بنوا دیتے ہیں۔۔۔ جاؤ خیریت سے۔۔۔"

"مسئلہ ہے رقم کا۔۔۔ ٹکٹ اور ویزا اور اوپر کے اخراجات کا جو بنتے ہیں تقریباً" ایک لاکھ۔۔۔ ابھی تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ لیکن دبئی میں جو ایک لاکھ ہو جائیں گے دو مہینے میں زیادہ سے زیادہ تین مہینے میں تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔ ابھی تم مجھے ایک لاکھ ادھار دے سکتے ہو؟" دیپک اسے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"اچھا! اس لیے آج آپ کے خون نے جوش مارا تو اس لیے چھوٹا بھائی یاد آیا۔۔۔؟"

"خون کے رشتے کچھ نہیں ہوتے ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر ختم ہو جاتے ہیں۔ مصیبت میں اپنے ہی تو کام

آتے ہیں۔"
"بھیا جی! کچھ پتا ہے لاکھ میں صفر کتنے ہوتے ہیں؟ گو کہ میری دکان اتنی بڑی ہے لیکن اس میں مال ایک لاکھ کا نہیں ہوگا۔ اور یہ دکان داری چلتی ہے ادھار کی پرچون پر.... آٹا' دال' چاول اور تیل لے جانے والے بھی سبھی نقد کے خریدار نہیں' چوں کہ محلے کی دکان ہے اور محلے داری نبھانا پڑتی ہے.... کوئی وقت پر ادائیگی نہیں کرتا ہے.... کوئی تو کوئی دو تین مہینے کا ادھار کر جاتے ہیں.... اور کچھ تو حیلے بہانوں سے ٹال دیتے ہیں۔ بے شک آپ دیکھ لیں کہ میرے گلے میں جتنے ہیں وہ آپ کے.... آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ...." وہ ایک سانس میں بول گیا۔
"ایک لاکھ تمہارے لیے مشکل نہیں.... سب جانتے ہیں کہ تم کتنا منافع لیتے ہو اور روز کی سیل کتنی ہے؟"
"کتنی ہے؟ چل آپ ہی بتا دیں۔" دیپک کو تاؤ آ گیا۔ اس نے اپنا فیصلہ ضبط کیا۔
"کم سے کم چار سے سات ہزار تک.... دکان کے مال سے اندازہ لگتا ہے۔"
"بکواس کرتے ہیں ایسی بات کہنے والے.... اور وہ بے وقوف ہیں جو ان کی باتوں پر اعتبار کرتے ہیں.... لیکن آپ تو بھیا بڑے تعلیم یافتہ ہیں.... یہ بتاؤ کہ دنیا میں کوئی ادھار دیتا ہے؟ ضمانت لیے بغیر بینک ہو.... مہاجن یا مارواڑی ہو.... سود خور ہو.... میں کہیں سے ایک لاکھ کر دوں تو واپسی کی کیا ضمانت ہوگی؟ اگر آپ کسی وجہ سے نہ دے سکے اور ٹالتے رہے تو کیا میں دبئی آ کر آپ پر دعوا کروں گا؟"
"مجھے تیری باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم بنیا ہو گئے اور ضمانت کی بات پہلے کرو گے.... دیکھو ہمارا باپ زرگر ہے۔ یہاں اس کی ساکھ ضرور ہے۔ اس کا ایک مکان ہے اور دکان بھی مارکیٹ ہے۔ اس کے وارث ہم دونوں ہی ہیں۔ میں اپنا حصہ تمہارے حق میں چھوڑتا ہوں۔ یہی ایک صورت ہے ضمانت کی۔"
دیپک اس کی بات سن کر اس طرح ہنسا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔
"تو آپ پتا جی کی دکان اور اس کے مکان کو گروی رکھنے کی بات کر رہا ہے۔ کیا مالیت ہوگی اس کی؟ آدھا تو میرا حصہ نکال دیں۔ اس کے علاوہ کیا پتا جی اشٹام لکھ کر دے دیں گے؟ پہلے جا کر ان سے تو پوچھ لیں۔ پھر آنا میرے پاس.... چائے پی لی نا.... اب آپ جائیں۔ گاہکوں کا رش بڑھ رہا ہے۔ مجھے دکان سنبھالنی ہے۔"
اشوک نے سخت بے عزتی محسوس کی لیکن یہ مایوسی غیر متوقع نہیں تھی۔ دیپک کی جیب میں دس لاکھ بھی ہوتے تو تب بھی وہ ایک لاکھ بھی نہ نکالتا۔ اگر اسے اتنی پروا ہوتی خون کے رشتوں کی تو گھر نہ چھوڑتا۔ اس کے نزدیک رشتے کی اہمیت نہیں رہی تھی.... سب کا خون سفید ہو گیا ہے۔ وہ واپس آتے ہوئے اندر ہی اندر کسی سوئے ہوئے آتش فشاں کی طرح کھولتا رہا۔
ماں دیکھ رہی اور محسوس کر رہی تھی کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہے۔ کام کی بات تو اس سے کرنا لاحاصل ہی تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرنا چاہتا تھا.... کچھ لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر جانے کے چکر میں ہے۔ نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ رات کو اس نے کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا اور منہ لپیٹ کر سو بھی گیا تھا۔ آدھی رات کو بھوک نے ستایا تو اس نے اپنے حصے کا بچا ہوا کھانا کھایا اور پھر سو گیا۔
غور کرتے کرتے اشوک کی حالت غیر ہو گئی تھی کہ آخر وہ کب تک غور کرتا رہے گا۔ غور کرتے کرتے اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ کیوں آخر غور کرنے کی بھی تو حد اور انتہا ہوتی ہے۔ مگر اس مسئلے کا حل ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایک لاکھ کہاں سے ہوں گے؟ اس نے جو بھی تدبیریں کیں وہ الٹی ہو گئی تھیں۔ اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ لڑکی عورت کے معاملے میں تو بڑا بھاگوان ہے.... اس نے جس کلی کو پھول' دوشیزہ کو عورت.... اور جس شادی شدہ پر شباب عورت کو اپنی ملکیت بنایا وہ اسے خوش کرتی رہی تھی۔ اب اسے مرد کی عورت' کلی اور دوشیزہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

یہ سوال اس کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑا تھا کہ ایک لاکھ کہاں سے حاصل کرے؟ اگلے روز مہندر ناتھ کو اس نے تلاش کیا اور اس کے گھر جا پہنچا۔ وہ قصبے کی ایک لڑکی جس کا نام گوری تھا۔ وہ صرف نام کی گوری نہ تھی۔ تیرہ برس کی ہو گی۔ کسی گوالن کی بیٹی تھی وہ دونوں بستر میں اور غلاظت میں تھے۔ گوری نے لباس پہنا اور باہر جانے لگی۔ تو مہندر ناتھ نے اسے سو کا نوٹ دے کر اور بے تحاشا چوم کر رخصت کیا۔ پھر اس نے کہا۔

"تو اچھا ہوا آ گیا۔ میں کل دبئی جا رہا ہوں اور سفر کی تیاری کروں گا۔ تو نے کیا سوچا میری جان؟"

"کیا سوچوں یار.... ! مسئلہ ایک لاکھ کا ہے جو حل ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے؟" اشوک نے دل گرفتہ انداز سے جواب دیا۔

"ارے تو اتنا دل برداشتہ' مایوس اور پریشان کیوں ہو رہا ہے؟ ہو جائے گا.... ہو جائے گا۔" مہندر ناتھ نے دلاسا دیا۔ "میں نے کارڈ کے پیچھے ایجنٹ کا نام تجھے دینے کے لیے لکھ رکھا تھا۔ اچھا مانوس ہے۔ پیسا لیتا ہے تو کام ضرور کرتا ہے۔ جیسے ہی پیسوں کا انتظام ہو جائے اس سے مل لینا۔ وہ تجھے دھوکا نہیں دے گا۔ دبئی کہہ کر مکران کے ساحل پر نہیں اتارے گا۔ آگے میری ذمے داری۔"

"یار مہندر ناتھ.... !" اشوک نے **جھجکتے** ہوئے کہا۔ "کیا تو کچھ انتظام نہیں کر سکتا....؟ آؤں گا تو میں تیرے ہی پاس.... میری آمدنی تو تیرے ہاتھ میں.... تو اپنا قرض وصول کر لینا.... پھر میں جلد ہی چل پڑوں گا۔"

مہندر ناتھ نے بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اگر اس بات کی ضمانت ہوتی کہ تو ضرور دبئی آئے گا تب بھی میں انکار ہی کرتا۔ تو نے دیکھا نہیں.... ہر جگہ لکھا ہوتا ہے۔ تو نے دیکھا ہوا ہو گا.... ادھار محبت کی قینچی ہے.... یہ کام مشکل ضرور ہے۔ ناممکن نہیں ہے.... کوشش جاری رکھو۔ صرف غور نہ کرنا.... جس طرح تجھ پر لڑکیاں اور عورتیں مہربان ہوتی آئی ہیں اس طرح قسمت کی دیوی بھی مہربان ہو جائے گی۔"

دوست کی ساری باتیں کتابی تھیں۔ بھائی نے اپنے طریقے سے انکار کیا تھا.... دوست نے اپنے طریقے سے.... اشوک نے خود کو بہت اکیلا اور بے سہارا محسوس کیا لیکن اس کے باوجود ابھی وہ مایوس نہیں ہوا تھا اور اس نے غور کرنا جاری رکھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس پر ہنستے رہے.... اس پر آواز اور فقرے بھی کستے گئے۔ ارے واہ ہمارا دلیپ کمار دبئی جا رہا ہے۔ مدھوبالا سے شادی کرنے.... وہ ان سے کہنا چاہتا کہ مدھوبالا اب اس سنسار میں نہیں رہی۔

ان میں دو لڑکے ایسے تھے جو اس پر خوب طنز کرتے اور سرِ راہ مذاق اڑاتے.... ان کی نوجوان بہنیں تھیں۔ اشوک نے یہ کیا کہ ان سے بدلہ اس طرح لیا کہ ان کی بہنوں سے پریم کر کے خوب دل بہلایا۔ وہ سانولی تھیں اس لیے اس کے فریب میں آ گئی تھیں۔

پھر اس وقت جب دبئی کا خیال چھوڑ کے وہ باپ کے کاروبار کو سنبھالنے اور جدید خطوط پر ترقی دینے کے امکانات پر غور کرنے لگا تھا اور ایشور نے وقت کی بساط پر ایک نئی چال سے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔

ماں اس کے لیے مندر سے پنڈت جی سے ایک گنڈا لائی تھی جو اس نے بڑی ہوشیاری سے شربت میں گھول کر اشوک کو پلا دیا۔ وہ مندر پر بھکاریوں کی سیوا کر چکی تھی۔ پھر اس نے اپنے پتی کو صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا۔ چناں چہ اشوک پر اب کوئی کسی قسم کا دباؤ نہ تھا اور نہ ہی کام کے لیے اور نہ ہی شادی کے لیے.... ویسے ماں کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اشوک نے کتنی غیر قانونی سہاگ راتیں منائی ہوئی ہیں۔ کتنی لڑکیوں اور عورتوں کو آلودہ کیا تھا جو بڑی شرمناک بات تھی لیکن اس میں اس کا دوش اس لیے نہیں تھا کہ وہ دل اور نوجوانی کے ہاتھوں مجبور تھیں۔

ایک صبح وہ ناشتا کر رہا تھا پر کاش آنند نے خلاف توقع بڑی پدرانہ شفقت سے اسے مخاطب کیا تو وہ حیران رہ گیا۔

”بیٹے اشوک کمار.... اگر تمہیں کوئی کام نہیں ہے تو کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے....؟“

”کہاں جانا ہے پتا جی....!“ اس نے بھی اپنے لہجے میں جہاں بھر کی مٹھاس بھر کے پوچھا۔ ”ضرور چلوں گا۔“

”اپنے چودھری صاحب نے بلایا ہے اور کہا ہے کہ نئے ڈیزائن لے کر آؤ۔ ان کے اور ہمارے کاروباری تعلقات تمہارے دادا کے زمانے سے ہیں۔ چودھری صاحب سے پہلے ان کے آں جہانی پتا جی بڑے قدرداں تھے۔ بڑی عزت اور تعظیم دیتے تھے۔ خاندان میں منگنی ہو.... شادی بیاہ ہو.... وہ لڑکی کی ہو یا لڑکے کی.... ان کے زیورات صرف ہم نے ہی بنائے ہیں۔“

”اب کس کی شادی ہے؟“ اس نے سوالیہ نظریں پتا جی کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

”یہ تو وہاں جاکر ہی پتا چلے گا.... اچھا ہے کہ تم بھی ان سے مل لو۔ وہ تمہیں پوچھ رہے تھے۔“ یہ آخری جھوٹ بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے کہا تھا۔

چودھری سریش سوامی بہت بڑے زمین دار تھے۔ ان کے پتا جی نے صوبائی اسمبلی کی سیٹ بڑی اکثریت سے جیتی تھی۔ ان کے خلاف جو چار امیدوار تھے ان کی ضمانتیں بھی ضبط ہوگئی تھیں۔ اب یہ سیٹ سب سے بڑے بیٹے کے پاس تھی اور چار بھائیوں میں سریش سوامی، سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے باقی دو بھائی ایک شوگر مل کے مالک تھے۔ تاہم بھائیوں نے جائداد کی تقسیم کرلی اس کی وجہ ان کی بیویاں تھیں اور ان کے درمیان اثر رسوخ کی سرد جنگ نے بیگانگی پیدا کر دی تھی۔

چودھری سریش سوامی نے زمین داری کو خوب بڑھایا تھا۔ وہ برس کے برس باغات کے ٹھیکے دے کر لاکھوں کماتے تھے جوان کی اصل عزت تھی۔ ان کی وضع داری اور شرافت سے بھی تھی۔ ان کا سلوک ہر ایک سے محبت آمیز رہتا تھا۔

وہ حویلی کے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری کے ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وسیع باغ سے گزرے۔ ایک ملازمہ نے انہیں قدیم طرز سے آراستہ بیٹھک میں اپنی رہنمائی میں لے جاکر پہنچادیا۔ اشوک نے اس کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ وہ بڑا مرعوب اور متاثر بھی ہوا اور بڑی سنجیدگی سے یہ غور کرتا رہا کہ کیا وہ اپنی زندگی میں کبھی ایسی پر شکوہ حویلی کا مالک بن سکے گا؟

چودھری صاحب اپنی بھاری بھرکم پتنی کے ساتھ نمودار ہوئے تو پرکاش آنند کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے تعارف کرانے پر اشوک سے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر ان کے لیے ملائی سے بھری لسی بھی لائی گئی جس کی تہہ بہت موٹی تھی۔

چودھری صاحب نے بتایا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں سعودی عرب گئے تھے تو کچھ سونا خرید لائے تھے۔ وہاں کا مہروالا بسکٹ خالص سونے کا ہوتا ہے۔ اس میں رتی برابر بھی کھوٹ نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو گے؟

پرکاش آنند نے ان کی بات سن کر تائیدی لہجے میں کہا۔

”سرکار.... مکے مدینے کے سونے کا کیا مقابلہ.... اس کی بات ہی اور ہے؟“

”اب ہمارا خیال ہے کہ آنے والی شادی کی تیاری کریں۔ اس لیے تمہیں بلایا ہے۔“ چودھری صاحب نے کہا۔

”اگر نئے اور جدید ترین ڈیزائن ہیں تو دکھاؤ؟“ چودھرائن نے نخوت سے کہا۔

پرکاش آنند نے یہ دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ شادی بیٹے کی ہے یا بیٹی کی ہوگی۔ ان دونوں کے بچے اس عمر کو پہنچ گئے تھے کہ وہ جس کی چاہیں شادی کر دیں اور ایک زرگر کو فضول سوالات سے گریز کرتے صرف زرگری کرنا چاہیے۔

پرکاش آنند کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی تھی لیکن کسی مصروفیت کے باعث چودھری صاحب نے اسے ایک ہفتے کی تاخیر سے طلب کیا۔ پرکاش آنند نے اس

مہلت کو غنیمت جانا اور جب بیوی نے اجمیر شریف حضرت غوث اعظم کے مزار پر چادر چڑھانے بھیجا تھا اور دیگ تقسیم کرنے تو وہ دہلی کے صرافوں سے کچھ نئے ڈیزائن مانگ لایا تھا۔ وہاں باہر کے جدید ترین ڈیزائن آجاتے تھے تو پرانے ہو جانے والے ڈیزائن ان کے ملازم چھوٹے شہروں کے صرافوں کو اچھی قیمت پر کاپی کر کے دے دیتے تھے۔

پرکاش آنند اپنے ساتھ جو ڈیزائن لایا تھا چودھرائن کے سامنے پھیلا دیا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ گھر کے اندر سے چودھرائن کی چھوٹی بہن جو کچھ دنوں سے ٹھہری ہوئی تھی اسے بھی مشاورت میں شامل کر لیا گیا جو کہ خود کسی ڈیزائن سے کم نہیں تھی۔ اس کی عمر چالیس برس سے کم نہیں تھی لیکن وہ پرشباب گداز بدن کی تھی۔ دراز قد تھی جس سے اس کے بدن کے نشیب و فراز اور خزانے نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے جو مختصر سا بلاؤز پہن رکھا اس قدر نیچی تراش کا تھا کہ اس کے کھلے گریبان کا نظارہ ہیجان خیز تھا کہ اشوک کے سارے بدن پر سنسنی دوڑ گئی۔ خربوزے جیسے دھڑک رہے تھے۔ بھرے بھرے رسیلے بدن کے حصول کا ارمان اسے تڑپانے لگا۔ اشوک بہتی گنگا میں جو ہاتھ دھوتا رہا تھا اس کا یہ تجربہ تھا جو لڑکی دوشیزہ سے عورت بنتی ہے اس میں وہ بات نہیں ہوتی ہے جو ایک تیس برس کی عورت سے لے کر چالیس برس کی عمر کی عورت میں ہوتی ہے۔ اس کی خود سپردگی' والہانہ پن اور وارفتگی اور گداز جو سرشار کرتی اور اس میں جو نشہ ہوتا ہے کلیوں میں نہیں ہوتا ہے۔ وہ بار بار غیر محسوس انداز سے اپنا پلو شانے اور سینے سے گرا دیتی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ لحاتی تنہائی کے لیے بسمل ہو رہا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ گریبان میں بلا خوف و خطر ہاتھ ڈال کر اور طوفان بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ بوسوں سے چہرہ اور نشیب و فراز گوشوں سے سرفراز ہو جائے گا۔

اس عورت کا نام رکمنی تھا۔ اس نے یکایک اشوک سے پوچھا۔

''کیا تم مصوری سے دلچسپی رکھتے ہو؟ میں نے کچھ تصویریں بنائی ہیں کیا تم دیکھنا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں۔۔۔؟'' اشوک اس کی بات سن کر اس طرح سے خوش ہو گیا جیسے اندھے کو بینائی مل گئی ہو۔۔۔ وہ سمجھ گیا کہ اس دعوت کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ اس کا جسم ہی نہیں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں مستی بھری تھی پیاسی ہو رہی ہیں۔۔ وہ بچہ نہیں تھا۔ عورت کو خوب سمجھتا تھا۔

پھر وہ عورت جو دس برس سے مطلقہ تھی اسے ایک کمرے کے اندر لے گئی۔ بستر کے نیچے سے اس نے ایک سوٹ کیس نکالا اور اس کا قفل کھولتے ہوئے بولی۔ ''میری مصوری کو نہ تو دیدی پسند کرتی ہیں اور نہ ہی چچاجی۔ اس لیے سوٹ کیس میں رکھا ہوا ہے۔ تم ذرا دروازہ بند کر دو۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اندر آجائے۔''

تھوڑی دیر بعد اس نے سوٹ کیس میں سے دس تصویریں نکالیں۔ ان میں تین چار تصویروں کے سوا باقی میں لڑکیاں عورتیں مردوں کے ساتھ مختلف زاویوں سے باہم پیوست تھیں۔ جب وہ ان تصویروں کو دیکھ کر مڑا تو وہ بے لباس کھڑی تھی۔

اس عورت نے بڑے جذباتی اور جنونی انداز سے اسے سیر کیا۔ اشوک کو یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگا تھا۔

پھر وہ دونوں شباب کے نشے میں ڈوبے ہوئے آئے۔ پھر چند ڈیزائن فائنل ہوئے۔ پھر کھانا آگیا۔ پرکاش آنند بہت خوش تھے کہ ان کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ کھانے کے بعد چودھری صاحب پھر اپنی فیملی کے ساتھ نمودار ہوئے تو ان کے ساتھ ایک بیٹی بھی تھی۔

اشوک کمار کے ہوش و حواس پر تو جیسے کوئی بجلی سی آگری۔

وہ بنی بنائی جیتی جاگتی مدھوبالا تھی جو جیسے ایک پھر جنم لے کر اس کے سامنے آبیٹھی تھی مگر اس کا نام نشو تھا۔

وہ تو باپ نے اس کی محویت کو دیکھ لیا اور پیر سے

ٹھوکر مار کے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خبردار کر دیا ورنہ اس کا یوں نشو کو نظر جما کر گھورتا ایسی گستاخی بن جاتا جس کی پاداش میں آرڈر سے محروم کر کے اور بے عزت کر کے حویلی سے نکالے جاتے۔

صرف نشو تھی جس نے اشوک پر اپنے حسن کا جادو اثر دیکھ لیا تھا۔

پوری کوشش اور دل پر جبر کرنے کے باوجود اشوک خود کو بار بار نظر اٹھا کر نشو کو دیکھنے سے باز نہ رکھ سکا اور ہر بار اسے نشو کے گداز گلابی شیریں ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اور اس کی آنکھوں میں ان جانے سوال دیکھ کر اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی صحت مند اور دل کش فتنہ خیز شر تھی اور لباس میں سے اس کا شاداب جسم بول رہا تھا۔

اشوک نے نہ صرف فلم محل بلکہ مغل اعظم بھی دیکھ رکھی تھی جو مدھوبالا کی تھیں۔ نشو بھی جیسے مدھوبالا کی آتما تھی جو اس کے پیکر میں اچانک نمودار ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی اور اسی وقت مدھوبالا نے جنم لیا ہو۔

عورتوں کی ساری توجہ ڈیزائنوں کی طرف متوجہ تھی۔ چودھرائن کی بہن بھی اس لیے اشوک کو نہیں دیکھ رہی تھی کہ کہیں اس کی دیدی مشکوک نہ ہو جائے۔ چودھری صاحب کا وہاں موجود رہنا مجبوری تھا۔ انہوں نے اشوک سے پوچھا۔

”کیا تم بھی اپنے پتا جی کے ساتھ ہی کام کرتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا....؟“

اشوک چونک پڑا۔ وہ سمجھا کہ چودھری صاحب نے اس کی نظربازی پکڑلی ہو۔

”جی.... جی سرکار....!“ اس نے خود کو سنبھال کر مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

کچھ پڑھے لکھے بھی ہو....؟“ چودھری صاحب نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے دوسرا سوال بھی داغ دیا۔

اشوک کا اعتماد لوٹ آیا۔ چودھری صاحب کا لہجہ بڑا نرم تھا۔

”اشوک....! تم نے فرسٹ ڈویژن لی ہے۔ تمہاری انگریزی کیسی ہے؟“ اشوک کو اس سوال کا یقین نہ آیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

”سرکار! میرے امتیازی نمبر تھے.... اسی فیصد

”فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کر کے پورے قصبے میں فرسٹ آیا ہوں۔ آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ بی کام‘ بی اے‘ ایم اے یا بی ایڈ کروں؟“

”پھر کیوں نہیں کیا؟“ چودھری صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”جب اتنی صلاحیت موجود ہے۔“

اب پرکاش آنند نے فوری مداخلت سمجھی کہ کہیں اشوک دل کی بھڑاس نہ نکالے۔

”چودھری صاحب....! اصل بات اور وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارا خاندانی کام ہے۔ ایک نے نہیں کیا.... دوسرا تو کرے گا.... اب میں آپ کو ایک خاص ڈیزائن دکھاتا ہوں.... مجھے سابق مہاراجہ کشمیر گلاب سنگھ ڈوگرا کے خاندان صراف کے بیٹے نے دیا تھا۔ آج بھی ان کا جموں میں بڑا کاروبار ہے۔ یہ نایاب اور انمول اور شاندار ڈیزائن ہے۔“

پرکاش آنند کو ڈر اور اندیشہ تھا کہ کہیں بیٹا اپنے دبئی جانے کی خواہش کا ذکر کرنے نہ بیٹھ جائے۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی وہ سو فیصد جھوٹ پر مبنی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ اس کا عورتوں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس نے اپنے ڈیزائن بھی ایک ایک کر کے نکالے تھے جیسے ماہر کھلاڑی تاش میں ترپ کے پتے چلتا ہے۔ اسے آخر بڑا آرڈر بھی مل گیا۔ خوشی سے پرکاش آنند کا گلا خشک ہو گیا۔ پانی کا ایک گھونٹ لیے ہوئے پرکاش آنند نے چودھری صاحب کی بڑی بیٹی نشو کو باپ کے کان میں کچھ کہتے دیکھا۔ جب چودھری صاحب نے اشوک کی طرف دیکھا تو اس کے باپ کا دل ڈوبنے لگا کہ کہیں اس نے باپ سے اشوک کی گستاخ نگاہی کی شکایت کر دی ہے؟“ اگر ایسا ہوا تو آرڈر اور پیشگی رقم بھی ہاتھ سے گئی۔ پرکاش آنند کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔

مگر جب چودھری صاحب نے اشوک کو مخاطب کیا تو ان کا لہجہ سرزنش کا نہ تھا۔

دوسرے مضامین میں بھی۔"
چودھری صاحب نے اس کی بات سن کر اپنا سر ہلایا اور بولے۔
"پھر کچھ وقت ہمارے لیے نکالو.... ہماری بیٹی کو انگریزی مشکل لگتی ہے۔ اس برس نویں کا امتحان دے گی پرائیویٹ۔"
"سرکار جو حکم آپ کا...." اشوک نے پوری کوشش اور جبر کر کے نشو کی طرف نہیں دیکھا۔ دل پر جبر کی سل رکھنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ بڑا صبر آزما اور اذیت ناک.... لیکن وہ نشو کی مسکراہٹ کے اجالے کی روشنی کو کمرے میں پھیلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا۔ مگر پرکاش آنند کے لیے یہ پریشانی اور خوف کا لمحہ تھا جس نے اس کی ساری خوشی کو کسی عفریت کی طرح نگل لیا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جب اس کا بیٹا اس لڑکی کو پڑھائے گا تو کیا ہوگا؟ وہ اپنے بیٹے کی عادت اور فطرت کو سمجھتا تھا۔ اس کا چھوٹا بیٹا دیپک بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا ایک لڑکی کے چکر میں.... وہ جانتا تھا کہ اس سنسار میں کتنی غلاظت اور آلودگی ہے۔ کتنے پاپ جنم لیتے رہتے ہیں.... عورت کا بھروسا ہے اور نہ ہی مرد کا.... کیوں کہ جوانی دیوانی اور جنونی ہوتی ہے.... جب اس نے باپ کے دیہانت کے بعد دکان سنبھالی تو لڑکیاں عورتیں کسی کام کے لیے آتی تھیں۔ اجرت کے بدلے خود کو پیش کر دیتی تھیں۔ دوپہر کے سناٹے میں وہ دروازہ بند کر کے عقبی راستے سے بلا لیتے تھے۔ ایک چارپائی پر بستر تھا۔ وہ آلودہ ہوتی۔ انہوں نے ہر عمر کی لڑکیوں عورتوں اور دلہنوں سے خود کو سرفراز کیا.... جب ان کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو انہوں نے یہ کھیل بند کر دیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ اشوک کو ایک لڑکی کے ساتھ تالاب پر دیکھا تھا.... آج جب وہ واش روم جانے کے لیے ایک طرف بڑھ رہے تھے تو وہ اس کمرے کے سامنے سے گزرے تھے جس میں چودھرائن کی بہن ان کے بیٹے کو تصویریں دکھانے کے بہانے لے گئی۔ اس کمرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہو سکا یا ٹھیک سے بند نہیں کیا جا سکا تھا کہ اتنا کھلا رہ گیا کہ کمرے کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ان کا بیٹا اور چودھرائن کی بہن دنیا، مافیہا سے غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ جانوروں کی حالت میں تھے۔ وہ عورت ان کے بیٹے سے کھلونے کی طرح کھیل رہی تھی۔ اس کی ایسی جذباتی، جنونی اور ہیجانی کیفیت تھی کہ جیسے وہ برسوں کی پیاس ہو.... اس کی پیاس تھی جیسے بجھنے کا نام نہ لے رہی ہو۔ ظاہر تھا کہ ان کا بیٹا نوجوان اور ہر لحاظ سے طاقت ور تھا۔
وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ جب ان کا بیٹا اس لڑکی کو پڑھائے گا تو کیا ہوگا؟ اس کے خیالات کی بلند پروازی سے بھی واقف تھے اور انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اشوک جیسا نوجوان کسی نشو جیسی لڑکی کو پڑھائے گا یہاں.... استاد شاگرد کے رشتے کو عاشق معشوق کے رشتے میں بدلنے دیر نہیں لگتی کیوں حالات اور ماحول خود اس کے لیے سازگار ہوتے ہیں.... ہو سکتا تھا کہ نشو کے ساتھ اس کی ماں یا کوئی خادمہ بھی پہرے داری کے لیے موجود ہو لیکن محبت کے پیغامات کا تبادلہ نظروں ہی نظروں میں طے ہوتے ہیں۔ چوکی دار کتنے ہی چوکس کیوں نہ ہو۔ اور پھر محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ نشو کو کتنی دیر لگے گی اشوک کی جھولی میں ٹپکنے میں.... اس حویلی میں اتنے گوشے اور اتنے کمرے تھے کہ ان دونوں کو یک جائی میسر آسکتی تھی۔
جو بات ناگزیر تھی وہ اس عشق کی خوشبو پھیلنے کی تھی جسے سات پردوں میں بھی نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہو سکتا تھا؟ یہ بات صرف پرکاش آنند جانتے تھے.... اشوک نے سوچے سمجھے بغیر ہی ہاں کر دی تھی.... نہ صرف یہ کاروباری نقصان انہیں ختم کر دے گا بلکہ عین ممکن ہے اشوک کو چوری یا ڈکیتی جیسے جھوٹے الزام میں پولیس اتنا مارے کہ وہ معذور ہو جائے یا مارا جائے۔ کیوں کہ پولیس کے تشدد اور ایذا رسانی سے بچنا ناممکن ہوتا تھا۔ پرکاش آنند کے لیے آنند پور کی زمین تنگ ہو جائے.... چنانچہ انہوں نے صورت حال خراب ہونے کی نوبت آنے سے پہلے

سنبھال لیا۔ دور اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا۔
پھر انہوں نے نمسکار کے انداز میں ہاتھ جوڑ بڑی عاجزی سے کہا۔
"معاف کرنا... چودھری صاحب! آپ سے کچھ پوشیدہ نہیں ایک بیٹا پہلے ساتھ چھوڑ چکا ہے... یہ بھی پڑھنے پڑھانے کے چکر میں پڑھانے کے چکر میں پڑا تو میں بوڑھا آدمی اکیلا رہ جاؤں گا... بڑی مشکل سے تو اسے کام پر لگایا ہے۔"
پرکاش آنند کے احتجاج سے قبل ہی چودھری صاحب نے فیصلہ صادر فرمادیا۔
"ٹھیک ہے پرکاش آنند...! ہم کوئی اور انتظام کر لیں گے... تمہارے لیے ایک مددگار ہونا چاہیے ورنہ یہ کام وقت پر کیسے مکمل ہوگا؟" اس کمرے سے نکلے تو اشوک جو کسی خیال میں گم تھا ان سے چند قدم آگے نکل گیا۔ وہ اس کمرے کے سامنے سے گزرے جس کمرے میں اشوک اور چودھرائن کی بہن کیف نشاط میں جانوروں کی حالت میں تھے۔ اس کا دروازہ اس وقت بھی قدرے کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے چودھرائن کی بہن کو سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہر زاویے سے خود کو ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیتے دیکھا۔ اس کے تن پر دھجی تک نہ تھی۔ اس کے رسیلے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انہیں وہ کسی زہریلی ناگن کی طرح لگی تھی جس نے ان کے بیٹے کو ڈس لیا تھا اگر ان کا بیٹا چودھری صاحب کی بیٹی کو ٹیوشن پڑھانے آئے گا تو اسے ڈس لے گی۔ وہ پل بھر کے لیے اس کے دودھیا جسم اور اس کے نشیب و فراز میں کھوگئے۔ واقعی وہ جتنی حسین اس عمر میں بھی اتنی پرکشش بھی... بیٹا ان دونوں سے سرفراز ہوتا رہتا۔
واپس جاتے ہوئے پرکاش آنند اتنا بڑا کام ملنے پر بہت خوش تھا وہیں اس کا بیٹا اداس اور گم صم تھا جیسے وہ کوئی انتہائی قیمتی شے کھوچکا ہو۔ انہوں نے اس کا چہرہ بھانپ لیا اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے خیال سے کہا۔
"دیکھ اشوک...! قسمت کی دیوی کتنی مہربان ہے تجھ پر... تو میرے ساتھ گیا اور اتنا بڑا کام مل گیا۔ اس سے ہماری حالت بدل جائے گی۔ ہماری شہرت بھی ہو گی... اور ساٹھ ہزار کا کم سے کم فائدہ ہے۔ سال چھ مہینے میں ہم دکان بڑھالیں گے اور جوئیلر بن جائیں گے۔" اشوک جو تصورات کی دنیا میں غرق تھا بے دھیانی میں بولا۔
"یہ چودھری صاحب کی بیٹی ہے نا... بالکل مدھوبالا ہے۔ لگتا ہے کہ جڑواں ہے۔" پرکاش آنند دم بخود رہ گیا۔ بیٹا ابھی تک نشو کے تصور میں تھا اور اس قدر گم تھا کہ باپ کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ بیٹے کو کھویا کھویا سا دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ چودھرائن کی بہن کے تصور میں کھویا ہوا جس نے اپنی خود سردگی، فیاضی اور مہربانی اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ لیکن یہاں تو بات یہ تھی کہ نشو کا جادو اس پر چل گیا تھا۔ باپ نے عقل مندی یہ کی کہ کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔
"یہ مدھوبالا کون ہے آخر...؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "وہ کہاں رہتی ہے؟ تم اسے کیسے اور کیوں کر جانتے ہو؟" اشوک کو حیرت ہوئی کہ مدھوبالا ماضی میں اتنی مشہور تھی کہ آج بھی لوگ اس کے نام اور شہرت سے واقف تھے۔ اس نے جیب سے ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد کی جسے اس نے ایک لفافہ میں بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ تصویر کو باپ کی طرف بڑھایا۔
"پتا جی! یہ ہے مدھوبالا... آپ خود دیکھ لیں... کیا یہ نشو ہے یا نہیں! اس کی تصویر لگتی ہے نا؟"
باپ نے تصویر تو لے لی مگر بیٹے کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا وہ خود بھی دیکھ رہا تھا تصویر درحقیقت نشو کی ہے جسے وہ مدھوبالا بتا رہا ہے معلوم نہیں یہ تصویر بیٹے نے کیسے اور کہاں سے حاصل کرلی ؟
پھر اس نے بحث کرنے کے بجائے اس سے پوچھا۔ "یہ مدھوبالا رہتی ہے کہاں؟"
"اشوک باپ کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ پھر ہنسی ضبط کرکے اس نے جواب دیا۔
"اس کی تو قبر میں ہڈیاں گل بھی گئی ہوں گی۔ میں

نے اس کی فلم محل اپنے ایک دوست کے ساتھ دیکھی تھی.... پھر ترانہ جس میں دلیپ کمار کے ساتھ آئی تھی۔ بڑی مقبول اور زبردست جوڑی تھی۔ لیکن یہ تصویر فلم محل کی ہے۔“

پرکاش آنند کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ قریبی شہر کے اسکول میں بیٹے نے پڑھا تھا وہ خود کئی بار گیا بھی تھا۔ قصبے سے آگے جمشید پور تھا جہاں بہت سارے سینما ہال تھے۔ وہ جاتا تو نہ تو کوئی فلم دیکھتا تھا اور نہ ہی کسی پوسٹر کی طرف دھیان دیتا تھا اور نہ ہی اپنے کسی دوست یا رشتہ دار یا گاھک سے فلم کے موضوع پر بات کرتا تھا۔ اس نے بلا تبصرہ تصویر واپس کردی۔

”آپ نے مجھے چودھری صاحب کی بیٹی کو پڑھانے سے کیوں روک دیا تھا؟“ اشوک نے گھر پہنچ کر سوال کیا۔

”نہیں روکا تو نہیں تھا.... اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔“ باپ نے کسی سیاسی مدبر کی طرح وضاحتی بیان جاری کیا۔ ”باقی چودھری صاحب کی مرضی۔“

”میں ٹیوشن پڑھاوٴں گا ان کی بیٹی کو.... اور آپ کے ساتھ کام بھی کروں گا۔ پھر تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا پتا جی! کیوں؟“ پرکاش آنند نے خاموشی اختیار کی۔ ان کے ذہن میں خطرات کے گہرے سیاہ بادل اُمڈ آئے.... ایک طرف چودھرائن کی پرشباب گداز اجلی بدن کی بہن جس کے جسمانی نشیب و فراز میں رسیلا پن تھا کسی پکے پھل کی طرح جس کی مٹھاس اور لذت مرد کو دیوانہ بنا دے۔ ایسی عورت جانتی تھی کہ مرد کو کس طرح خوش کیا جاتا ہے اور اس کی کمزوریاں کیا ہوتی ہیں اور پھر ان کا بیٹا جوان تھا۔ اسے اپنے طلسم میں جکڑ لینا مشکل نہ تھا۔ انہوں نے ان دونوں کو غلاظت کے دلدل میں دیکھ کر ہی محسوس کرلیا تھا کہ اس حسین ناگن نے ان کے بیٹے کو ڈس کر اس کی رگ رگ میں زہر سرایت کردیا ہے۔

دوسری طرف چودھری صاحب کی بیٹی گو کہ مدھوبالا کی ہم شکل تھی لیکن اس کا ابلتا شباب بھی مردوں کو گھائل کردینے والا تھا۔ وہ دونوں بہک سکتے تھے۔ گویا اشوک دو دھاری تلوار بن کر ان کے خزانے لوٹتا رہے گا.... وہ دور اندیش تھے۔ جہاں دیدہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ انہوں نے دماغی حکمت عملی اختیار کی اور ایک ایسی سیاست چلی کہ صورت حال کو خراب ہونے سے بچا لیا۔ سانپ بھی مرگیا لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ اگلے دن اشوک نے چودھری صاحب کو اپنی مرضی سے آگاہ کر دیا کہ وہ ان کی بیٹی کو انگریزی پڑھائے گا لیکن اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب شام کو چودھری صاحب کا منشی یہ جواب لایا کہ نشو کے لیے ایک استانی کا بندوبست کرلیا گیا ہے جو ہر روز شہر سے چودھری صاحب کی موٹر میں آئے گی اور جائے گی۔ دبئی کا بھوت ابھی تک اشوک کے سر سے اترا نہیں تھا اور نہ ہی نشو کا تصور.... جب وہ رات سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا تو نشو اس کے چشم تصور میں آکھڑی ہوتی اور اسے بے لباس کی حالت میں آغوش میں لے لیتا تھا۔ نشو کے تناسب اور فراز کسی قیامت سے کم نہیں تھا.... چہرہ اور اس کے نقوش اور رسیلے ہونٹ جو وہ اپنے لبوں پر محسوس کرتا تھا۔ چودھرائن کی بہن کا سر جیسے ماند پڑنے لگا تھا۔

اس نے مجبوری کی اور حالات کے باعث بہت غور کیا اور غور کرنے کے بعد اس پروگرام کو ملتوی کردیا.... اگر چودھری صاحب کے کام سے پچاس ہزار کا منافع ملتا ہے تو اس کا آدھا کام ہو جائے گا۔ پھر باقی پچاس ہزار بھی ہو ہی جائیں گے.... سو تولہ سونے کی قیمت کیا ہو گی؟ پرکاش آنند کا اعتبار قائم ہے.... اگر وہ اس میں صرف دس فیصد ملاوٹ کردے یا دس تولہ کم کردے.... چودھری صاحب کون سا وزن کریں گے یا کسوٹی پر سونے کو پرکھیں گے.... ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی ہو گا۔

بجلی کی طرح ذہن میں آنے والے اس خیال نے اشوک کے سارے جسم میں بجلی بھر دی۔

یہ ہو سکتا تھا.... یہ مشکل تو تھا لیکن ناممکن ہرگز نہیں تھا.... اشوک پرانے وقتوں کا آدمی تھا۔ اچھائی،

ایمان داری اور سچائی کے اصولوں پر قائم رہنے والا... بھگوان اور بھگوان کے ماننے والوں بندوں سے بھی ڈرنے والا... اسے سمجھانے اور قائل کرنے میں بڑی محنت کرنی ہوگی۔ وہ آسانی سے ماننے والا نہیں ہے۔ اس کے لیے کوئی مشکل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

عادت کے مطابق اس نے غور کیا اور بہت غور کیا۔ غور کرنا اس کا جاری ہی رہا۔ پھر ایک حکمت عملی کے ساتھ وہ باپ کا اچھا بیٹا بن گیا اور اس کا دل خوش کرنے والی باتیں بھی کرتا رہا تھا کہ وقت آنے پر اپنی بات منوا سکے۔ ادھر باپ کا دل خوش ہوتا رہا۔

اس نے مہیند رناتھ سے بھی فون پر بات کی اور کہا کہ جیسے ہی رقم کا بندوبست ہو جائے گا وہ دبئی پہنچ جائے گا۔ وہ اپنے سپنوں کی راج دھانی کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں اپنے باپ سے زیادہ ماں کو دبئی کے قصے بڑی مبالغہ آمیزی سے سناتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے رنگین سپنوں کے جال بنتا رہا جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا رنگین اور سہانے سپنے دیکھنا عورتوں کی بڑی کم زوری ہوتی ہے۔ کس طرح سے ماں کی ممتا میں شدت پیدا کی جاسکتی ہے اور ایکسپلائٹ کیا جاسکتا ہے۔

ماں بدستور اس کا گھر بسانے کی فکر میں رہتی تھی۔ اس نے مزید لڑکیاں دیکھی تھیں جو ایک سے ایک بڑھ کر تھیں لیکن ان میں دو ایک کو وہ شکار کر کے لڑکی سے عورت بنا چکا تھا۔ وہ لڑکیوں کو سبز باغ دکھاتا تھا۔ لڑکیاں بہک جاتی تھیں۔

ماں کو قابو میں کرنے کے لیے اس نے ترپ کے پتے کے طور پر اپنی مشروط رضامندی کا اظہار کر دیا۔

"تو مجھے صرف ایک برس کی مہلت دے دے تیرا بہو کا ارمان پورا کر دوں گا۔"

"ایک برس بعد؟ میرے لیے تو ایک ایک دن ایک برس سے کم نہیں؟"

"ایک برس کا عرصہ میں دبئی میں لگانا چاہتا ہوں۔ اس ایک برس میں نہ صرف ہماری حویلی ہوگی بلکہ ایک نئی لمبی سی کار جو کسی کے پاس نہ ہوگی۔"

"میں جانتی ہوں کہ ایک برس کے بعد ... مجھے چکر دے رہا ہے... میں کوئی بچی نہیں ہوں ... جانتی سمجھتی ہوں کہ تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔" اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ ماں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر جذباتی لہجے میں کہنے لگا۔

"میں تیرے سر کی سوگند کھا کر کہتا ہوں... اگر تجھے میری بات پر بسواس نہیں ہو رہا ہے تو میں رامائن بھی اٹھا سکتا ہوں۔ میں ہر صورت میں واپس آؤں گا ایک برس کے بعد... جہاں تو کہے گی شادی کر لوں گا۔ میں اپنی ماں کو کیسے ناراض کر سکتا ہوں تو میرے لیے سورگ ہے۔"

مائیں بہت بھولی اور اعتبار کرنے والی ہوتی ہیں۔ دنیا جھوٹی ہو یا دھوکے باز... ان کا بیٹا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جذباتی انداز کے مکالمے ان کی مزاحمت کو ایسے ختم کر دیتے ہیں جیسے دھوپ میں برف... اشوک کی ماں بے وقوف بھی تھی اور نہ ہی اس کے پاس تعلیم تھی اور نہ ہی اس نے آنند پور سے آگے کی دنیا دیکھی تھی۔ وہ ایک بیٹا گنوا چکی تھی۔ دوسرے پر بسواس کیسے نہ کرتی... اس نے کہا کہ وہ اپنے پتی سے بات کرے گی۔

پرکاش آنند اگر ایمان داری کے قلعے کی فصیل تھا اس کی پتنی اس کے داخلے کا راستہ تھی۔ اشوک نے یہ دروازہ کھول لیا تھا۔



پرکاش آنند کسی کسی دن دوپہر کے وقت گھر چلا جاتا تھا۔ کھانا کھانے اور کمر سیدھی کرنے اور سہ پہر کے بعد لوٹتا تھا۔ اس دوران دوپہر کے وقت سناٹا سا ہو جاتا اشوک کام میں جتا رہتا۔ کوئی نہ کوئی عورت کسی کام سے آتی اور اشوک کی فطرت بھانپ لیتی تھی۔ وہ اجرت دینے میں لیت و لعل کرتی اور مہربان ہوتی تو اشوک پس و پیش نہ کرتا۔ وہ دکان کا شٹر گرا دیتا اور دکان کے عقب میں اس عورت کو شکار کر لیتا۔ وہ شادی شدہ عورتوں سے اس لیے بھی دل بہلاتا تھا کہ سیاہ کاری کا

کوئی نتیجہ رونما اور برآمد نہ ہوتا اور پھر وہ جس فیاضی اور خودسپردگی سے مہربان ہوتی تھیں اس پر نشہ طاری کردیتی تھیں۔

اشوک نہر کے پل پر اکیلا کھڑا تھا اور نیچے سے بہنے والے چائے کے رنگ کے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ غوطے مار کر سکے نکالنے والے بچے تھے اور نہ ہی ان کی ماں اور بہن..... کیوں کہ دو دن جو موسلا دھار بارش ہوئی تھی اس نے سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔ پل پر سے سائیکلوں کے علاوہ اکا دکا موٹر سائیکل بھی گزر جاتی.... ایک بس ہندوپور سے آئی تو وہ جنگلے سے لگ گیا۔ وہ یہاں اس لیے آیا تھا کہ ماں اور بیٹی میں سے کوئی بھی آجائے۔ کیوں کہ اس شدید سردی میں عورت کی طلب ستانے لگی تھی اور اس موسم میں اس کا جسمانی قرب دو آتشہ بن جاتا تھا۔ جسم کا لمس کیف و سرور میں ایسی شدت اور جسم میں ایسی حرارت پیدا کر دیتا تھا کہ خون کی حدت بڑھ جاتی تھی۔ نشیب و فراز بھٹی اور انگارے بن جاتے تھے۔ وہ ایک شیشی میں روغن زیتون اور ایک چھوٹی بوتل میں برانڈی لایا تھا۔ برانڈی پلانے اور اس کی اور روغن زیتون کی مالش سے سردی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ دو ایک مرتبہ ماں اور بیٹی سے وقت گزار چکا تھا۔ اس نے پانی میں سکے نہیں پھینکے تھے بلکہ کنج میں لے آیا تھا۔ ماں اور بیٹی دونوں ہی گرم جوش اور فیاض تھیں اور جانتی تھیں کہ مرد کو کس طرح خوش کیا جاتا ہے۔ وہ حویلی جا رہا تھا تو راستے میں خادمہ مل گئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ چودھرائن کی بہن اپنی ایک سہیلی کے ساتھ خریداری کے لیے شہر گئی ہوئی ہے۔ جب وہ کسی نہ کسی زیور کے بارے میں معلوم کرنے حویلی گیا تھا تو چودھرائن نہ تھی اور وہ اپنی ایک کھیلی کے ساتھ کسی کام سے شہر گئی ہوئی تھی۔ چودھرائن کی بہن نے اسے روک کر بڑی فیاضی اور مہربانی سے خوش کیا تھا۔ اسے اس عمر کی عورتیں بہت پسند تھیں۔ محلے میں جو سترہ برس کی عورت رکمنی تھی اس نے ایک مرتبہ ایسا خوش کیا تھا کہ اس بات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ ایک عجیب اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جس عورت کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس کے بدن میں ایسا گداز ہو جاتا ہے اور اتنا خوش کر دیتی ہے کہ ایک نوجوان لڑکی بھی سرشار نہیں کرپاتی تھی۔

اشوک کو اس بات پر غصہ آرہا تھا نہ تو اسے چودھرائن کی بہن ملی اور نہ ہی ماں بیٹی میں سے کوئی ادھر آنکلی تھی۔ اور پھر گوالن بھی یہ سب نجانے کہاں مرگئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ کملا کے ہاں چلا جائے جو سترہ برس کی ہے اور دل بہلانا خوب جانتی ہے۔

ایک اسکول وین گزشتہ ماہ آنندپور کی طرف آرہی تھی جس کی رفتار خطرناک حد تیز تھی اور ڈرائیور نشے میں تھا جس کے سبب اسکول بس بے قابو ہو کر نہر میں جا گری تھی اور اس میں سوار وہ تمام بچے ڈوب گئے جو گھر واپس جا رہے تھے۔ اچانک نسوانی آواز میں اپنا نام سن کر اشوک حیرت سے چونک پڑا۔

”ذرا ادھر بھی غور فرمائیں جناب کوی غوری صاحب! بڑی کرپا ہوگی۔“ یہ الفاظ ریشمی سیاہ برقع میں ملبوس ایک لڑکی نے کہے جو اس سے چند قدم دور کھڑی تھی۔

”آپ.... آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا؟“ اشوک ہڑبڑا کے بولا۔

”آپ کے سوا یہاں ہے کون....؟“ لڑکی نے اسے ڈانٹا۔ ”چلو.... آؤ۔“

وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح چل پڑا۔ پل پر ان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ لڑکی اس سے دس قدم آگے جا رہی تھی اور اشوک سحرزدہ سا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی عقل یہ سوچ کر خبط ہو رہی تھی کہ اتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کرنے والی لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ وہ ڈھلوان پر احتیاط سے چلتی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے گورے گورے مکھن جیسے پاؤں چپل سے عیاں تھے۔ اس لڑکی نے ایک بار بھی مڑ کے دیکھا نہیں کہ وہ آرہا ہے یا نہیں جسے اس نے اشارے سے حکم دیا تھا۔

پل کے نیچے آتے ہی اس نے اپنا نقاب الٹ دیا۔ یہاں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ نقاب الٹتے ہی ایسا لگا جیسے گھرے بادلوں کی اوٹ سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہو اور اشوک پر جیسے کوئی بجلی سی آگری ہو۔

وہ ہکا بکا اور حواس باختہ اور مفلوج کھڑا اپنی مدھوبالا کو دیکھتا رہا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔ وہ بت بنا کھڑا تھا۔

"اب کیا ایسے بت بنے کھڑے رہو گے....؟" لڑکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آپ.... آپ چودھری صاحب کی بیٹی ہیں نا.... نشو؟"

وہ اک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی اور آسمان سے جیسے بارش کے قطرے گھنگھرو بن کے برسنے لگے۔

"کیا اس بات میں کوئی شک و شبہ ہے؟ میں نشو ہی ہوں.... کوئی اور کیسے ہو سکتی ہوں؟" اشوک فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے جیسے صفائی پیش کی۔

"میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ آپ نشو ہیں.... آپ کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔" وہ اشوک کو دزدیدہ نظروں سے چند ساعتوں تک دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"اچھا.... یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے پڑھانے سے انکار کیوں کیا؟"

"میں نے تو پیغام بھیجا تھا کہ میں ٹیوشن پڑھانے آنا چاہتا ہوں۔ میں آنا چاہتا تھا لیکن آپ کے پتا جی نے منع کر دیا۔"

"انہوں نے خود کہا تھا تم سے.... میرے سامنے ہی میرے کہنے پر.... پھر وہ کیسے منع کر سکتے تھے؟"

"لیکن بعد میں نہ جانے کس بنا پر اپنے منشی سے کہلوا دیا کہ آپ کے لیے کسی استانی کا بندوبست کر لیا گیا ہے جو آپ کی گاڑی میں روز شہر سے آیا جایا کرے گی۔ پھر میں اس انکار پر کیسے آسکتا تھا۔" اشوک نے وضاحت کی۔ نشو اپنے گلابی گداز ہونٹ کاٹتی رہی اور پھر پوچھا۔

"کیا یہ بات منشی جی نے تم سے خود مل کر کہا تھا؟"

"جی نہیں.... میری ان سے کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی میں نے ان کی شکل دیکھی۔ انہوں نے یہ بات میرے پتا جی سے کہی تھی۔"

"میں سمجھ گئی...." نشو نے اپنا سر ہلایا۔ "خیر۔ اب تم چھوڑو ساری باتیں.... کل سے.... بلکہ آج شام سے آجاؤ۔" اشوک کا رواں رواں مسرت سے سرشار ہو گیا اور اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

"آپ صرف یہ بات کہنے آئی تھیں.... ڈر نہیں لگا آپ کو کہ کوئی دیکھ لے گا؟ یہ بات چودھری صاحب تک پہنچ جائے گی۔"

"کیا دیکھ لے گا؟ اور دیکھنے والا ہے کون....؟" وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بڑی دل کش تھی۔ "برقع میں مجھے پہچانے گا کون؟ میں نے تم سے ملاقات کے لیے اپنی ایک مسلم سہیلی سے عاریتاً برقع لیا ہوا ہے۔"

"ایک بات بالکل سچ اور صاف صاف کہوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گی....؟" اشوک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ایک نہیں دس باتیں کہو...." نشو کی مترنم ہنسی فضا میں سر کی طرح گونج گئی۔

"میں نے آج تک آپ سے زیادہ حسین لڑکی کہیں نہیں دیکھی؟ سپنوں میں بھی نہیں اور اور شاید ہو بھی نہیں سکتی؟" اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور آنکھوں میں دیے جل اٹھے۔ وہ مسکرا کے شوخی سے بولی۔

"اچھا جی.... روز کتنی لڑکیاں دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں.... آپ اور کتنی دنیا گھوم چکے ہیں؟"

"یہ میرا خیال ہے...." وہ ہکلایا "اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے کہ تم کسی مدھوبالا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" وہ معنی خیز انداز سے مسکرادی۔

اشوک نے جیب سے مدھوبالا کی تصویر نکالی اور بڑی بے باکی سے کہا۔

"جی ہاں.... اسی لیے آپ کی تصویر لیے پھرتا ہوں۔ یہ تصویر من کے فریم میں بھی نقش ہے۔"

نشو اس کی بات سن کر سرخ ہو گئی اور اس کے ہاتھ

سے تصویر لے لی۔ تصویر کو وہ غور سے چند لمحوں تک دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"یہ تو میری تصویر ہے تمہارے پاس کہاں سے آئی اور یہ کون مدھوبالا ہے، جو میری ہو بہو سی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کوئی ایکٹریس تھی؟"

"اس کا دیہانت ہوا بڑا عرصہ ہوا۔ لیکن کیا یہ آپ نہیں ہیں.... ؟ غور سے دیکھ کر بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں!" اشوک مسکرایا۔ نشو بھی دل کش انداز سے مسکرا دی لیکن اس مسکراہٹ نے اشوک سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو لفظوں کی زبان میں کہنا ممکن نہ تھا۔

"میں انتظار کروں گی شام کو.... دیکھو انتظار نہ کرانا ؟" وہ ہنس پڑی۔

وہ اس کے اتنے قریب کھڑی تھی کہ لباس اور برقع میں ملبوس ہونے کے باوجود اس کا قرب آتش فشاں بنا ہوا تھا اور نیم وا ہونٹوں سے تپش ابل رہی تھی۔ آنکھوں میں خود سپردگی، جوانی کی مستی اور جذبات کی فراوانی ایک ان جانی دعوت رہی تھی۔ پل اور نہر ویران اور سنسان تھے دور دور تک کسی بھی سمت آدم زاد تھا نہ ہی آدم زاد.... اس کے جی میں آیا کہ نشو کی نازک، چمکیلی اور سڈول کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر کے دبوچ لے۔ قابو میں کر کے بے بس کر دے.... لڑکی ہو یا عورت اسے بے بس کرنے کے لیے ہمت و جرات اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے لڑکیوں اور عورتوں کی طرف جب بھی پیش قدمی کی تعرض نہ ہوا اور انہوں نے پر ڈال دی تھی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر کنج میں لے جا کر اس کا برقع اور لباس اتار دے تو وہ مزاحمت نہیں کرے گی۔ مہربانی ہو جائے گی۔ فیاضی سے اپنا سب کچھ اسے سونپ دے گی۔ لیکن اسے خیال آیا کہ یہ چودھری کی بیٹی ہے۔ کوئی اور لڑکی اور عورت نہیں.... پھر خیال آیا کہ عورت 'عورت' ہوتی ہے۔ چاہے وہ مہارانی 'راج کماری یا کسی عام گھرانے کی ہو۔ پھر خیال آیا کہ ٹیوشن کے دوران تو دل کے ارمان نکالے جا سکتے ہیں؟ ایسی عجلت کیا؟

پھر اس سے رہا نہیں گیا اور نہ باز آیا۔ جب اس نے چاروں سمتوں کسی کو نہ دیکھا تو اس نے نشو کے قریب ہو کر اس کی شاخ گل کمرے میں ہاتھ ڈال کر دبوچ لیا اور اس کے چہرے پر جھکتا چلا گیا۔ نشو بھی جیسے جذبات کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت اور تعرض نہیں کیا۔ پوری خود سپردگی گرم جوشی اور والہانہ پن سے اپنی بانہیں اشوک کے گلے میں حمائل کر دیے اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں باہم پیوست کر دیے۔ وہ دونوں تھوڑی دیر دنیا و فیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ اشوک اسے گود میں اٹھا کر کنج میں لے جانا چاہتا تھا اک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی۔

"اگر ہم دونوں کمرے میں ہوتے تو پھر تم حد سے تجاوز کر جاتے...." وہ شوخی سے بولی۔ "ماسٹر جی....! میں شام کا انتظار کروں گی۔"

"میں آپ سے زیادہ بے چینی سے شام کا انتظار کروں گا۔" پھر اس نے نشو کے ہونٹ اور چہرے کو چوم لیا۔

اشوک نشو کو قدم جما کر پل پر جاتا دیکھتا رہا۔ پل پر سے گزرنے والے ایک جوان سائیکل سوار نے اسے حیرانی یا شک سے دیکھا مگر سیدھا نکل گیا۔ نشو نے سکون و اطمینان سے پل عبور کیا اور ایک طرف کھڑی کار میں بیٹھ کے لوٹ گئی۔ اشوک کو علم نہ تھا کہ وہ اپنی کار خود ہی چلاتی ہے۔"

اگلے دس دن میں وہ سب ہو گیا جو اشوک کے لیے غیر متوقع اور سپنے کی طرح تھا۔ ناممکن تھا۔

اسے دنیا میں ہی ایک جیتی جاگتی مدھوبالا مل گئی تھی۔ وہ مدھوبالا جس کے لیے آج بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ حسین عورت نہ پردہ سیمیں تھی اور نہ کبھی بھی ہو گی وہ ایک اور جنم لے کر نشو کے روپ میں اشوک کے سامنے آ گئی وہ اس کے ہوش و حواس پر چھا گئی تھی۔ سچ مچ جیسے اسے مل گئی تھی۔ وہ پہلے دن اسے ٹیوشن پڑھانے گیا تو اتفاق سے دونوں کو میدان صاف مل گیا۔

چودھرائن اپنی بہن کو الوداع کہنے ایئرپورٹ گئی ہوئی تھی جہاں سے اس کی واپسی میں تین گھنٹے باقی

تھے۔ اشوک نے یہ سن کر سکون اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ کیوں کہ ان کے جو تعلقات استوار تھے وہ کبھی نشو کے علم میں آسکتے تھے۔ زمین دار صاحب کسی دوست کے ہاں شام کی پارٹی میں مدعو تھے۔ ملازمہ جو تھی وہ اپنی بیمار بہن کو دیکھنے اسپتال گئی ہوئی تھی۔ اب ان کے راستے میں کوئی دیوار تھی نہ رکاوٹ..... اس تنہائی یک جائی میں ان کے درمیان جو شیطان آیا تو ان کے تن پر کچھ نہیں رہا اور دونوں بے نیام تلواروں کی طرح فطری حالت میں حیوان بن گئے۔ نشو کی زندگی میں اشوک پہلا مرد تھا۔ اشوک نے پل کے نیچے جو اس کے ہونٹوں سے جذباتی انداز سے ساری مٹھاس چرائی اور اس کے ہاتھ جسم کے سراپا کے تناسب اور نشیب و فراز پر بھٹکے تھے اس کے جذبات میں آگ لگادی تھی۔ نشو کا خیال تھا کہ ہونٹ آپس میں مصافحہ کے انداز میں مل کر اسے سرشار کردیں گے۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ خود فریبی تھی۔

اشوک اس دشت سیاحی کا پرانا کھلاڑی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کلی کو پھول بنایا کس طرح جاتا ہے۔ شادی شدہ عورت بھی کیسے جھولی میں پکے پھل کی طرح گرتی ہے۔ نشو خود کو اور اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ طوفان آیا تو اس کی مثال ایک تنکے کی سی تھی..... اس طوفان نے نہ صرف اسے تہس نہس بلکہ تاخت و تاراج کردیا تھا۔ یہ وقت ایسا تھا انہیں کسی بات کا ڈر اور خوف نہ رہا تھا۔ دو مرتبہ طوفان آیا۔ نشو نڈھال اور بے حال پڑی تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ ایسا میٹھا اور لذت آگیں درد اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی دو ایک شادی شدہ سہیلیوں سے سنا تھا کہ سہاگ کی راتیں کیسی نشاط انگیز ہوتی ہیں۔ بہت کچھ کھونے کے بعد بہت کچھ لیا جاتا ہے۔

جب چودھرائین آئیں تو وہ دونوں کتابوں میں غرق تھے۔ نشو نہ صرف اپنے بستر کی چادر کی شکنیں اور اپنا حلیہ اور بال بھی درست کرلیے تھے۔ اس کے پھول جیسے رخساروں اور گردن اور سینے کے ابھار پر اشوک کے ہونٹوں کے نشان نہ تھے۔ انہیں ہوا تک نہیں لگی کہ ان کی بیٹی کلی سے پھول اور دوشیزہ سے عورت بن چکی ہے۔ ان دونوں نے سہاگ رات منالی ہے۔

چودھرائن کی بہن نہ جانے کیا پھونک اور اشارے کنایوں میں کہہ گئی تھی کہ ایک انتہائی کالی کلوٹی ملازمہ سبق کے دوران مسلط کردی گئی تھی۔ نشو نے اسے کالی چڑیل کا خطاب دیا تھا۔ لیکن وہ اس معیار کی تھی اور نہ ہی تھی۔ اس کے دانت لمبے اور نوکیلے نہ تھے اور نہ ہی ہاتھ پیر پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ وہ بیس اکیس برس کی تھی اور اس کی شادی اس کے باپ کی عمر کے مرد کی وجہ سے کردی گئی تھی بلکہ اس کے پتی نے اسے خریدا تھا لیکن وہ اس بے جوڑ شادی سے تشنہ نا آسودہ اور پیاسی رہتی تھی۔

وہ جتنی کالی تھی اتنی ہی پرکشش بھی تھی۔ اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ فربہی مائل تھی۔ اس کی کالی جلد میں رس اور بڑی جاذبیت تھی۔ وہ روغنی اور چاکلیٹ لگتی تھی۔ اس کے سراپا میں جو فراز تھے وہ متوجہ کرنے والے ہیجان خیز تھے..... اس کے چہرے کے نقوش تیکھے اور گال شاداب تھے۔ ہونٹ موٹے موٹے تھے لیکن بھدے نہ تھے بلکہ رس بھرے تھے۔

اشوک اس کالی خادمہ کو دیکھ کر کاپی پر لکھتا تھا۔ "تمہاری ماتا جی کو چڑیل کہاں سے دریافت ہوئی؟" نشو نے اس کے جواب میں یہ نوٹ لکھا تھا۔

"یہ کالی چڑیل ہندوپور میں رہتی تھی..... اس کا بوڑھا پتی اسے خرید اور بیاہ کرلایا ہے۔ اب تو مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"ہمیں اس کے رنگ و روپ اور بدصورتی سے کیا لینا ہے۔ بس بہت ہشیار رہنا ہے۔ یہ کالی ناگن کی طرح لگتی ہے؟"

دوسرے دن اس نے لکھنا چاہا کہ وہ رات بھر اس کالی ناگن کے تصور میں سو نہیں سکا۔ کس قدر سیکسی ہے۔ اس نے کیا جسم اور نشیب و فراز پائے ہیں..... میں تصور میں اسے بے نیام تلوار کی طرح دیکھتا رہا۔

وہ یہ الفاظ کیسے لکھ سکتا تھا۔ نشو ناراض ہو جاتی۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اس کالی ناگن پر مرمٹا تھا۔
ٹیوشن کے دوران سارے کام کاج چھوڑ کر کسی آسیب کی طرح مسلط رہتی تھی اور اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چوکتی تھی مگر وہ دلوں کی زبان میں ہونے والی گفتگو کیسے سن سکتی تھی.... نظروں کے پیغام کو کہاں سمجھ سکتی تھی جو پیار کے خفیہ کوڈ میں ہر لمحے دیے جا رہے تھے۔ ان محبت ناموں کو کیسے پڑھ سکتی تھی جو نوٹ کے صفحات میں لکھے جا رہے تھے۔
اشوک پاگل ہوگیا۔ اس کا پاگل ہو جانا فطری تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا پاگل ہو جاتا۔ محبت کرنے والے تو ویسے ہی پاگل ہوتے ہیں اسے ایک فارسی کا شعر یاد آتا جو اس نے پڑھا تھا۔ وہ ہندی میں ترجمہ تھا....

عشق اول درد دل معشوق پیدا ای شود

یعنی محبت پہلے محبوب کے دل میں جاگتی ہے۔
اشوک کے معاملے میں ایسا ہی ثابت اور وہ خود ایک محتاط آدمی تھا۔ وہ غور کرتا ہی رہ جاتا کہ اظہار عشق کرے تو کب اور کیسے کرے.... گو کہ اس روزان کے درمیان کوئی پردہ' حجاب اور فاصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کیف نشاط کے لمحات میں ایک دوسرے کے جسم سے آشنا ہو کر کھیل رہے تھے لیکن اظہار عشق نہیں ہوا تھا۔
اشوک چاہتا تھا کہ یہ کالی ناگن کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹے تو وہ نشو کو آغوش میں لے کر اظہار عشق کرتے ہوئے چوم لے۔ پھر ایک روز اس کے ذہن میں ایک تدبیر کوندا بن کر لپکی۔ کیوں نہ وہ اس کالی ناگن سے اظہار محبت کر کے تعلقات استوار کرلے۔ یہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے گی۔ اپنے پتی سے نالاں ہے۔ وہ اس کی ضرورت اور ارمان پورے کر دے تو اسے کسی بہانے حیلے سے ٹیوشن کے دوران کچھ دیر کے لیے دور رکھا جا سکتا ہے اور کسی کام سے بھیجا جا سکتا ہے تاکہ وہ اور نشو دل کے ارمان پورے کرلیں۔
یوں تو وہ نشو کو کنج میں بلا سکتا تھا لیکن وہ جگہ اس لیے مناسب نہیں تھی کہ بعض جوڑے آکر غلاظت کی دلدل میں گر جاتے تھے۔ نشو چوں کہ قصبے کے سب سے بڑی آدمی کے بیٹی تھی۔ اس پر رسوائی اور بدنامی کا بدنما داغ آنے سے اس کی شامت آسکتی تھی۔ حویلی ہی بہتر اور موزوں جگہ تھی۔ چودھرائن ٹیوشن کے دوران جھانکتی نہیں تھی۔ اس لیے کہ اس نے جو پہرہ دارنی بٹھا رکھی تھی۔
ایک روز جو وہ اپنے پتا جی کی دکان جا رہا تھا اس نے اس کالی ناگن کو دیکھا۔ اس کا نام مدھومتی تھا۔ وہ بازار سے سودا سلف لے کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ مدھومتی نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ غیر محسوس انداز سے اس کا تعاقب میں چل پڑا۔ اس کا جھونپڑا ندی کے قریب تھا جو گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے چابیاں نکالیں اور دروازے پر جو تالا لگا ہوا تھا اسے کھول کر اندر گھس گئی۔ گویا اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی اور اس خیال نے اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑا دی پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ شاید یہ پھل اس کی جھولی میں ٹپک پڑے۔ اس کی جیب میں چند سکے اور دس کا ایک نوٹ تھا جس سے شکار جال میں نہیں آسکتا تھا۔ اس کے لیے جو چارہ تھا وہ معقول ہونا چاہیے تھا۔ اس نے جلد بازی نہیں کی۔
اس نے معلوم کرلیا تھا کہ مدھومتی کا پتی کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ وہ ایک طرح سے ٹھیکے دار ہے۔ وہ رات دس بجے مدھومتی کے گھر کے عقبی حصے پر پہنچا جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے کی عقبی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ مدھومتی گہرے بھورے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ بلاؤز کی آستینیں لمبی لمبی اور کلائیوں تک تھیں اور گریبان کی جو نیچی تراش تھی وہ اس قدر کھلی ہوئی بھی نہ تھی کہ فراز کا ہیجان خیز عریاں ہو جائے۔ وہ عموماً "ایسا ہی بلاؤز پہنتی تھی۔ پیٹ اور ناف کے درمیان اتنا کھلا نہ ہوتا تھا کہ نظر آئے۔ گو کہ وہ پرکشش تو دکھائی دیتی تھی لیکن بے لباس سی نہیں لگتی تھی۔
اس لمحے مدھومتی نے ساڑی نکال کر ایک طرف

اال دی۔ اب وہ صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تھی۔
کمرے کا دروازہ کھلا تو اس کا بوڑھا پتی داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ اس نے مدھومتی سے کہا۔
اب تو یہ لباس اتار دے اور تمام بتیاں روشن کر دے تو جانتی ہے کہ جب بھی تیرے پاس آتا ہوں تو کیا چاہتا ہوں؟"

مدھومتی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کمرے میں سات آٹھ ٹیوب لائٹس تھیں جو اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر ان کے سوئچ آن کر دیے۔ ان کی تیز روشنی میں نہ صرف وہ بلکہ کمرے کی ہر چیز نہا گئی۔ مدھومتی نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ پھر اس نے بلاؤز، پیٹی کوٹ اور جامے اتار کر ایک طرف ڈال دیے۔ اب وہ روشنی میں فطری حالت میں کھڑی نہا رہی تھی۔

"ادھر آؤ میری کالی رانی....!" اس نے شراب کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کا گھونٹ لیا۔

اشوک نے اس کالی تلوار کو بے نیام دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ کالی چڑیل اندر سے کس قدر پرکشش ہے اور اس کے پرشباب بدن میں کیسا گداز ہے۔ اس کا سراپا اور نشیب و فراز نہ صرف روغنی، نمکین، جاذبیت سڈول دلکشی سے بھرپور تھے بلکہ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ ہر رنگ میں اپنا ایک منفرد حسن ہوتا ہے۔ لیکن اس کے کالے رنگت میں جو حسن تھا اس کے سامنے دودھیا رنگت میں بھی وہ دلکشی نہ تھی۔ نشو تو دودھیا رنگت کی تھی۔ وہ اسے بھی تو فطری حالت میں دیکھ چکا تھا لیکن اس کی رنگت جیسے ماند پڑ گئی تھی۔ مدھومتی کا انگ انگ بول رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد مدھومتی بستر پر دراز تھی۔ اس کا پتی جس کی عمر مدھومتی کے سامنے جیسے بیس برس بڑھ گئی تھی اور وہ اس کے دادا کی عمر کا لگ رہا تھا۔ مدھومتی کسی سولہ برس کی دوشیزہ سی لگی تھی۔ وہ گدھ بن کر مدھومتی پر ٹوٹ پڑا تھا اور مدھومتی نے جیسے خود کو کسی سرد لاش کی طرح اپنے پتی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے مدھومتی کے ہونٹوں، گردن اور فراز اور جسم کے انگ انگ سے کھیلا تھا۔ ایسی ایسی فحش اور بے ہودہ حرکتیں کی تھیں کہ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اسے لات مار کر بستر سے گرا دیتی۔ لیکن وہ برف کا تودہ ہی بنی رہی۔ اس میں کوئی حرکت، گرم جوشی اور جذبات پیدا نہ ہو سکے۔ وہ اپنے ارمان پورے نہ کر سکا۔ ایک لٹے ہوئے جواری کی طرح مدھومتی کے پاس دراز ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

اس کا شوہر مدھومتی کی پیاس نہ بجھا سکا۔ مدھومتی بے سدھ اور بے حس و حرکت بستر پر دراز ہی رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جیسے اپنے پتی کا مکروہ چہرہ دیکھنا نہ چاہتی ہو۔ اشوک بہت دیر تک کھڑا مدھومتی کے سحر میں کھویا رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مدھومتی کو ہر قیمت پر فتح کر کے ہی دم لے گا۔

آخر ایک روز نشو نے عشق کا اظہار جذباتی انداز میں لکھ کر کر ہی دیا۔

"میں تو دیکھتے ہی تم پر مر مٹی تھی۔ جذبات اور دل پر اختیار نہ رہا اپنا سب کچھ سونپ دیا.... تم دل میں کہتے ہو گے کہ کیسی بے شرم لڑکی ہے جو بہک گئی.... یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ.... پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ پیار کرنے والے ڈرتے کہاں ہیں؟"

"یہ تو مدھوبالا نے کہا تھا.... فلم مغل اعظم میں دلیپ کمار سے کہا تھا.... محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے.... تم نے اپنا سب کچھ سونپ کر محبت پر مہر ثبت کر دی تھی۔"

"اس کے باوجود ہم دونوں نے کیف نشاط کے لمحات میں اظہار عشق نہیں کیا بلکہ جذبات میں بہتے رہے.... بولو تو کیا کہتے ہو؟ محبت ہے؟"

"میں.... میں کیا کہوں.... میں تمہیں چاہتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں.... کیوں نہ ہم بیاہ کر لیں.... لیکن یہ کیا ممکن ہے؟"

"ممکن کیوں نہیں.... تم لڑکے اور میں لڑکی شادی کر کے ہی رہ سکتے ہیں۔"

”میرا مطلب تھا کہ اگر میں نے تمہارے پتا جی کو اپنا رشتہ بھیجا تو۔۔۔ کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟“

”کبھی نہیں۔۔۔ وہ جوتے ماریں گے تمہارے پتا جی کو کہ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی؟ شاید اس سے دس دگنے جوتے تمہیں پڑیں گے۔۔۔“ اشوک جانتا تھا کہ ایسا تو ہوگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”شادی کیسے ہوگی؟“

”بھئی شادی تو ہم کریں گے ہی۔۔۔ یہ تو حق حاصل کرنا ہی ہوگا؟“

”تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ ہم دونوں بھاگ کر سول میرج کرلیں گے؟“ اشوک نے بوکھلا کر کہا۔ ”مگر ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟“

”مجھے کیا معلوم۔۔۔ یہ تو لڑکوں کا مسئلہ ہے کہ وہ بیاہ کرتے ہیں تو اپنی بیویوں کو کہاں رکھتے ہیں اور کہاں لے جاکر سہاگ راتیں مناتے ہیں۔“

”اگر ہم دھرے گئے تو میری بلبل۔۔۔! پھر کیا ہوگا؟ سوچا تم نے۔۔۔؟“ اشوک نے ان جانے خدشے سے کہا۔

”واہ محبت میں مارے جائیں گے۔۔۔ چودھری صاحب مرڈر کردیں گے یا وہ اپنے ہاتھ اور دامن صاف رکھنے کے لیے کسی پیشہ ور قاتل سے رابطہ کریں گے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”محبت بھینٹ مانگتی ہے۔“

”تمہیں ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوتا کہ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا؟“ اشوک بولا۔

”موت سے کس کو ڈر نہیں لگتا۔۔۔ یاد کرو مدھوبالا نے کیا کہا تھا؟ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔۔۔ تم اتنا سوچتے کیوں نہیں ہو؟“

”ہاں۔۔۔ سوچنا اور غور کرنا ہے کروں گا۔“ وہ پست لہجے میں بولا۔ ”جلد بازی اچھی نہیں۔۔۔ تم مجھے کچھ وقت دو۔“

”کتنا وقت۔۔۔ اس شبھ کام میں آخر کتنا وقت درکار ہے میری جان۔۔۔!“

”کم سے کم ایک برس۔۔۔“ اشوک نے کہا ”اس دوران ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔“

”ایک برس تو کوئی بات نہیں۔۔۔ میں دو برس اس لیے کہ ابھی میں دسویں کی نویں کا امتحان۔۔۔ پھر دسویں کا۔ یہ بتاؤ کہ تم دو برس میں کیا کرو گے؟“

”میں دبئی جاکر دولت کماؤں گا۔ صرف ایک برس میں لوٹ کر آؤں گا تو اس شان سے کہ چودھری صاحب انکار نہ کرسکیں گے۔۔۔ اگر کرتے ہیں تو کردیں۔۔۔ میں دبئی تمہیں بھی لے جاؤں گا۔ ہم وہاں شان سے رہیں گے۔ ہمیں وہاں کوئی تلاش نہیں کرسکتا اور اگر کرلے تو بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔۔۔ دبئی ہندوستان نہیں کہ کوئی ہمیں نقصان پہنچائے۔“

”لیکن ایک برس میں کیا ہوگا؟ نوکری تلاش کرنے جانے کتنے مہینے لگیں گے؟“

”میری نوکری وہاں پکی ہے مجھے درہم ملیں گے سعودی عرب گیا تو ریال جو ہندوستانی کرنسی میں ایک لاکھ کے مساوی ہوں گے۔ ہر مہینے۔ بس میرے وہاں پہنچنے کی دیر ہے۔“

”ٹھیک ہے تم چلے جاؤ مگر تم جلد واپس آنے کی کوشش کروگے لیکن واپسی کی کیا ضمانت ہے؟“

”کیسے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ محبت میں بھی گارنٹی۔۔۔ بینک سے قرض لو تو بھی گارنٹی۔۔۔ کام میں بھی گارنٹی۔۔۔ میری جان! آخر اعتبار اور بسواس بھی تو کوئی چیز ہے؟ تم خود ذرا سوچو کہ میں تمہارے بغیر بھی جی سکتا ہوں اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرا انتظار کروگی؟ میری واپسی سے پہلے کسی سے شادی نہیں کرو گی؟“ اشوک کا قلم تیزی سے لکھتا گیا۔

”میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔ میری ایک رازدار سہیلی ہے میں تمہیں اس کا نام اس لیے نہیں بتاؤں گی کہ اس لیے کہ تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ وہ کہتی ہے کہ محبت میں اپنا سب کچھ سونپ دو تو پھر محبوب شادی نہیں کرے گا۔ اس کے اور دو ایک کزن کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اس کے محبوب نے جو اس سے جی بھر کے کھیلتا رہا تھا شادی کی بات آئی تو کہنے لگا میں تم سے اس لیے شادی نہیں کرسکتا کہ میری ماں اور بہنیں ایک لڑکی پسند کرچکی ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ مجھ

سے جی بھر کے کھیل چکا تھا۔ اس نے اپنی بھابھی کو اعتماد میں لیا تو اس نے مشورہ دیا کہ اپنے محبوب کو خط لکھو کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ خون ٹسٹ سے پتا چل جاتا ہے۔ میں یہ رپورٹ تمہارے گھر والوں کو دے دوں گی۔ وہ ڈر گیا اور اس نے ماں باپ کو راضی کر کے شادی کر لی۔ دیکھو محبت میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ لیکن شادی سے پہلے اپنا سب کچھ اپنے محبوب کو نہیں سونپنا۔ ورنہ پچھتاؤ گی اور آنسوؤں کا خزانہ رہ جائے گا۔ تم مجھ سے دو تین مرتبہ اپنی جسمانی پیاس بجھا چکے ہو۔۔۔ دوسری بات یہ کہ دو برس تک کوئی میری شادی کی بات نہیں کرے گا۔ مجھے تم پر بسواس ہے۔ جاؤ۔۔۔ یہ کالی چڑیل سامنے نہ ہوتی تو میں تمہاری گود میں بیٹھ کر اپنی بانہیں تمہارے گلے میں حمائل کر کے تمہیں خوب چومتی۔۔۔ تاکہ ہماری محبت میں اور شدت پیدا ہو جائے۔"

"دل تو میرا بھی کر رہا ہے ذرا صبر کرو اسے سامنے سے ہٹانے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں۔" وہ لکھنے لگا۔ "ایک مسئلہ اور ہے۔"

"پاسپورٹ اور ویزا کا؟ میں نے سنا ہے کہ ایجنٹ یہ کام پلک جھپکتے کر دیتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ وہ سب ہو جائے گا۔ تم چنتا نہ کرو۔" اس نے انگریزی میں کہا کتاب کے صفحے پر انگلی رکھ کر۔

اسے اپنی مدھوبالا کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی کہ اصل مسئلہ ایک لاکھ کی رقم کا ہے جو اس کے پاس اس کا دس فیصد بھی نہیں۔۔۔ اس کا باپ بھی نہیں دے گا۔۔۔ اگر وہ اصل بات بتا دیتا تو نشو کی نظروں میں اس کی ذرہ برابر اوقات نہیں رہتی۔ اگر وہ نشو سے کہتا کہ کسی نہ کسی طرح اس رقم کا بندوبست کر دے تو یہ اس نے بھی زیادہ شرمندگی اور ذلیل و خوار ہونے والی بات ہوتی۔ نشو نے فوراً ہی اپنی خادمہ سے کہا۔ "مدھومتی! اچھی سی کافی بنا کر لے آؤ۔۔۔ ماتا جی سے کہنا کہ وہ ہمارے ساتھ آ کر کافی پی لیں۔" مدھومتی جو ایک فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی وہ فوراً ہی اٹھی اور اندر رسوئی میں چلی گئی۔ نشو نے اس لمحے سے فائدہ اٹھایا۔ وہ دونوں ہم آغوش ہو کر جذباتی ہو گئے لیکن اشوک نے سوچا کہ کاش یہ کالی حسینہ نشو کی بجائے اس کے بازوؤں میں ہوتی۔۔۔ وہ نشو کو کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر بھیج بھی دیتا تو اسے اپنی آغوش میں لے کر چوم نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ ان کے درمیان دیوار حائل تھی۔ ان دونوں نے جی بھر کے ایک دوسرے کو چوم لیا۔ پھر نشو نے اس سے الگ ہو کر اپنے لباس اور بال درست کر کے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور قلم تھام کر کاپی پر جھک گئی۔ تھوڑی دیر میں مدھومتی ایک ٹرے میں تین کپ کافی لیتی آئی اور بولی۔

"میں نے سرکار رانی سے کہا تو وہ بولیں کہ میں باہر جا رہی ہوں۔ تم میری کافی پی لو۔"

رات کے نو بجے اشوک اپنے آپ کو مدھومتی کے ہاں جانے سے روک نہ سکا۔ اس وقت کمرے میں اس کا پتی اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں کارخانے جا رہا ہوں جہاں مجھے ایک ٹھیکہ ملا ہے۔۔۔ صبح گیارہ بجے تک آؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکلا تو مدھومتی اس کے پیچھے پیچھے صحن میں گئی۔ دروازہ بند کرنے لگی تو اس کے پتی نے اسے چوما اور باہر نکل گیا۔ مدھومتی اپنے کمرے میں آئی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور خود کلامی کرنے لگی۔

"یہ کمینہ روز ہی راتوں کو کام پر جایا کرے تو میں سکون، آرام اور اطمینان سے تو سو سکوں گی۔۔۔ سوئر۔۔۔ ذلیل۔۔۔ راتوں کو مجھے سونے نہیں دیتا ہے۔ میرے کپڑے اتار دیتا اور گدھ بن جاتا ہے۔ اسے حرامی نے شادی کیوں کی۔۔۔ جب وہ عورت کو خوش نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے کہ مجھے بچہ چاہیے۔ بچہ تو مجھے بھی چاہیے۔۔۔ اس میں جو کمزوری ہے اسے دور کرنے کے لیے کسی حکیم، وید جی اور ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا ہے۔۔۔ اس طرح میں شاید ہی ماں بن سکوں۔۔۔ لیکن کوئی

جوان مرد میرا سپنا تو پورا کر سکتا ہے؟"
پھر وہ مورنی کے انداز میں ناچنے لگی۔ پھر اس نے اپنا لباس اتار کر کرسی پر ڈال دیا۔ اس کے بدن پر دھجی تک نہ رہی۔ پھر وہ بستر پر دراز ہوگئی اور آنکھیں موند لیں.... اس کا چہرہ کسی ان جانے تصور سے دمک اٹھا۔ پھر وہ اس کالی ناگن کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں کے دریچے بند تھے۔ اس کی پلکیں بڑی گھنی تھیں۔ وہ چلمن لگ رہی تھیں۔ ناک ستواں تھی۔ نقش و نگار بھی سجل تھے۔ رخساروں پر بڑی شادابی اور تازگی تھی۔ ہونٹ پتلے پتلے اور رس بھرے تھے.... گردن صراحی دار تھی۔ سینے کے فراز بھرے بھرے اور ہیجان خیز تھے۔ چھریرا اور متناسب بدن تھا جو بستر پر بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ دعوت گناہ دے رہا تھا اور اس کی رگوں میں خون کی گردش اور حدت بڑھنے لگی۔
اس کے مکان کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی اور کمرے کا دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا۔ وہ چوروں کی طرح گھس آیا تھا اور اس کے سامنے کھڑا تھا تو اس نے مدھومتی کے کپڑے اور چادر ایک کونے میں ڈال دی اور وہ مدھومتی اور کپڑوں کے درمیان حائل تھا۔
وہ بستر کے پاس جا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا زیروبم قیامت خیز بنا رہا تھا۔
"مدھومتی....! مدھومتی....!" اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔
دوسرے لمحے اس نے آہستہ آہستہ اپنی پلکوں کی چلمن اوپر اٹھائی ساکت پلکوں سے دیکھا۔ اشوک کو دیکھتے ہی اچھل سی پڑی اور ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا اور اس کا چہرہ زرد سا ہوگیا۔ اشوک نے فوراً ہی اس کے شانے دونوں ہاتھوں سے دبائے اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔
پھر ایک طوفان آگیا کسی آندھی طرح.... مدھومتی اس کی زد میں آکر بے بس، تہس نہس اور تاخت و تاراج ہوتی رہی۔ جب طوفان گزر گیا تو وہ تھکن سے چور ہو کر نڈھال پڑ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا۔ وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے کسمسانے لگی۔
"مجھے کپڑے پہننے دو۔" وہ اسے خمار آلود نظروں سے دیکھنے لگی۔
"اب ہمارے درمیان کون سا پردہ ہے میری جان مدھومتی....!" وہ اس کے ریشمی سیاہ بالوں کو سہلاتے رخساروں اور ہونٹوں کو چومتے ہوئے بولا۔
"میں صبح کے اجالے تک رہوں گا.... تم یہ سمجھو کہ آج کی رات ہم دونوں کی سہاگ رات ہے۔"
مدھومتی اس سے کسی ناگن کی طرح لپٹ کر دیوانہ وار سرتاپا چومنے لگی۔ پھر شہد آگیں لہجے میں بولی۔
"چھوٹے صاحب! میں تو کالی کلوٹی ہوں.... دنیا مجھے کالی چڑیل کہتی ہے آپ مجھ پر مرمٹے اور مجھے لوٹ لیا۔"
"کوئی میری نظر سے دیکھے میری جان کو۔" اس نے بوسوں کی جوابی بوچھار کر دی یہ عورت عورت ہوتی ہے .... وہ کالی ہے، گوری ہے، سانولی ہے، گندمی رنگت کی.... بات رنگت کی نہیں ہوتی ہے سچ پوچھو تو تم میرے اور نشو کے سامنے بیٹھی رہتی ہو تو میں بتا نہیں سکتا کہہ نہیں سکتا.... میرا دل کرتا تھا جب نشو ٹیلی فون پر یا کسی سے بات کرنے یا کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے جاتی تو میرا دل کرتا تھا کہ تمہیں بازوؤں میں تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس اور گالوں کو چوم چوم لوں۔ لیکن اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں تم ناراض ہو کر میری شکایت کر دو....؟"
"یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ کا دل اس کالی چڑیل پر آگیا ہے؟ آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"
"نہیں .... میں اور میرا ایک ایک لفظ سچ بول رہا ہے۔ تم اپنے آپ کو کالی چڑیل نہیں کہو.... تم کالا جادو ہو جس نے مجھے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے.... تمہاری یہ بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھیں.... یہ پھولوں جیسے شاداب رخسار، رس بھرے ہونٹ، نقش و نگار .... یہ لامبے لامبے گھرے ریشمی سیاہ بال، یہ صراحی دار گردن، بھرے بھرے فراز کے ابھار.... یہ شاخ گل جیسی کمر، بھرے بھرے کولہے.... یہ عریاں گداز اور

مسحور کردینے والی یا نہیں.... تم بے نیاز دو دھاری تلوار ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا شاعری کرتا گیا۔ وحشی ہوتا گیا۔ مدھومتی پاگل ہو کر دیوانگی اور :نونی بن گئی۔ اتنی گرم جوش اور والہانہ بن گئی کہ کیف نشاط نے انہیں پاگل کردیا۔ اس نے کالی چڑیل کو فتح کر لیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ عورت جتنی کالی ہوتی ہے اتنی ہی گرم ہوتی ہے۔ یہ بات غلط نہ تھی۔ وہ صبح تک ٹھہرا رہا اور وہ تین طوفانوں کی زد میں رہے تھے۔



اس کے نشو کے درمیان معاملات آہستہ آہستہ بڑھے تھے۔ یہ ساری گفتگو خلاصہ جوان کے درمیان ہوتی نامہ' پیام کی صورت میں ہوتی تھی۔ وہ حد درجہ محتاط تھے۔ ٹیوشن پڑھتے پڑھاتے ہوئے ان کے لیے ادھر ادھر کی بات کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا تھا مدھومتی انہیں پلکیں جھپکائے بغیر گھورتی رہتی تھی.... اور وہ یہ بات کاپی میں لکھتے تھے ... اشوک کہتا.... اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو۔ ہندوستان روز بروز ترقی کررہا ہے۔ پھر وہ کاپی آگے بڑھا دیتا اور اس پر لکھا ہوتا.... کل رات تمہاری یاد نے سراپا اور حسن شباب کی کرشمہ سازیاں اتنا تڑپا دیا کہ وہ رات یاد آگئی جب تم نے مجھے اپنا سب کچھ سونپ دیا تھا۔ میں شباب سے بھرے خزانے دیکھنا چاہتا ہوں۔

نشو بھول جاتی کہ وہ ایک نوجوان گھریلو اور ہندوستانی لڑکی ہے۔ وہ کسی یورپی لڑکی کے انداز میں جواب لکھتی.... صبر سے کام لو.... وہ رات تو میں بھی نہیں بھولی جب تم نے مجھے دوشیزہ سے عورت بنایا۔ کلی سے پھول بنایا.... وہ رات پھر تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں کی ملاقات ایسی ہو کہ دل کے سارے ارمان پورے ہوجائیں اور کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔

اشوک نے مدھومتی کو فتح کرنے کے بعد دونوں سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ نشو کی کسی سہیلی کا فون آتا تو نشو بات کرنے چلی جاتی۔ وہ بڑی دیر تک بات کرتی رہتی۔ اس دوران وہ اور مدھومتی ہم آغوش ہو کر بہکتے ہوئے بہت دور چلے جاتے.... نشو جب اس سے چائے اور پکوڑے کے لیے کہتی تو ان دونوں کو اتنا وقت مل جاتا کہ خود سپردگی سے من مانیاں کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرجائیں۔ مدھومتی کے آنے سے قبل وہ لباس کی شکنیں' بال اور بلاؤز درست کرلیتی۔ وہ اس روز مدھومتی سے کہہ چکا تھا کہ نشو کو چومتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کیوں وہ چودھری کی بیٹی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی شکایت کردے۔ چودھری صاحب اس کی کھال نہ ادھیڑ دیں۔ مدھومتی نے اس کی بات کا اعتبار کرلیا تھا۔ نشو اکثر اپنی گاڑی لے کر خاندان کے لوگوں کے گھر چلی جاتی تھی یا پھر بازار شاپنگ کرنے کے لیے ... ایسا مہینے میں دو چار مرتبہ ہی ممکن تھا۔ اشوک سے اس رات سہاگ رات منانے کے بعد کوئی خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ وہ بہت محتاط تھی۔ اشوک سے باہر کہیں ملنے کو سختی سے ملنے کے لیے مسترد کردیتی تھی.... ان دونوں نے جو سہاگ رات منائی تھی نشو کے دل میں اس کے لیے بڑی تڑپ ہوتی تھی.... کیوں کہ یہ جوانی کے سنسنی خیز عشق کا ایڈونچر تھا۔ لیکن نشو نے جوش کو ہوش پر غالب آنے نہیں دیا۔ گو کہ ٹیوشن کے دوران وہ حد سے تجاوز کرتو جاتے تھے لیکن اس کا دورانیہ بہت کم اور سیراب کرنے والا نہ ہوتا تھا۔ نشو چاہتی تھی کہ کم از کم وہ ایک گھنٹے تو وہ جذبات کی ہیجانی کیفیت میں ڈوبے رہیں.... نشو' اشوک کے جذباتی طوفان کے آگے بھی عقل کا اسپیڈ بریکر قائم رکھا.... اس کی نظر مستقبل پر تھی۔ اشوک ہر لحاظ سے اس کے لیے آئیڈیل لائف پارٹنر ثابت ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں احساس بھی تھا کہ فیصلہ خود اس نے نہ کیا تو اس کا انجام کیا ہوگا۔



پرکاش آنند کی نظر سے اشوک کے رویے اور معمولات میں تبدیلی پوشیدہ کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ہر وقت گم صم رہتا تھا۔ اس کے غور کرنے کی عادت نے اسے غوری بنا دیا تھا۔ لیکن یہ معاملہ کچھ اور تھا۔

پرکاش آنند نے اکثر اسے رات کو چھت پر چکر لگاتے یا پھر صحن میں بیٹھے لیٹے دیکھا۔ وہ زبانِ عاشقی میں اختر شماری کرتا تھا۔ اسے کھانے پینے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ دکان پر اس کے ہونے سے نہ ہونا بہتر تھا۔ وہ بات کرو تو چونک پڑتا تھا یا پھر جھنجھلا جاتا.... اور یہ سب مدھو بالا کی ٹیوشن کے بعد شروع ہوا تھا۔ پرکاش آنند کو جس بات کا ڈر تھا وہ ہو چکی تھی۔ اس کا بیٹا چودھری صاحب کی بیٹی کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ باری پرکاش آنند کے ڈرنے کی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

بہت غور کرنے کے بعد اشوک نے اپنی پوری حکمت عملی تیار کرلی تھی کہ اسے کیا کب کرنا ہوگا اور کیسے اور کیوں کر؟

اس نے زندگی کو داؤ پر لگانے کا پورا ڈراما تیار کرلیا تھا۔ پہلے کی طرح اس نے پہلے کم زور فریق کا انتخاب کیا یعنی اپنی ماں سے بات کی۔ نشو کا حوالہ دیے بغیر اس نے اپنا مطالبہ ایک نوٹس کی صورت میں اس کے سامنے رکھ دیا۔

”مجھے ایک لاکھ کی رقم کا بندوبست کر کے دبئی جانے کے لیے۔

ماں نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔ ”میں نے کیا گاڑ کر رکھی ہے اتنی بڑی رقم جو تجھے نکال کر دوں....؟“

”میں کچھ نہیں جانتا.... تمہیں یہ کام پتا جی سے کہہ کر کرنا ہے؟“

”کیا پاگل ہوا ہے اشوک.... !کیا میں جانتی نہیں کہ اس کے پاس ایسی کوئی تجوری نہیں جس میں لاکھ روپے پڑے ہوں.... زندگی بھر وہ کیا کماتا اور خرچ کرتا رہا ہے.... پانچ سات ہزار کی ہوتی تو میں کر سکتی تھی۔“

”پانچ سات ہزار نہیں ماں! پورے ایک لاکھ کی بات کر رہا ہوں.... اگر تم نے کچھ نہ کیا تو....؟“

”تو کیا....؟“ ماں نے اس کی دھمکی کو نوٹ کر لیا۔ ”کیا کرے گا؟“

”دیکھ بعد میں رونا نہیں.... میں اپنی جان دے دوں گا یہ جو کنواں ہے نا ہمارے گھر کے پیچھے.... اس سے میری لاش نکال لینا....“

ماں بیٹے کی دھمکی آمیز بات سنتے ہی سراسیمہ اور خوف زدہ ہو گئی اور سنبھل کر بولی۔

”اشوک .... مت کرو ایسی بات ابھی تو نے کام شروع کیا ہے اپنے باپ کے ساتھ....“

”لعنت اس کام پر.... مجھے دبئی جانا ہے۔ پتا جی نے اپنی ساری عمر گنوا دی.... میں دو برس میں وہ سب کچھ کر دکھاؤں گا جس کا اس نے تجھ سے پہلے وعدہ کیا ہوگا.... سپنے دکھائے ہوں گے۔ ہر پتی اپنی پتنی کو بے وقوف بناتا رہتا ہے.... تو بات کر پتا جی کے ساتھ۔“

ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ بولی تو اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔

”ارے پاگل کچھ سوچ تیرا باپ کہاں سے لائے گا ایک لاکھ کی رقم؟ چوری کرے گا ڈاکہ ڈالے گا؟ کچھ سوچ۔“

”میں نے تمام پہلوؤں پر بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پتا جی کر سکتے ہیں اگر انہیں بیٹے کی زندگی عزیز ہو۔“

”تو پھر تو اپنے باپ کو کیوں نہیں بتاتا ہے.... میرا دماغ کیوں چاٹتا رہتا ہے؟“ وہ برہمی سے بولی۔

”دیکھ ماں.... وہ بہت شور کرے گا.... **چیخے گا**‘ چلائے گا اور آسمان سر پر اٹھا لے گا.... اس لیے میں تجھے بتاتا ہوں.... مگر تو اسے مذاق مت سمجھنا.... پتا جی نے میری بات نہ مانی ساری عمر روتا رہے گا اور پچھتائے گا۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

شور شرابا ماں نے بھی بہت کیا لیکن اشوک نے اپنی پوری بات کہہ دی۔ پھر وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ گھر میں بہت ہنگامہ ہوگا۔ باپ جتنا چیخ سکتا ہے چلانے دو.... وہ طوفان کی پہلی لہر گزارنے کے بعد بات کرے گا اور ایسا ہی ہوا.... لیکن اس کے باپ کے غیظ و غضب کی دوسری لہر بھی کم تباہ کن نہیں تھی۔

اس نے اشوک کو جی بھر کے بہت گالیاں دیں اور ڈانٹتا رہا۔

”تو مجھے چوری کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ میری یہاں جو ساکھ ہے اسے غارت کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنی

ساری زندگی کی عزت کی چتا جلا دوں۔" اشوک نے باپ کی گالیاں بڑے تحمل و ضبط سے سنیں اور بولا۔
"ٹھیک ہے پتا جی.... آپ میری عزت اور مستقبل کی چتا جلا دیں۔"
پھر ماں ہزیانی انداز سے چلائی اور اپنا سینہ دباتی ہوئی بولی۔
"ارے بیٹا! میرا چاند! تو کہاں جا رہا ہے؟ سن رک جا....."
"مجھے جانے دے ماں! اگر ایک باپ اپنے کی اتنی سی بات نہیں مان سکتا تو پھر روتا رہے گا بیٹے کی چتا پر.... سادھو می پر....."
ماں نے ایک چیخ ماری اور صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ اشوک کے لیے یہ غیر متوقع جذباتی سین نہیں تھا اور فلموں میں بھی دکھایا جاتا تھا اور ناولوں اور کہانیوں میں بھی ہوتا تھا۔ وہ ایک زندگی سے دل برداشتہ مرنے کے لیے نکل گیا۔ اس نے باپ کی آواز کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ کیوں کہ اسے ڈرامے کا دوسرا ایکٹ پیش کرنا تھا۔
ہوش میں آتے ہی ماں نے ادھر ادھر بیٹے کو دیکھا اور اسے نہ پا کر کہا۔
"بھگوان کے لیے اس پاگل کو روکو.... سچ مچ کہیں وہ کنوئیں میں نہ کود جائے میرا لعل.....!" پرکاش آنند سخت مشتعل تھا اور چٹان کی طرح دل کو سخت کیے ہوئے تھا۔
"کر دیتا ہے تو کر دیا جائے۔ اس کے کہنے سے میں اپنی عافیت خراب نہیں کروں گا۔ غضب بھگوان کا..... کیا زمانہ آگیا ہے۔ وہ اپنے باپ کو چوری کی ترغیب دے رہا ہے۔ ڈکیتی پر مجبور کر رہا ہے.... کل یہ بھی کہے گا کہ جو زیورات دکان پر بننے کے لیے آتے ہیں انہیں بیچ دو۔"
"تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو آخر وہ ہمارا بیٹا ہے جو منتوں مرادوں سے دنیا میں آیا ہے۔"
"بیٹا ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میری عزت اور ساکھ کی رسوائی کرے.... اتنا ہی دیوانہ ہو رہا ہے تو خود کیوں نہیں ڈاکا ڈالے.... بوڑھے باپ کو مجبور کیوں کرتا ہے۔ کیا اس کی خاطر جیل جاؤں اور .... ہی جائے۔ کیا اس نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے؟" وہ چلاتا رہا۔ ماں 'ماں' ہوتی ہے۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ خود ہی بیٹے کو تلاش کرنے نکلی۔ کنواں پیچھے کی دو گلیاں چھوڑ کے اس احاطے میں جو سادھو بابا کا باغ کہلاتا تھا۔
اس طرف مرد نہیں آتا تھا صرف لڑکیاں عورتیں آتی تھیں جو ڈول سے پانی نکال کر بے لباسی کی حالت میں آزادی اور سکون سے نہاتی تھیں۔ یہ جگہ کشور لعل کی تھی مگر اس کی اولاد نے باپ کی وصیت کے خلاف زبردستی قبضہ کر کے رکھا ہوا تھا۔
یہ جگہ صبح شام ہی غیر آباد رہتی تھی۔ اشوک کی ماں کو شکستہ چار دیواری کے اندر ہل چل نظر آئی۔ پھر ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس سے گزرا جو شاید لڑکیوں اور عورتوں کو آزادی سے نہاتے چھپ کر دیکھتا ہوگا اشوک کی ماں نے اسے روک کر پوچھا۔
"ارے بیٹا کیا ہوا؟ خیریت تو ہے....؟"
"کوئی آدمی کود گیا ہے.... شاید کوئی عورت لڑکی بھی ہو سکتی ہے سسرال کے ظلم سے تنگ آکر۔" اس نے گزرتے ہوئے جواب دیا۔
اشوک نے پورے حفاظتی انتظامات کے بعد بڑی احتیاط سے کنویں میں چھلانگ لگائی۔ کنویں کی چوڑائی زیادہ اور گہرائی کم تھی۔ اس کے باوجود اشوک نے خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس نے راستے میں ملنے والے تین چار افراد کو بتایا کہ اپنے ظالم باپ کی زیادتی کے باعث اس نے کنویں میں کود کر اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سب نے اسے روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی سنے بغیر سادھو بابا باغ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔
کنویں پر پہنچ کے بھی اشوک نے توقف کیا۔ وہ مدد کے لیے پہنچنے والوں کو تھوڑی سی مہلت دینا چاہتا تھا۔ رسی لے کر دوڑنے والا بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جن سے اشوک نے اپنے عزائم کا ذکر کیا تھا۔ صحیح وقت اشوک نے کنویں کے وسط میں اس طرح چھلانگ لگائی

کہ اس کا جسم تیزی سے نیچے جاتے ہوئے کنویں کی دیوار سے نہ ٹکرائے۔ وہ پانی میں گرا۔ کئی فٹ نیچے گیا اور پھر ابھرا۔ اس دوران بھی ایک آوارہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا کہ گرمیوں کے دنوں میں کسی لڑکی عورت کے ساتھ کنوئیں میں نہا سکتا ہے۔ کیوں کہ پانی زیادہ گہرا نہیں۔

جب اسے باہر نکالا گیا تو اس کی ماں سینہ کوبی کر رہی تھی اور چلا رہی تھی۔

”ہائے میرا لعل.... ماں صدقے میں بھی جان دے دوں گی اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

جو لوگ اشوک کو نکال رہے تھے انہوں نے اس کی ماں کو روکے رکھا اور اسے یقین دلاتے رہے اس کا بیٹا زندہ ہے۔ گھبراؤ نہیں.... اشوک کا سردی سے جسم اکڑ گیا تھا۔ گو وہ ہوش میں تھا مگر بے ہوش بنا رہا۔ کیوں کہ اس ناٹک کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس دیوانگی میں اس کی ماں دیوانگی کے عالم میں اس پر گر گئی تھی اور اس کا نام لے کر بار بار دکھ بھرے لہجے میں پکارتی رہی۔ لوگوں نے اسے ہٹا کر اشوک کے کپڑے تبدیل کیے اور اس پر کمبل اور لحاف ڈال دیے۔ جسم سے کہیں اکڑ کے سنسار سے نہ سدھار دے۔

کنویں میں چھلانگ لگانے سے قبل ایک بات کی سمجھ میں نہیں آئی اور اس سے پہلے بھی نہیں آئی تھی کہ عورت کے معاملے میں اس پر قسمت کی دیوی اتنی مہربان کیوں ہے؟ اس نے کتنی کلیوں کو پھول بنایا۔ دوشیزاؤں کو عورت بنا دیا.... نہ صرف شادی شدہ عورتیں بلکہ بچوں والی اور ہر عمر کی عورتیں بھی صرف اشارے کی دیر ہوتی تھی اس کی جھولی میں پکے آم کی طرح ٹپک پڑتی تھیں۔ کوئی بھی اس کے جذبات اور ہاتھوں سے آلودہ ہونے سے محفوظ نہ رہ سکی اور وہ راجہ اندر بنا رہا.... کیا اس لیے کہ وہ خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد ہے۔ لڑکیوں عورتوں کے سینے دھڑک اٹھتے ہیں.... لیکن قسمت کی دیوی ان کے بجائے دولت سے نوازتی تو کتنا اچھا تھا؟ رات کو بے سدھ پڑے اشوک کی چارپائی کے ایک طرف ماں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس کی ماں مامتا اور آتما زخمی تھیں۔

دوسری طرف باپ مجرم بنا سر پکڑے بیٹھا رہا۔ آخر وہ کیا کرے۔ کیوں کہ بیٹے کا مطالبہ سو فیصد ناجائز تھا۔ وہ باپ کے منہ پر کالک ملنا چاہتا تھا۔ کیا یہ بھی شفقت پدری میں شامل ہے کہ وہ اسے ایسا کرنے دے؟ وہ کہے تو گناہ کر تو گنا کرے.... جرم پر مجبور کرے جرم کرے۔ اگر وہ انکار کرے تو بیٹا مرنے کی دھمکی دے۔ پرکاش آنند بلیک میلنگ کے لفظ سے بھی آشنا تھا لیکن یہ ضرور سمجھتا تھا کہ بچے کا مطالبہ غیر قانونی اور غیر اصولی ہے۔ دنیا کے کسی دھرم میں اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

پرکاش آنند کو دو واقعے یاد آئے جس نے نوجوانی کی بھول اور ان عورتوں کے بے راہ روی سمجھ کر نظر انداز کر دیے اور اس نے بھولے سے اشوک کو ٹوکا نہیں تھا۔ اس کی دکان پر ایک عورت گوری، جو مہاجن کی پتنی تھی اور چالیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی رنگت اتنی اجلی تھی کہ دودھ کی بھی نہ ہوگی۔ وہ اکثر کسی نہ کسی کام سے اس کی دکان پر آتی تھی تاکہ مفت میں اپنا کام نکال لے لیکن اس کا دل کرتا تھا اسے بے نیام تلوار کی حالت میں دیکھے۔ جب بھی اس کے سامنے ہوتی تو اپنی ساری کا پلو گرا دیتی تھی کہ اس کے جذبات بے قابو ہو جائیں اور وہ بے قابو ہو کر اسے قابو میں کرلے۔ لیکن وہ اپنے اوپر جبر کر لیتا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت گھر سے کسی کام سے دکان گیا۔ دکان پر اشوک کو چھوڑ گیا تھا۔ دکان کا شٹر گرا ہوا تھا جس پر اسے سخت تعجب ہوا۔ وہ سمجھا کہ اشوک شاید کھانے کی کوئی چیز لینے گیا ہوا ہے۔ وہ گھوم کر عقب میں گیا۔ گلی ویران اور سنسان پڑی تھی اور دکان کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سے دبی دبی سرگوشیاں اور معنی خیز جملے سنائی دے رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر اندر جھانکا۔ وہ گوری اور اشوک باہم پیوست طوفان کی زد میں تھے اور گوری سسکیاں بھر رہی جن میں کیف و لذت بھری تھی۔ ان کے کپڑے ایک کونے میں پڑے تھے۔ وہ اس وقت کسی سحر میں جکڑا اس وقت تک کھڑا

رہا جب تک طوفان گزر نہ گیا۔ اس کے دل میں گوری کو بے نیام دیکھنے کی جو حسرت خواہش تھی اور ارمان تھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ گوری ایسی قیامت ہوگی۔ اس کے سحر نے اشوک کو زیر کرلیا تھا۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ محلے میں ایک عورت کماری رہتی تھی جس کی عمر ستر برس کی تھی۔ وہ نہ صرف صحت مند اور تندرست تھی بلکہ چاق و چوبند تھی۔ اس کے چہرے پر ایک جھری تک نہ تھی۔ وہ اپنے بالوں میں رنگ کرتی تھی جس سے وہ جواں سال لگتی تھی۔ کوئی اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہ کرپاتا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں اور دو جوان بیٹے تھے۔ بیٹیوں کی شادی محلے میں ہو چکی تھی۔ لڑکے شادی کے بعد دہلی گئے تھے۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس نے ایک دن بیٹی کا زیور مرمت کے لیے دیا تھا۔ اس نے اشوک کو زیور دے کر بھیجا کہ دے آئے۔ لیکن وہ آویزے دینا بھول گیا۔ کماری کی رنگت گندمی تھی۔ بظاہر واجبی سی عورت لگتی تھی۔

پرکاش آنند کو خیال آیا کہ آویزے دینا وہ بھولا نہیں تھا۔ ایک عورت جو کسی کام سے آئی تھی اس نے وہ آویزے اٹھا کر اسے دیے جو دکان کے باہر پڑے تھے۔ پرکاش آنند نے اس عورت کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان بند کر کے کماری کے مکان کی طرف لپکا۔ بیرونی دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اشوک اور کماری غلاظت کی دلدل میں باہم پیوست دنیا و مافیہا سے بے نیاز تھے۔ اسے یقین نہیں آیا کہ ایک ستر برس کی بڑھیا بھی اس عمر میں نشیب و فراز سے جوان لڑکی کو بھی شرما دے۔

سارے سوالات کا حل ایک لمحے میں پرکاش آنند کے سامنے آگیا۔

یہ بالکل چت یا پٹ کا کھیل تھا۔ سکہ اچھالنے کے بعد جیت ایک فریق کی ہوتی تھی۔ جب وہ بچپن میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے تو اپنی باری کے لیے سکہ اچھالا جاتا تھا۔ یہی سب کرکٹ میں ہوتا تھا۔ اب یہی زندگی کی بازی میں ہوگا۔ اب کون زندہ رہے گا؟ وہ یا اس کا بیٹا؟ اس نے سکہ فضا میں اچھالا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اس طرح دبوچ لیا جیسے کچھ لیا ہو۔ تقدیر کا فیصلہ اس کے دو بوڑھے کانپتے ہاتھوں میں موجود تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کے اس فیصلے کو دیکھ سکے۔ عقل کے مقابل جذبات کا پلڑا اپنے بیٹے کے حق میں جھک رہا تھا۔ انکار کی صورت میں بیٹے کی زندگی نہ بچانے کی صورت میں الزام اس پر آئے گا۔ بیٹا جوان تھا اس کی پوری زندگی سامنے تھی۔ بیٹے کے زندگی میں جو دو عورتیں سامنے باہم پیوست نظر آئیں اس نے چونکا دیا تھا۔ ایک تو وہ گوری.... دوسری وہ نوجوان دوشیزہ جو اپنے بیٹے کے ہاتھوں عورت بنی اور اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ اس میں زیادہ دوش ان دونوں کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جوانی میں پیر ایسے ہی پھسل جاتا ہے۔ ایک دو بار ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا تھا۔ شادی سے قبل اور پیشہ ورانہ زندگی میں وہ بہتی گنگا میں جی بھر کے ہاتھ دھوتے رہے تھے۔ اب نہ جانے کیا بات تھی کہ انہیں کسی لڑکی اور عورت میں کوئی کشش معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی پتنی اس عمر میں بھی کسی بھرپور عورت سے کم نہ تھی۔ اس میں بڑی کشش تھی۔ شباب آخری منزل پر تھا۔ جسم کے فراز بڑے دل کش تھے۔ نہ جسم ڈھلا تھا اور نہ ہی سینہ.... عورت کی ساری کشش، حسن اور دل فریبی اس کے سینے میں ہوتی ہے۔ جسم متناسب تھا۔ جب وہ سونے کے لیے دراز ہوتی تو لباس نکال کر ایک طرف رکھ دیتی تھی۔ شادی کے بعد سے ان کے کہنے پر وہ ایسا کرتی تھی۔ وہ ہم آغوش ہو جاتے تھے۔ آج بھی وہ اس حالت میں ہوتی تھی۔ لیکن اب ان کا دل نہ تو اسے چومنے کو اور نہ ہی چھونے اور آغوش میں لے کر باہم پیوست ہونے کو.... وہ بے کشش نہ ہوئی تھی۔ جی ان کا جیسے بھر گیا تھا۔

انہوں نے سوچا وہ خود اپنی زندگی میں دیکھ چکا تھا اور انجام کی طرف بڑھ رہا تھا.... مرنا تو اسے ہی چاہیے تھا.... انہوں نے آہستہ آہستہ اوپر والا ہاتھ اٹھایا اور ایک گہری سانس لی۔ تقدیر نے بھی ان کے اس فیصلے کی توثیق کردی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ

تقدیر کے اس فیصلے کا نفاذ کب اور کیسے ہوگا....؟
صبح تک وہ خاصے پرسکون ہو چکے تھے۔ بیٹے کو چائے پلانے کے بعد انہوں نے پرشفقت لہجے میں کہا۔
"اشوک بیٹا! میں نے تیری بات مان لی لیکن مجھے یہ بتا کہ یہ سب کیسے ہوگا؟"
اشوک بھی رات بھر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ باپ کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں.... اس نے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔
"پتا جی! میں نے بتایا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں.... آنند پور میں آپ کی ساکھ ایسی ہے کہ لوگ آپ کی شرافت کی سوگند کھاتے ہیں اور آپ ایک مثالی شخصیت ہیں۔ چودھری صاحب کا آپ پر اندھا اعتماد ایسا ہے کہ آپ پر کوئی شک ہی نہیں کر سکتا۔"
"میرے آنے کے بعد جب یہ بات کھلے گی....؟ یہ بھی تو نے سوچا....؟"
"یہ بات کبھی نہیں کھلے گی.... آپ جیسا ماہر زرگر آس پاس کے پورے علاقے میں نہیں.... آپ نے تو خود ہی بتایا تھا کہ ایک طرف ہندو پور اور دوسری جمشید نگر اور اجمیر اور بنارس تک آپ کی مہارت تسلیم کی جاتی ہے۔ آج تک آپ نے بنا کے دیا اس میں رتی بھر کھوٹ نہیں تھا اور کوئی ہوتا وہ آپ کی جگہ رتی ماشہ تولہ کھوٹ سے بہت بڑا جیولر بن جاتا.... اس بار بھی آپ سو تولہ کا زیور بنا کے دیں گے تو چودھری صاحب آنکھ بند کر کے رکھ لیں گے۔"
"اور اگر انہوں نے اپنا شک دور کرنے کی غرض سے کسی کو بلا لیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوچا تو نے؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"جب آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا؟ اب کیا ہوگا پتا جی؟ آپ اپنے دل سے اس ڈر اور اندیشے کو نکال دیں.... آپ جیسا ماہر کاریگر اصلی سونے کی جگہ نقلی سونے کے زیور رکھے تو فرق کس کی نظر محسوس کر سکتی ہے۔ چودھری صاحب زمین دار ہیں سنار نہیں.... اور کھرے کھوٹے کا پتا تو اس وقت چلتا ہے جب زیور بیچنے کی نوبت آئے.... یا وہ کسی دوسرے کو بلا کے کہتے کہ پرانے کو ڈھال دو اور نیا بنا دو.... وہ تو پالش کے لیے بھی آپ ہی کو بلاتے ہیں اور آئندہ بھی یہی ہوگا.... برسوں گزر جائیں گے کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ آپ نے اصلی نہیں نقلی سونے کے زیورات بنا کے دیے تھے۔"
پرکاش آنند نے بیٹے کی بات غور سے سنی اور پھر سر ہلا دیا۔
"وہ تو میں بھی دعوے سے کہتا ہوں کہ میرے ہاتھ سے ڈھل کر نکلے ہوئے سونے کے اصلی اور.... نقلی زیور کو پہچان سکتا ہے تو کوئی دوسرا سنار.... وہ بھی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد۔" پرکاش آنند نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔
"یہی تو میں کہتا ہوں کہ پتا جی! ڈرنے اور چنتا کرنے والی کوئی بات نہیں ہے.... کیوں کہ سال بھر میں میرا وعدہ ہے کہ آپ کو دبئی بلا لوں گا اور ماں کو بھی ساتھ ہی.... چھوڑ دینا یہ آنکھیں پھوڑنے دینے والا کام.... عیش کرنا دبئی میں میری شان دار کوٹھی ہوگی اور یہ لمبی سی کار جو یہاں وزیروں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ نوکر چاکر ہوں گے سارا پاپ میرے سر.... آپ اپنی مرضی سے یہ پاپ نہیں کر رہے ہیں۔ میں آپ دونوں کو وہاں سے بنارس بھیج دوں گا۔ وہاں اشنان اور پوجا پاٹ کرنے سے سارے پاپ دھل جاتے ہیں اس طرح کپڑے ڈرائی کلین ہوتے ہیں۔ اصل بات نیت کی ہوتی ہے جو ایشور دیکھتا ہے۔ آپ کی نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ آپ نے میرے مجبور کرنے پر ایسا کیا تھا۔"



سریتا کھنہ تھکن سے بے حال صوفے پر گر گئی اور بے حس و حرکت سی ہو گئی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم ہچکولے کھا رہا تھا۔
شام کی تقریبات کی نگرانی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان کی کوٹھی میں ایسی تقریبات پہلے بھی ہو چکی تھیں مگر کھنہ بار بار اس دعوت خاص کی اہمیت کا بار بار ذکر

کرتا تھا۔ اس صوبے کے وزیراعلیٰ مہمان خصوصی تھے اور وہ کھنہ کو صوبائی اسمبلی کی نشست کا ٹکٹ دینے آرہے تھے۔ آج انہیں اس کا اعلان کرنا تھا۔ پارٹی کے تمام سرکردہ اراکین.... مجلس عامہ.... صوبائی وزرا اور اسپیکر سمیت مہمانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب بنتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح سارے انتظامات اسی فائیو اسٹار ہوٹل کے سپرد تھے جس کا مالک کھنہ کے پتا جی کے دوستوں میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود سریتا اندر سے چکر لگاتی رہی تھی۔ فون تھا کہ مسلسل بج رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھک گیا۔ وہ فون بھی ایک کان پر رکھتی تھی تو کبھی دوسرے کان پر.... آخر کس کس کا فون سنے۔ بہت سارے فون غیر ضروری اور بے حد رسمی بھی آرہے تھے۔

کچھ دیر سکون سے رہنے اور جسم کو آرام دینے کے لیے فون بند کر دیا۔ اس کا جوڑ جوڑ اس طرح درد کر رہا تھا۔ جیسے چھ سات جوان لڑکوں نے مل کر اس کے ساتھ اجتماعی درندگی کی ہو۔ پھر صوفے پر نیم دراز ہو کے پاؤں سینٹرل ٹیبل پر پھیلا دیے۔ اس کے پیروں میں سکت اور جان نہیں رہی تھی۔ اگر کوئی اندر گھس کر من مانیاں کرتا ہوا اس کی بے حرمتی کرتا تو مزاحمت تو درکنار چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ ملازمہ نے اس کے قریب آکر کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے صرف کریم کافی اور کلب سینڈوچ لا دو.... جلدی سے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“

ملازمہ کے جاتے ہی اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹی وی کے ریموٹ کو اٹھا کر تھام لیا۔

سریتا کی ریموٹ کا بٹن دبا کے ٹی وی کی تصویر بدلنے والی انگلی اچانک رک گئی۔

اس کے سامنے مدھوبالا ناچ رہی تھی۔ شہزادہ سلیم کے شاہی لباس میں ملبوس دلیپ کمار کھڑا تھا اور پرتھوی راج کی غضب ناک نظریں ایک کنیز سرو ریار اپنے عشق کا اعتراف کرتا دیکھ رہی تھی.... پیار کیا تو ڈرنا کیا.... جب پیار کیا کوئی چوری نہیں کی.... چھپ چھپ کے آہیں بھرنا کیا۔ جب پیار کیا.... پیار کیا....

سریتا کا ذہن پھر بہت پیچھے رہ جانے والے وقت میں لوٹ گیا۔ کہاں ہے وہ جو اسے مدھوبالا کہتا تھا۔ بھگوان کرے وہ مر ہی گیا ہو۔ ہر وقت غور کرنے والا جسے سب چھیڑتے تھے کہ غوری شہاب الدین غوری.... زرگر کی اولاد.... وہ ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ فلم مغل کی مدھوبالا پر فریفتہ تھا جسے مرے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا۔ یہ شاید اس کی پیدائش سے پہلے کی بات ہو گی۔ پاگل مگر اس سے زیادہ پاگل تو وہ خود تھی کہ جوانی کے جذبات کی سوچ میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ اسے اپنی کسی بات پر اختیار اور بس نہیں رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی اور ہر نوجوان لڑکی کی طرح قدِ آدم کے سامنے کھڑی لباس بدلنے سے پہلے بے لباس کی حالت میں کھڑی اپنے سراپا اور نشیب و فراز کا ہر زاویے سے ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ سریتا تو نے کیا جسم اور فگر زپائے ہیں۔ اس کی ایک سہیلی تھی رنجنا جو حد سے زیادہ بے تکلف اور فری تھی۔ وہ رات رک جاتی تو دونوں لباس سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے سے خوب لطف اٹھاتی تھیں۔ اس کا دل کرتا تھا کہ کاش وہ کسی نوجوان لڑکے سے ہم آغوش ہو کر اپنی پیاس بجھالے.... اس لمحہ بھی کسی مرد کو یاد کر رہی تھی کہ وہ کمرے میں گھس کر اس حالت میں دبوچ لے اس کی مراد بر آئی اشوک کمرے میں داخل ہوا۔ پھر تو طوفان آنا تو ایک فطری امر تھا۔ اس وقت اس کی عمر تھی بھی کیا.... بارہ برس کی تھی۔ ایک آب و تاب کلی تھی.... لیکن اس کی اٹھان اور نشوونما قیامت کی تھی۔ اشوک نے اسے پھول بنا دیا۔ عورت بنا دیا۔ وہ دونوں تین گھنٹے دلہا دلہن بنے رہے اور لذتیت میں ڈوبے رہے۔ بعد میں بھی جب بھی موقع ملتا اشوک بھونرا بن جاتا تھا۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ.... مائی فٹ.... بلاشبہ وہ ہینڈسم تھا۔ اس کی خوب صورتی یہ تھی کہ وہ دراز قد تھا جس نے اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ

کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں دلیپ کمار خاک بھی نہیں تھا۔ بس اسے نظر آتا تھا تو فتور اس کی نظر میں بھی اور عقل میں بھی کہ اس نے سوچے سمجھے بغیر اسے پسند کرلیا اور حد یہ ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ سونپتے ہوئے اس میں دیر نہیں لگائی۔ کس قدر بے شرمی کی اور گویا UN LADY LIKE بات تھی۔ اس کی سہیلی رنجنا بھی سرفراز ہونا چاہی تو اشوک نے انکار نہیں کیا تھا۔

کیا شریف لڑکیاں اور مہذب اور شادی شدہ عورتیں کیا ایسا کرتی ہیں۔ اشوک کہتا تھا کہ ارمان پورے کرنے میں شرافت کا کیا تعلق.... کسی میں ہمت ہو تو بہت سوچ سمجھ کر موقع محل دیکھ کے ڈرتے ڈرتے اشاروں کنایوں میں اظہار محبت کرتا ہے۔ اب تو ایسا بھی ہونے لگا تھا کہ ادھر لڑکی سیانی ہوئی ادھر عورت بن گئی.... کتنی دلہنیں کنواری ہوتی ہیں۔ اب تو لڑکیاں چاہتی ہیں کہ وہ کلی نہ رہیں۔ شادی شدہ عورتیں بھی خوب مزے کرتی ہیں کیوں کہ کوئی داغ دھبا نہیں آپاتا ہے۔ پتی کے اکاؤنٹ میں لکھ لیا جاتا ہے۔

وہ خود تو کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں ٹپک پڑی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کتنا ارزاں کر دیا تھا.... اشوک نے اس کے ساتھ جی بھر کے کھیلا اور کھیلتا رہا تھا جیسے وہ اس کی پتنی ہو.... اس نے ان کیف نشاط انگیز لمحات میں کبھی بھولے سے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک معزز دولت مند اور اپر خاندان کی بیٹی اور وہ ایک معمولی زرگر کا میٹرک پاس بیٹا ہے۔ نکما اور آوارہ .... بے عمل اور کاہل .... میٹرک پاس کر کے سمجھتا تھا کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔

بستر، جذبات اور غلاظت کے دلدل میں گرنے کے بعد مرد اور عورت، لڑکی لڑکا، دولت مند اور غریب جسم کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے سمے کچھ نہیں سوچتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے اپنی ماں کو پتاجی کے دو ایک دوستوں کی آغوش میں دیکھا تھا اس طرح پتاجی کو ان کی بیویوں اور گھر کی خادماؤں کے جسموں اور شباب سے کھیلتے ہوئے۔ دراصل جوانی، شباب اور جذبات اور مرد اور عورت اندھے ہوجاتے ہیں۔

اس وقت سریتا کو اشوک کی طلب اور ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اشوک کے تصورات اور اس کے ساتھ گزرے ناقابل فراموش لمحات کے رنگین، سنسنی خیز اور نشاط انگیز تصورات میں کھونے کے لیے ایک سرد آہ بھر کے ٹی وی بند کر دیا۔ کیا مرد تھا؟ کتنے سارے مرد دراز قد، جوانی، وجیہہ اور خوب صورت بھی تھے لیکن ان سب میں ایک بھی اشوک کی طرح مثالی نہ تھا۔ ان جانے راستے پر شادی شدہ مرد بھی تھک جاتے اور ساتھ چھوڑ جاتے لیکن اشوک منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتا تھا۔ وہ کسی بھی طوفان، کالی آندھی اور سمندر کی طغیانی سے کم نہیں تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ وقت بہت گزار دیتی تھی۔ جانے نہیں دیتی تھی۔ وہ اس سمے ایسا محسوس کر رہی تھی کہ جیسے اشوک اس کے پاس ہی دراز ہے۔ اس کے ہونٹ اور ہاتھ اور سراپا بہک رہے ہیں اور اس پر اشوک کے قرب سے جو نشہ چھاجاتا تھا وہ چھا رہا ہے۔ یوں تو کسی بھی مرد اور لڑکے کے قرب کی ضرورت ہو تو صرف ایک فون کی بات تھی لیکن وہ اشوک کا نعم البدل نہیں ہو سکتا تھا.... یہ بہت بڑی کم زوری اور پرابلم تھی کہ وہ ابھی تک اس بے وفا.... بے غیرت کو اپنے خیالوں سے نکال نہیں پائی تھی جو ایسا دبئی گیا کہ لوٹ کے آنا ہی بھول گیا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ سری لنکا، بھارت، نیپال، اور بھوٹان اور نہ جانے کہاں کہاں کی ہندو دھرم کی لڑکیاں عورتیں ملازمت کے سلسلے میں وہاں رہتی ہیں۔ وہ راجہ اندر بنا ہوا ہوگا۔ مگر اس کی بے وفائی سریتا کے لیے ایشور کا انعام بن گئی۔ وہ یہاں رہتا یا سچ مچ ایک برس بعد لوٹ کے آجاتا تو کتنی خرابی ہوتی۔ اس کے پتاجی کتنے سمجھ دار، جہاں دیدہ اور دور اندیش تھے وہ ہر بحران سے نمٹنا جانتے تھے۔ وہ زرگر کا بیٹا ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کے لیے مرسڈیز میں بھی آتا تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے .... اسے تو خیر وہ بھگا ہی دیتے مگر انہیں معلوم ہوتا کہ

اس زرگر کی اولاد کی یہ ہمت خود ان کی بیٹی کی وجہ سے ہوئی جس کی محبت کا وہ دعوے دار ہے تو پاپا کو کتنا دکھ ہوتا۔ یہ صلہ دیا ان کی بیٹی نے جو ان کی لاڈلی تھی۔

سینڈوچ کھانے کے بعد کافی پی کے سریتا نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔ تھینک یو گاڈ....! تو نے میری لاج اور خاندان کی عزت پر حرف آنے نہیں دیا۔ اس نے میٹرک کرنے تک نہ صرف یہ کہ اشوک کو بھلا دیا تھا بلکہ الٹا اب اس کا خیال سریتا کو شرمندگی اور اپنی بے وقوفی کے احساس اور اپنا سب کچھ سونپنے کا خیال کسی دو دھاری تلوار کی طرح اس کے وجود کو کاٹنے لگتا۔ کتنا اچھا ہوا کہ اس عشق کی خوشبو' کل سے پھول بننے' لڑکی سے عورت بننے' داغ دار اور اشوک سے کتنے عرصے تک تعلقات استوار رکھنے شک کی طرح پھیلنے کی مہلت نہیں ملی۔ صرف اس کی دو سہیلیاں ہم راز تھیں جو اس کی عمر تھیں اور انہوں نے بھی اپنی خوشی اور مرضی سے اشوک سے داغ دار کیا تھا۔ اس نے ان دونوں کی ان لمحات کی تصویریں خفیہ طور پر اتاری تھیں کہ اگر انہوں نے اس کی آلودگی کو ظاہر کرنا چاہا تو انہیں آئینہ دکھا سکے۔ اگر اشوک رہتا تو ایک نہ ایک دن سب کو پتا چل جاتا۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی وہ دفع ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اطمینان سے میٹرک کیا۔ پھر اپنی ضد پر دہلی چلی گئی۔ انٹر کے بعد بی اے کا امتحان دیا۔ اتنا عرصہ وہ ہوسٹل میں نہیں رہی۔ پاپا نے اس کے لیے دہلی والی کوٹھی خالی کروالی تھی۔ وہ وہاں ایک ملازمہ.... ڈرائیور اور چوکی دار کے ساتھ رہ رہی تھی۔

اس دوران خاندان کے مراسم میں بھی بڑی خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ اس کے تایا جو اسمبلی کے ممبر تھے یہ خیال آگیا کہ سارے بھائی کسی وجہ کے بغیر آپس میں تعلقات کی کشیدگی کا شکار ہیں۔ انہیں بھگوان نے اتنا دیا ہے کہ خوش حال اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ کوئی زمین دار.... صنعت کار.... یا سیاست دان تو کیا ہوا؟ ان کے درمیان وجہ تنازع بھی تو نہ تھی۔ وہ چل کے پاپا کو گلے لگانے آگئے.... پاپا اتنے خوش ہوئے کہ اسی وقت اپنے ساتھ لے کر تیسرے بھائی سے ملنے وہ چوتھے کے گھر پہنچے اور بہت روئے دھوئے لیکن برسوں بعد سب ایک ہو گئے۔ اس کے بعد دیوالی پر سارے اکٹھے ہو گئے تھے تو ایک مرتبہ پھر پہل بڑے ابا جو کزن ہوتے تھے انہوں نے ونود کھنہ کے لیے اسے مانگ لیا اور بدلے میں ونود کی بہن مانگ لی۔

ونود کھنہ کے آجانے سے اس کے خیالات کی رو ماضی اور حال کی طرف لوٹ آئی۔

"بیگم صاحبہ! یہاں آرام فرما رہی ہیں؟" اس نے تلخی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا ذرا انتظامات پر نظر رکھنا۔" سریتا کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔

"اور میں کیا کر رہی تھی.... میں صبح سے.... ابھی ذرا دیر کے لیے تو آکر بیٹھی تھی۔"

"ذرا دیر....؟ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تو میں نے پوچھا تھا۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی.... خادمہ سے پوچھ لیں.... کھانا بھی نہیں کھایا میں نے صرف کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ لیا ہے.... اور ضرورت کیا ہے میرے کچھ دیکھنے کی جب آفس سے تمہاری وہ چہیتی پہنچ گئی ہے۔ یعنی چھمک چھلا.... تمہاری پولیٹیکل سکریٹری۔" اس نے لہجہ بنا کے کہا۔

"پھر شروع کر دیں تم نے جاہل عورتوں والی باتیں۔" وہ کبیدہ لہجے میں بولا۔

"مجھے جاہل سمجھنے والا خود کتنا تعلیم یافتہ ہے؟ کم سے کم میں جینوئن گریجویٹ تو ہوں۔" سریتا چراغ پا ہو کے بولی۔

یہ جوابی وار بہت سخت تھا۔ کسی دو دھاری تلوار کی طرح جو زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اسے ونود کھنہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا نہ صرف میٹرک سے لے کر بی اے تک اس کی جگہ کون بیٹھ کر امتحان دیتا آیا تھا۔ ڈگری آج جو اس کے پاس تھی اس نے پڑھ کے نہیں لی تھی۔ اس کے باپ نے کسی اور کے

ذریعہ سے دلوا دی تھی۔ وہ ایک درخواست تو درکنار ایک جملہ تک نہیں لکھ سکتا تھا۔ انگریزی کیا ہندی کا املا بھی غلط ہوتا تھا۔ وہ غصے میں پلٹا اور ٹھوکر سے سائیڈ ٹیبل کو لات مار کر گرا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

سریتا کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ مگر وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے باہر نکل کے دیکھا تو سارے کام باقاعدگی میں ہو رہے تھے۔ ونود کھنہ کی سیکریٹری جو ترقی پا کے پولیٹیکل سکریٹری بن چکی تھی ایسی تیاری کے ساتھ مستعد کھڑی تھی جیسے پارٹی کے لیے تیار ہو کر آئی ہے۔ اس نے سلیولیس ٹی شرٹ اتنی مختصر اور نیچی تراش کے گریبان پہنی تھی کہ وہ جھکے یا ہاتھ اٹھائے تو صاف دکھائی دیتا تھا کہ زیر جامہ ہی نہیں ہے اور فراز کے ابھار پکے پھل لگتے تھے... جینز کے اوپر اس کی اجلی کمر اور کسے ہوئے پیٹ کی سفیدی نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ دفتر میں ماڈل بنی رہتی تھی کہ نشیب و فراز اور کولھوں سے لوگ آنکھیں سینکتے تھے اور فراز کو وہ اور عریاں کر دیتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی کمرے سے نکلے ریمپ پر کیٹ واک کرے گی۔ وہ فطری حالت میں دکھائی دیتی تھی۔ ایک مرتبہ لفٹ مین نے بجلی فیل ہونے پر لفٹ رک جانے پر اسے تنہا پا کر قریب کر دیا تھا لیکن وہ کہتی تھی یہ بات جھوٹ ہے۔ لیکن جب لفٹ سے باہر آئی تو جن لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ واقعی اسے ریپ کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس کی ٹی شرٹ اور جینز اس کے تن پر نہیں تھی۔ یہ لفٹ صرف مخصوص تھی آفس کے افسران اور ایم ڈیز کے لیے... سریتا کے لیے کسی سکریٹری کے وجود کو اپنا متبادل سمجھنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گزشتہ دس برسوں میں ایسی تین آ چکی تھیں جو اس کے پتی کے لیے قائم مقام پتنی سے کم نہیں تھیں۔ دفتروں میں جو لیڈی پرسنل سکریٹری ہوتی تھیں وہ بیویوں سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کر ہوتی تھیں اور ان کا خلا پر کرتی تھیں۔ ان کی ہر بات مانتی اور ہر طرح سے خوش بھی کرتی تھیں جو ایک پتنی نہیں کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ کسی کام سے گئی تو سکریٹری اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ ونود کھنہ کے کمرے کی سرخ بتی روشن تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی سکریٹری کو کوئی خاص خط لکھوا رہا ہے۔ کمرے میں بغیر اجازت کوئی نہیں آ سکتا۔ وہ چوں کہ اس کی پتنی تھی اس نے بغیر دستک کے ہینڈل کا لٹو بے آواز گھمایا۔ اتنا کھولا کہ جھری بن گئی۔ اس جھری میں اس نے دیکھا کہ وہ دونوں بے لباس ماء فیہا سے بے نیاز جانوروں کی طرح ہیں... سکریٹری کتنا ہی اسے خوش کر رہی ہے۔ بلیو فلم کا ہیجان خیز نظارہ سامنے تھا۔ پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ان کے کپڑے اٹھا کر گھر لے جائے۔ پھر جانے کیا کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے اس کا ذکر کبھی ونود کھنہ سے نہیں کیا۔ سہاگ کی پہلی رات ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا پتی کس قماش کا ہے۔ اس کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی عورت نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اسے ونود کی حرکتوں سے ہوا تھا۔ اس میں حیرت کی بات نہ تھی اور نہ ہی دکھ کی۔ کیوں کہ نوجوانی میں جس طرح ہر مرد کا پیر پھسلتا تھا ونود کا بھی پھسل گیا تھا... اور پھر وہ کون سی ستی ساوتری تھی ادھر وہ سیانی ہوئی ادھر وہ اشوک کی جھولی میں کسی پکے پھل کی طرح ٹپک پڑی تھی۔ کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا تھا۔ صرف وہ ایک لڑکی داغ دار پھل نہیں تھی۔ بہت ساری تھیں۔ وہ سیانی ہوتے ہی جوانی سے لطف اور کیف حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

یہ جو پرسنل سیکریٹری ہوتی تھیں انہیں نہ تو بیاہ کی ضرورت ہوتی تھی اور اپنے باس کی پتنی کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ورنہ وہ دفتر کے بعد تقریبات میں اور باہر کے دوروں میں ونود کھنہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا کہ تایا سے یا پاپا سے بات کرے لیکن ہر بار وہ خود ہی رک جاتی تھی کیونکہ یہ اس طبقے کے کلچر میں شامل تھا۔ وہ احتجاج کرتی تو فرق صرف اسے پڑتا۔ ان کے تعلقات جو کبھی مثالی نہ تھے۔ مزید کشیدہ ہو جاتے۔ خاندان میں ایک شادی ان کی وضع داری تھی۔ عموماً" وہ دوسری سوشل وائف گھر سے باہر کی تقریبات کے لیے رکھتے

خاندانی بیوی کا سماجی رتبہ بلند رکھا جاتا تھا اور گھر کے اندر مالکن رہتی تھی۔ جہاں تک سریتا اور ونود کھنہ کے درمیان ازدواجی تعلقات وہ رسمی تھے۔ دنیا کو دکھاوے کے لیے ہوتی تھی۔ سریتا کے ساتھ ایسا نہ ہوا کا تھا۔ کیوں کہ وہ تعلیم یافتہ تھی اور سوشل سرکل میں فخر کے ساتھ پیش کیے جانے کے قابل تھی۔ انتہائی خوب صورت..... فیشن ایبل اور سوشل ایٹی کیٹس کی حامل..... تقریبات میں وہ فوٹوگرافروں اور مہمانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ آج تک کسی نے بھی اسے مدھوبالا نہیں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ نئے زمانے کے لوگ اس مدھوبالا کو اتنا جانتے ہی نہیں تھے کہ دونوں کا موازنہ کر سکتے..... البتہ اسے شبانہ اعظمی بڑے پیار سے خاندان کے لوگ اور ملاقاتی اور شناسا لوگ بھی کہتے تھے جو زبان زدعام ہوگئی تھی۔ اسے شبانہ اعظمی ہی کہا جاتا تھا..... صورت میں مشابہت کی وجہ سے نہیں ..... ونود کھنہ کے اور اس کے نام کی رعایت سے.....

تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود کسی نوجوان دوشیزہ کی طرح قسلم تھی اور اس نے اپنے جسم اور تناسب کو بھی سنبھال کر رکھا تھا۔ سینہ ڈھلنے نہیں دیا تھا کیوں کہ یہ عورت کے جسمانی طور پر بھدا اور بے کشش بنا دیتا تھا جس سے عمر، چہرہ اور حسن متاثر ہو جاتا تھا۔ اس لیے ہر لڑکی عورت کی کوشش ہوتی تھی کہ سینے کے اس فراز کو ڈھلنے نہ دے اور اس لیے نمایاں کرتی تھی کہ اس کے حسن، دل کشی اور کشش کو بڑھا دے۔ اس نے احتجاج بھی کیا تھا کہ وہ کیفی اعظمی کی بیٹی نہیں ہے..... اسے یہ نام بہت پسند ہے۔

”پھر ایسا کرو کہ اپنے پتی کا نام بدل کر سلیم اختر کر دو بھابھی.....! ہم تو ان سے کہتے ہیں کہ سریتا بھابھی تو شبانہ اعظمی کی طرح سدابہار ہیں۔“

”شبانہ اعظمی جتنی حسین، سدابہار اور پرکشش ہے اتنی اچھی ایکٹریس بھی ہے۔“

اپنی سیکریٹری یا پولیٹیکل سیکریٹری کو پتنی نہ بنانے میں بھی فائدہ ونود کھنہ کا ہی تھا۔ جب اس کا دل بھر جاتا تھا وہ اپنا رویہ بدل لیتا تھا۔ پھر سیکریٹری خود ہی کسی اور کو مرکز نگاہ بنا لیتی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنی ساری کشش کھو چکی ہوتی تھی اور ونود اسے نوازتا نہیں تھا۔

ایک کی ونود نے شادی کرا دی تھی۔ اس لیے کہ وہ بہت ڈھل کر بے کشش اور بھدی ہوگئی تھی۔ دوسری نے خود ہی کرلی تھی جس کا نام شرمیلا تھا۔ تیسری جو آئی تین ماہ پیشتر..... اس کا نام سجاتا داس تھا۔ بنگالی تھی بڑی نمکین تھی۔ جاذبیت سے بھرپور تھی۔ ہر سابق سکریٹری کے مقابلے میں زیادہ خطرناک حسن و شباب رکھتی تھی اور اس اسلحے کو استعمال کرنے میں بڑی مہارت رکھی تھی۔ اپنی پوزیشن کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ پروٹول کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ جہاں سریتا موجود ہو وہ پیچھے ہٹ جاتی اور محض سکریٹری ہو جاتی۔ اس کی عدم موجودگی میں وہ ڈبل چارج سنبھالنے میں تذبذب اور ہچکچاہٹ نہیں کرتی تھی۔ تنہائی میں کسی کالی ناگن کی طرح ڈستی تو ونود پاگل ہو جاتا۔

ہمیشہ کی طرح یہ پارٹی بھی نصف شب کے بعد بہت دیر تک جاری رہی۔ ٹکٹ ملنے کی خوشی میں ونود کی کامیابی اور صحت کے جام پر جام تجویز کیے گئے۔ ایسی تقریبات میں ساتھ آنے والی عورتوں میں سے نصف پینا برا نہیں سمجھتی تھیں مگر وہ اعتدال میں رہتی تھیں سوائے دو چار کے جو مردوں کی ہر میدان میں برابری کی دعوے دار تھیں۔ سریتا صرف ساتھ دینے کے لیے ایک دو پیگ لے کر معذرت کر لیتی تھی بیش تر پتی اپنی بیویوں کی اس عادت کو پسند کرتے تھے۔ شارب پانی کی طرح پینے والے پیتے رہتے۔ بچوں کو ایسی تقریبات میں صرف کھانے کے وقت شریک کیا جاتا تھا اور وہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مہمان خصوصی کو پھول پیش کرنے کے بعد خاص خاص مہمانوں سے ہاتھ ملاتے تھے۔ انہیں رٹائے گئے جواب دیتے تھے اور کھانے کے بعد سونے چلے جاتے تھے۔ ابھی تک دونوں لڑکیاں ایک بیڈ پر سوتی تھیں۔ لڑکے کا بیڈ الگ تھا اور خیال یہ تھا کہ جب اس کی عمر بارہ برس کی ہوگی اس کا بیڈ روم بھی الگ کر دیا جائے گا۔

سریتا لباس بدلے اور میک اپ اتارے بغیر ہی بستر پر گری اور نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ سارے دن کی تھکن کے علاوہ زیادہ پی لینے سے اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور بدن کا جوڑ جوڑ بھی ایسا ٹوٹ اور درد کر رہا تھا جیسے اسے کسی باکسر ٹائپ مرد نے آغوش میں لے کر وحشیانہ پن سے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس نے ملازمہ سے سر درد کی گولیاں منگوائیں۔ جتنی دیر میں ملازمہ گولیاں لائی وہ سو گئی۔

کسی جھنجھوڑنے پر وہ جاگی۔ پہلے وہ سمجھی تھی کہ ونود اسے جگا رہا ہے تاکہ اسے آغوش میں باہم پیوست ہو جائے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس لیے کہ آج اس کی راتیں کالی ناگن کی آغوش میں گزر رہی تھیں۔ پھر اس نے غنودگی میں کہا۔

"ونود.... آج نہیں مجھ میں ملنے تک کی سکت نہیں ہے۔ پلیز! مجھے چومو نہیں...."

اور پھر اس نے سونا چاہا تو اس پر کسی نے پانی کا بھرا ہوا گلاس پھینک دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ اسے صورت حال سمجھنے میں چند ساعتیں لگیں۔ بالآخر اسے یقین آ گیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں ہے۔

اس کی نظروں کے سامنے چہروں پر ڈھاٹے باندھے نصف درجن افراد کھڑے تھے۔ وہ سب صحت مند، دراز قد اور توانا جسموں کے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوف ناک اسلحہ تھا۔ کلاشنکوف، ریپٹر اور سائی لینسر لگے ریوالور.... ایک نے ونود کی گردن سے ریوالور کی نال لگا رکھی تھی۔ دو نے تینوں بچوں کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔ تیسرے نے اسے ہاتھ سے پکڑ کے کھینچا۔

وہ خوف و دہشت سے ساکت و جامد ہو گئی اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ اس کے سامنے ڈاکو تھے جو اس کے پتی اور بچوں کو یرغمال بنا چکے تھے دونوں بچیاں رو رہی تھیں اور بری طرح کانپ رہی تھیں۔ وہ فلموں کے مناظر جن میں بدمعاش فائرنگ سے قتل و غارت کرتے تھے دیکھتی رہتی تھیں ان سے وہ دہشت زدہ ہو رہی تھیں لیکن لڑکا جو اپنی بہنوں سے بڑا تھا۔ بہادر مرد ثابت کرنے کے لیے چپ کھڑا دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور ہر قسم کے جذبات سے عاری۔

"سریتا....!" ونود نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ جیسا کہیں وہ کرو جو مانگیں دے دو۔ زیور، رقم ـ"

سریتا نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ اسے رقم اور زیورات دینے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ جہاں کہیں بھی گھروں میں ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی تھیں یہ ڈکیت نہ صرف مال اسباب لوٹ لیتے تھے خوب صورت لڑکیاں اور عورتوں کو بھی.... انہیں بے لباس کر کے سب کے سامنے گن پوائنٹ پر بے حرمتی کرتے تھے۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ وڈیو فلم بھی بناتے اور ان کی عریاں تصاویر بھی بناتے تھے۔ اب اسے خوف اور اندیشہ اس لیے تھا کہ وہ نہایت حسین اور پرکشش تھی اور اس پر کسی دوشیزہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ اگر اسے پتی اور بچوں کے سامنے بے لباس کر کے درندگی کا نشانہ بنایا گیا تو وہ کیا کرے گی؟

"میں آپ لوگوں کو سب دے دوں گی.... آپ ان بچوں کو چھوڑ دیں۔"

"چھوڑ دیں گے شریمتی جی! انہیں اور آپ کو ساتھ نہیں لے جائیں گے.... جتنا سارا مال ہے وہ نکالو.... اور اپنا زیور اور ہمیں سب پتا ہے تمہارے پاس کتنا مال ہے.... ہم سے دھوکا اور چالاکی مت کرنا۔"

ان کا سردار نظر آنے والا باریش تھا اور اس کی بڑی بڑی، لمبی لمبی اور گھنی مونچھیں۔ اس نے کپڑے سے آنکھوں تک اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ سریتا جانتی تھی کہ یہ ڈکیت کتنے باخبر اور کتنے سفاک ہوتے ہیں۔ اسے مال کی کوئی پروا نہ تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے حسن، کشش اور جسمانی نشیب و فراز سے متاثر ہو کر اسے کھلونا بنا لیں۔ اس لیے اس نے فوراً ہی الماری کھول کر اس کی تجوری اور درازوں سے نکال کر ہر چیز دیتی گئی۔ یہ لوگ پہرے داروں کو قابو میں کر کے بے بس کر کے پہنچے تھے۔ یقیناً انہوں نے فون کے تار بھی کاٹ دیے ہوں گے۔ شاید سب کے موبائل فون

بھی اپنے قبضے میں کر لیے ہوں گے۔ یوں بھی پولیس کو اطلاع کرنا لاحاصل تھا۔

صبح سویرے کچھ دیر پہلے ڈاکو رخصت ہو گئے۔ وہ اس کی طرف اس لیے متوجہ نہیں ہوئے تھے کہ ہیرے جواہرات کے زیورات دیکھ کر خوشی سے ان کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ اس میں وہ زیورات بھی شامل تھے جو اپنی شادی میں ساتھ لائی تھی۔ ایک بد معاش اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سریتا کو ہر لمحہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کی کمر اور بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر آغوش میں لے کر بے تحاشا چومنا شروع کر دے گا۔ لیکن وہ باز رہا تھا اور سریتا نے سکون کا سانس لیا۔ رقم بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

اگر ڈکیت اس کی عزت سے کھیلتے تو دکھ نہ ہوتا اور نہ ہی وہ مزاحمت کرتی۔ لیکن ان معصوم بچوں کے سامنے بے آبرو ہوتی تو جیتے جی مر جاتی۔ طوفان گزر جانے کے بعد ونود اپنے اور اس کے لیے وہسکی کا پیگ بنا لایا جس نے اعصاب کو قابو میں رکھا۔

اگلے چند دن معمول کی کاروائی میں گزر گئے.... کچھ اعلیٰ افسران ونود سے ملنے آئے اور اس سے رسماً ڈاکوؤں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ انہوں نے سریتا سے لوٹے گئے مال کی مالیت پوچھی۔ بچوں کو ان سے دور رکھا گیا۔ واردات کی خبر ہر اخبار میں سنسنی خیز انداز سے شائع ہوئی۔ سریتا اور ونود کی تصویریں بھی.... اس لیے کہ یہ سب روٹین میں تھا اور قارئین ایسی خبریں اور تصویریں دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ جب کہ اس سے کچھ حاصل نہ تھا کہ مجرموں کی نشان دہی ہو جائے۔

چوتھے دن ایک غیر معمولی اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔

نہ جانے کس نے ایک گتے کا ڈبا ونود کھنہ کے دفتر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ کوئی خط بھی نہیں تھا۔ نہ گتے کے سادہ ڈبے پر بھیجنے والے نے اپنا نام پتا لکھا تھا۔ آفس کے گیٹ کیپر نے کہا کہ یہ ونود صاحب کو دے دو.... ونود نے گیٹ کیپر کو اس وقت برطرف کر دیا۔

"بے وقوف گدھے.... جانتے نہیں کہ زمانہ کیا ہے۔ ہر طرف دہشت گردی ہے۔ دینے والا اس میں ٹائم بم دے جائے تو تم لے کر مجھے پہنچا دو گے.... دفتر میں قدم رکھتے ہی بم پھٹ جاتا تو ہم سب کے پرخچے اڑ جاتے۔"

آفس میں سنسنی پھیل گئی اور سارا عملہ سبھی دفتر کے باہر راہ داری میں کھڑی ہو گئے۔ سجاتا داس نے بم ڈسپوزل والوں کو فون کیا۔ وہ فوراً پہنچ گئے۔ دفتر کے لوگ خوف و ہراس میں مبتلا رہے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ بم اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ ونود کھنہ اپنی گاڑی میں بیٹھا کہ سجاتا داس نے اسے ایک خط پہنچایا جو ڈبے کے اندر سے برآمد ہوا تھا اور اسے بھی بم ڈسپوزل والوں نے دیا تھا۔ خط کسی کاپی سے پھاڑ کے ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا گیا تھا۔

ونود کھنہ صاحب....!

ہم آپ کا سارا زیور واپس کر رہے ہیں جس کی مالیت آپ نے پولیس کو دو کروڑ دس لاکھ بتائی۔ یہ سارا زیور نقلی ہے۔ آپ کی حسین و جمیل پتنی نے ہمیں بے وقوف بنایا لیکن ہم پھر آئیں گے اور خرچہ آمد و رفت معہ سود وصول کریں گے۔ سود کیا ہو گا؟ یہ سود در سود ہو گا.... یعنی ہم ایک بلیو فلم بنائیں گے جس میں چھ ہیرو ہوں گے۔ دراز قد، مضبوط اور کسرتی بدن کے.... یہ جانتے ہیں کہ ہیروئن سے کیسا لطف اٹھایا جاتا ہے۔ ہیروئن پھر انہیں کبھی نہیں بھولتی ہے۔ آپ کی پتنی بھی نہیں بھولے گی۔ جو ہمارے ساتھ چالاک بنے اسے ایسا سبق سکھاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں بھولتا ہے۔

ونود کھنہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس خط کی پشت پر ایک نوٹ بھی لکھا ہوا تھا کہ آپ کی نمکین سکریٹری کو بھی ہیروئن بنائیں گے۔ ونود کھنہ نے خط کی عبارت صرف اپنی جان دل نواز سکریٹری کو سنائی اور خط جیب میں رکھ لیا.... بم ڈسپوزل والے.... علاقے کی پولیس والے.... اس کے دفتر والے.... سبھی نہیں رہے تھے۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا.... ونود صاحب کے گھر ڈاکو آئے تھے۔ انہیں نقلی سونے کا زیور دے کر

رخصت کر دیا۔ اللہ خیر کرے۔ بعض اوقات ہوشیاری مہنگی پڑجاتی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن ونود نے سخت بے عزتی محسوس کی۔۔۔ اب شامت اس کی پتنی اور دل نواز سکریٹری کی آنے والی تھی۔

اس کی پتنی سریتا نے کوئی چالاکی نہیں دکھائی تھی۔ اس نے ڈاکوؤں کو وہی زیور دیا تھا جو وہ میکے سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ سب ملا کے سو تولے کا زیور تھا۔ اس کے گھر والوں نے جو زیور دیا تھا وہ نقلی سونے کا نہیں تھا۔ نقلی سونے کا زیور وہ تھا جو سریتا اپنے گھر سے لائی تھی۔

ونود کھنہ اپنی گاڑی خود چلاتا ہوا گھر پہنچا تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس نے لات مار کر سریتا کے بیڈ روم کا دروازہ لات مار کر کھول دیا۔ وہ دھماکے کی آواز سن کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی وہ سمجھ کر شاید ڈکیت گھس آئے ہوں۔ اپنے پتی کو ناوقت دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔

”آپ! خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ونود کھنہ نے سارا زیور اس کے سامنے پھینک دیا۔ ورنہ اس کا جی چاہا تھا کہ پتنی کے منہ پر دے مارے۔ لیکن ضبط کر گیا۔ سریتا نے بستر پر گر کر بکھرنے والے زیور کو فوراً ہی پہچان لیا۔ اس نے خوشی اور حیرت سے کہا۔

”پولیس نے لوٹا ہوا کیا سارا زیور ڈاکوؤں سے برآمد کرلیا۔۔۔ او بھگوان! تیری بڑی دیا ہے۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ ڈاکو یہ سارا زیور ہمارے منہ پر جوتے کی طرح مارے گئے۔۔۔ کیوں کہ یہ سونا نہیں۔۔۔ پیتل ہے پیتل۔۔۔ سونے کی پالش والا۔“ سریتا کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ پست لہجے میں بولا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔۔۔ سونے کا یہ زیور نقلی ناممکن۔۔۔؟“

”میں وہ کہہ رہا ہوں جو کل سارا زمانہ کہے گا۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

پھر اس نے جیب سے ڈاکوؤں کا ارسال کردہ پرچا نکال کر سریتا کے سامنے غصے سے پھینک دیا۔

”اس میں جو لکھا ہوا وہ صاف صاف اور خوش خط بھی ہے۔ ایک ایک لفظ غور سے پڑھو۔ اس میں تمہارے باپ کی اصلیت ظاہر کی ہے۔“

سریتا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عبارت کو بار بار پڑھتی رہی۔ اس کے سینے میں کسی خنجر کی طرح اترتی رہی۔

”یہ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ پھر اس کے حلق میں گولا سا اٹک گیا۔ وہ ایک لفظ نہ بول سکی۔

”جا کے پوچھ اپنے باپ سے۔۔۔ ان کا ایک خاندان زرگر تھا نا؟ اس کی لاش بھی ملی ہے ہمارے آفس کے پچھواڑے سے۔۔۔ اس سے بنوایا ہو گا تمہارے باپ نے سونے کا نقلی زیور ہے۔۔۔ خوب الو بنایا۔۔۔؟“ وہ دہاڑا۔

سریتا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کے کانوں میں گرم گرم پگھلنے لگا۔ وہ ہمت کر کے بولی۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں میرے پاپا کو؟ کیا وہ ایسی گھٹیا حرکت کر سکتے ہیں؟ کیا آپ کو اندازہ نہیں؟“

”سمجھو تم۔۔۔ ایسی گھٹیا حرکت انہوں نے دس برس قبل کی تھی۔۔۔ جواب وہی دے سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے اعتماد کو دھوکا کیوں دیا تھا۔ آج انہوں نے اس سنار کا منہ بھی بند کر دیا ہمیشہ کے لیے۔۔۔ تا کہ بانس رہے نہ بجے بانسری۔“

”فضول بکواس مت کرو۔۔۔ اور اب تم میرے پاپا پر قتل کا الزام بھی لگا رہے ہو؟“ سریتا ہذیانی انداز سے چلائی۔

”اور کس پر لگاؤں؟ نہیں تھی اتنی حیثیت تو نہ دیتے۔۔۔ ہم نے کون سا سو تولے کا زیور مانگا تھا۔ ہمارے سامنے تو بڑے بڑے دعوے کیے تھے سعودی عرب کا مہروالا چوبیس قیراط کا سونا ہے۔“

اگر ونود کھنہ اس پر اور الزام کرتا تو اسے اتنا دکھ اور صدمہ نہ ہوتا۔ وہ رونے لگی۔

”جب وہ کسی کام سے دبئی اور سعودی عرب گئے تھے تو سونا لائے تھے۔ یہ سو فیصد سچ بات ہے۔“ ونود

نے اک دم سے چیخ کر نفرت اور غصے کی حالت میں کہا۔

"تو پھر کیا میں نے یہ بنوایا ہے یہ زیور جو ہر جگہ پہن کے شان سے پھرتی رہی تھی۔۔۔۔ جو تیری ہی تحویل میں رہتا تھا۔ ہم نے تو ایسا فراڈ نہیں کیا تھا۔۔۔۔ ہم ایسی گھٹیا حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔۔۔۔ میری بہن کا زیور اس کے پاس ہو گا۔ اپنے پتا جی سے کہہ کر سنار کو بلا کر اس کی تصدیق کرالیں۔ اگر وہ نقلی ملا تو مجھے شوٹ کر دینا۔" وہ دھڑ سے دروازہ بند کرتا باہر نکل گیا۔ سریتا کی عقل ماؤف تھی۔ اس کا ذہن کسی صورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے پاپا نے یہ جانتے ہوئے کہ افشائے راز کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کو سونا سو تولے کے زیورات جہیز میں دیے ہوں گے۔ یہ جھوٹ یا پروپیگنڈا ہرگز نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب پاپا اور ماتا جی دبئی گئے تھے تو واپسی پر کتنا خالص سونا لائے تھے۔ انہیں یہ سونا اپنی سمادھی بنانے کے لیے ہرگز نہیں تھا۔ وہ ان کی ایک ہی بیٹی تو تھی اور یہ سب اسی کے لیے تھا۔

اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ فون کر کے پاپا سے اس معاملے پر بات کر سکے؟ وہ سارا دن کمرے میں بند بستر پر دراز ہو کر روتی کروٹیں بدلتی رہی جیسے ڈکیت اسے درندگی سے روند، مسل اور بے حرمتی کر گئے ہوں۔ اگر شاید ایسا ہوتا بھی تو ان کی درندگی پر کچھ دیر رو کر سنبھل جاتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نہ بہتے۔ آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی تھی نہ صرف اس کا زیر جامہ بلکہ بلاؤز بھی اس طرح بھیگ کر چپک گیا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے پر گلاس سے بھرا پانی الٹ دیا ہو۔ بظاہر خاموش گھر کے اندر کون سا طوفان قوت پکڑ رہا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتی تھی۔ یہاں ذات برادری کی عزت کے معاملات اتنے حساس تھے کہ خونی رشتوں کو پیاسا بنا دیتے تھے۔ نفرت، غصہ، اشتعال اور حقارت اور بے عزتی ایک دوسرے کی کرتے ہوئے چوکتے نہیں تھے۔

شام تک اس نے خود پر قابو پانے اور اپنے حوصلے کو مجتمع کرنے کے لیے الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی فریج سے سوڈے کی بوتل نکال کر پیگ بنا کر دو بڑے پیگ بنا کر حلق سے اتارے۔ غسل خانے میں جا کر کپڑے اتار کر اپنا چہرہ دیکھا اور باتھ ٹب میں نیم گرم پانی میں جسم بھگوتی رہی جس سے اس نے اپنے دل اور جسم میں راحت سی محسوس کی۔ اس باتھ ٹب میں پہلے ونود اور وہ ایک دوسرے کو نہلاتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے اور ہم آغوش بھی ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اب آج وہ دہرایا نہیں جاتا تھا۔ اس نے باتھ ٹب سے نکل کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ترکش تولیا سے بدن خشک کیا اور پھر ٹالکم پوڈر چھڑکا۔ پھر اس نے زیر جامے اور کپڑے پہنے۔ گویا بال ہیئر ڈرائیر سے خشک کرنے کے بعد مقابلے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اب تک یہ خبر اس کے گھر پہنچا دی گئی ہو گی۔ شاید کوئی اس سے فون پر رابطہ کرے۔ پاپا سے زیادہ اسے اپنے بھائی کے ردعمل کا انتظار تھا جس کی شریک زندگی اس کی نند یعنی ونود کی بہن تھی۔ لیکن ایک بوجھل خاموشی تھی جو آنے والے طوفان کی خبر دے رہی تھی۔ جو بھی پیش آئے آخر اسے کسی نہ کسی قیمت پر اس کا سامنا کرنا تھا۔

طوفان سرشام ہی آ گیا۔ اسے خادمہ نے کمرے میں آ کر سرگوشی کے انداز میں مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ آپ کے پتا جی آئے ہیں۔" پہلا موقع تھا کہ خوش ہونے کے بجائے اس اطلاع پر سریتا کا دل بیٹھ گیا۔ عام طور پر پاپا آتے تھے تو پہلے بڑے بھائی کے پاس بیٹھتے تھے۔ صرف چائے پیتے تھے تو جاتے سمے اس سے کھڑے کھڑے مل لیتے تھے۔ اس سے پوچھتے تھے کہ خوش ہو نا؟ اور جواب سنے بغیر سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے۔ "ایشور تمہیں خوش رکھے۔۔۔۔" اور پلٹ جاتے تھے۔ بیٹی سے کمرے تک کمرے میں دیر تک بات کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ ماتا جی اس کی قائل نہیں تھیں کہ وہ بیٹی سے تنہائی میں گھنٹہ دو گھنٹہ مل سکے۔ حالات کی مفصل رپورٹ لیتی تھیں۔ یہ دور جدید تھا۔ خون تھا۔ لہٰذا اس امر کی چنداں نوبت نہیں

آتی تھی۔

آج سریتا کا دس منٹ کے بعد بلاوا آگیا۔ جب وہ نشست گاہ میں پہنچی تو عدالت لگی ہوئی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ مقدمے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ ایک طرف پاپا کے ساتھ ماتا جی تھیں۔ دوسری طرف سریتا کے ساس سسر تھے۔ ونود کھنہ نے فوراً "خود کو غیر حاضر شاید اس لیے رکھا تھا کہ وہ جذباتی نہ ہو جائے اور وہ جلد مشتعل ہو جاتا تھا۔ وہ تیسری طرف تھی اب فریقوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

پاپا نے کچھ دیر بعد گھمبیر خاموشی کو توڑا جو ہولناک بنی ہوئی تھی۔

"سریتا.... ! تمہارے تایا نے ایک بات کہی ہے.... جو بہت عجیب ہے.... تم کیا کہتی ہو؟"

میں نے تایا کو کبھی غلط نہیں کہا اور نہ اب کہہ سکتی ہوں۔" سریتا نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

" وہ زیور کہاں ہے....؟" انہوں نے سریتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

پھر ایک ملازمہ کو حکم دیا گیا کہ وہ چھوٹی بیگم کے کمرے میں رکھا ہوا زیور جو گتے کے ڈبے میں ہے اسے اٹھا لاؤ۔ اس کے واپس آنے تک ایک بوجھل سی خاموشی میں سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے اور خلا میں گھورتے رہے۔

پاپا نے اور پھر ماتا جی نے زیور کا یوں معائنہ کیا جیسے پولیس جائے وقوع پر قتل کے شواہد کا معائنہ کرتی ہے۔

جب پاپا نے ایک زیور کو دیکھ اور جانچ لیا تو مقدمہ شروع کیا۔

"یہ ڈاکو لے گئے تھے اور وہی ہمیں واپس کر گئے.... اس خط کے ساتھ۔"

"جی ہاں...." انہوں نے سر ہلایا "وہ میں نے دیکھا اور ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔"

"افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا نے دیکھا .... یہ گھر کی بات نہیں رہی۔" تایا بولے۔

چند لمحے سناٹا رہا۔ پاپا نے کانپتی آواز میں کہا۔

"زیور واقعی نقلی ہے۔ اس سے میں انکار نہیں کرتا .... دکھ مجھے یہ ہے کہ قصوروار آپ نے مجھے سمجھا...."

تائی خاموش کہاں رہتیں۔ انہوں نے پلٹ کر جواب دیا تو لہجہ تیز تھا۔

"پھر قصوروار ڈاکو ہی ہوئے کہ اصل زیور لے گئے اور راتوں رات ویسا ہی نقلی بنا کے ہمارے منہ پر مار گئے۔"

"بھابی! افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے پرکاش آنند کو بھی مار دیا ورنہ میں اس سے پوچھتا۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "بھگوان کا شکر ادا کرو کہ تمہارے خاندانی زرگر کے قتل کا الزام تم پر نہیں آ رہا۔ کم سے کم ایسا ہم نہیں کہہ سکتے لیکن کچھ لوگ کہیں گے۔"

"مجھے پرکاش آنند پر ایسی بے ایمانی کا الزام لگاتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے وہ میرے پتا جی کے زمانے سے ہی ہمارے گھر کا کام کرتا ہوا آ رہا ہے۔"

ماں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "آدمی کا دل ایک ہی بار بے ایمان ہوتا ہے۔ اس نے ساری کسر نکال لی۔ مع سود 'سود در سود وصول کر لیا۔"

"وہ ہوتا تو بتاتا...." پاپا نے ایک سرد آہ بھری۔ "پھر کوئی بات راز نہیں رہتی۔"

"یہی تو برا ہوا.... اب تو لوگ الزام دے رہے ہیں تمہیں اور وہی لوگ سنار کے قتل کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں کہ جب تمہارا یہ راز فاش ہونے لگا تو تم نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔" تایا نے خفگی سے کہا۔

"یہ لوگوں کی بات رہنے دیں بھائی صاحب! بتائیں کیا میں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟ کس کے لیے لایا تھا میں نے وہ سونا؟ میرے حالات اتنے خراب تو نہیں تھے کہ شادی کے وقت جو میں ریاکاری اور منافقت کرتا۔" پاپا کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"دیکھو.... ہم انہی لوگوں کے درمیان رہتے ہیں۔" تایا کہنے لگے۔ "ہمیں عزت دینے والے بھی یہی لوگ ہیں.... مزارعے ملازم اور ووٹر میں اور تم لندن جاتے ہیں تو ہماری بہو بیٹیاں ہمارے ساتھ تنگ و

چست لباس میں ملبوس ہوتی ہیں کہ ان کا جسم اور نشیب و فراز بے حجاب نیم عریاں اور بے لباس لگتی ہیں۔ مگر ہم یہاں کیا ایسا کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ اس بات سے انکار اس لیے نہیں کہ وہاں جو معاشرہ اور انداز ہیں اس میں عورت فطری حالت میں ہوتی ہے۔"

"آخر مجھے کیا ملا تعلقات بحال کر کے....؟" تایا جذباتی انداز میں بڑی سنجیدگی سے بولتے رہے۔" صرف یہ بے عزتی.... میں نے تو رشتہ استوار کیا تھا.... ٹوٹے دلوں کو جوڑا تھا.... میں خود آیا تھا تمہارے پاس بڑا ہونے کے باوجود میری عزت خاک میں مل گئی۔"

"بھائی صاحب! بلاوجہ آپ بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

اب تائی چپ کہاں رہتیں۔ پھر انہوں نے اپنی زبان کھولی۔

"ہم نہیں.... ہمارا بیٹا بد ظن ہے.... وہ ہم سے بھی خفا ہے۔ ہمیں الزام دیتا ہے.... ابھی اسے پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا اور آج اس کے آفس میں یہ تماشا ہوا ہے.... اس کی عزت خاک میں مل گئی۔"

"پھر ہم کیا کریں؟ کیا اس کے چرنوں میں گر کر اس سے معافی مانگیں؟" ماما نے پھر تیز لہجے میں کہا۔

"آپ کی معافی سے اس کی عزت بحال نہیں ہوگی.... اس نے کہا ہے۔ ہمیں اس کا جواب دینا ضروری ہے۔"

"کیا مطلب....؟" سریتا نے چونک کے پوچھا۔ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

"مطلب صاف ہے شریمتی جی....!" تائی نے تڑخ کے کہا۔ "بے عزتی ہماری ہوئی ہے۔ جب تک ہم بے عزتی کرنے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ عزت کیسے اور کیوں کر بحال ہوگی؟ تمہاری سمجھ میں یہ بات آرہی ہے؟"

کیا قدم اٹھانا چاہتی آپ بھابھی....! کھل کے کہیں۔" ماما نے مشتعل ہو کر کہا۔

"بات لمبی کرنے یا گھما پھرا کے کہنے کی عادت نہیں مجھے.... تم آئی ہو تو اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ۔ اس کا سامان ہم بعد میں بھیج دیں گے۔"

پاپا نے بگڑ کر برہمی سے کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ان کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

"بھائی صاحب.... آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ اگر جرم میرا ثابت ہو جائے تو.... تب بھی سزا سریتا کو کیوں؟"

بڑے بھائی ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے اور تپیدہ لہجے میں بولے۔

"غلطی کا خمیازہ کسی نہ کسی کو تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

جب کہ غلطی ہماری نہیں ہے تو پھر ہمیں نقصان کیوں اور کس لیے....؟" ماتا جی سے بھی برداشت نہ ہو سکا وہ بھی کھڑی ہو کر ہذیانی لہجے میں بولیں۔

"اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یہ اچھی طرح جان اور سمجھ لیں کہ پھر آگے کے نتائج کے لیے تیار رہیں بھابھی....!" اس کشیدہ ماحول کی فضا میں سریتا کے لیے عقل و ہوش سے کام لینا مشکل ہو گیا۔

"میں جانتی ہوں یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ آپ کے بیٹے کو محض بہانہ چاہیے۔ میری زبان نہ کھلوائیں تو اچھا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ بھی دنیا دیکھ رہی ہے۔ بچہ بچہ اس کی اصلیت سے باخبر ہے۔" ونود کھنہ کی ماں سے رہا نہیں گیا۔ وہ ہیجانی لہجے میں چیخ کر بولی۔

"کیا کیچڑ اچھال رہی ہے اور الزام لگا رہی ہے اپنے پتی پر.... تجھے شرم نہیں آرہی ہے؟

"شرم اسے نہیں آتی ہے تو مجھے کیوں آئے.... میں نے تو کسی کو بھی پولیٹیکل سکریٹری نہیں رکھا؟" سریتا نے تڑخ کے کہا۔ "اس نے اب تک ایک نہیں تین رکھے.... آفس میں وہ ان کے ساتھ جو پولیٹیکل گیم کرتا رہا سبھی جانتے ہیں۔"

ظاہر ہے ایسی جارحیت کے بعد مفاہمت کا امکان صفر ہو چکا تھا۔ سریتا کے پاس کہنے کو اور آئینے دکھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ گھر میں جو ملازمہ تھی وہ نوجوان بیٹی کی ماں تھی اور خود بھی نوجوان تھی۔ دونوں جنسی

کشش کی مالک تھیں۔ وہ کئی بار ان سے منہ کالا کر چکا تھا کرتا رہتا تھا۔ ماں نے کئی بار اس سے احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا پتی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ اگر اس نے رازافشاں کیا تو وہ اندر کرادے گا۔ وہ ڈرتی اس بات سے تھی کہ یہ پاپ ظاہر نہ ہو جائے۔ سریتا غلاظت کے دلدل میں ماں بیٹی کو ونود کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ کے جا بھی نہیں سکتی تھیں.... سریتا نے انہیں تسلی دی ہوئی تھی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچے گی کہ سانپ بھی مرجائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے.... یہ واقعہ پیش آگیا تھا۔

وہ ماتاجی اور پاپا کے ساتھ گھر چلی گئی۔ سریتا کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ نقلی سونے کے زیورات کا ڈبا کس نے ان کی گاڑی میں رکھا۔ سریتا کو یقین تھا کہ وہ اپنے پتی سے بات کرے گی تو معاملات کنٹرول میں آجائیں گے۔ انہوں نے دس برس ایک ساتھ گزارے تھے۔ ان کے درمیان تین بچے ایک پل کی طرح تھے جو دو کناروں کو ملاتے تھے۔ یہ پل کیسے توڑے جاسکتے تھے۔ چند دن بعد ونود خود ہی محسوس کرے گا کہ اس کی دوسری بیوی آجائے تب بھی بچوں کے لیے دوسری ماں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرے گا۔

لیکن حالات اک دم بگڑ گئے جس کی توقع اور امید نہ تھی۔ کیوں کہ ونود کو سمجھانے والوں سے زیادہ اکسانے اور جلتی پر تیل چھڑکنے والے زیادہ تھے۔ سریتا کے نزدیک ان میں اس کی محبوبہ دل نواز کم سکریٹری پیش پیش ہوگی جو ایک بدکار اور بدچلن اور کال گرل سے بھی بدتر تھی۔ دفتر میں جوان بن کر ونود کو ہر طرح سے خوش کرتی رہتی تھی۔ بلیو فلم کا کردار تھی۔ اگلے روز سریتا کے جہیز کا باقی ماندہ سامان آیا تو اس کے ساتھ بچے بھی آگئے۔ سریتا کے لیے یہ صدمہ غیر متوقع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بالآخر بچوں کی وجہ سے ہی معاملات راہ راست پر آجائیں گے۔ میاں بیوی الگ ہو جائیں تب بھی بچوں کا مسئلہ باقی رہتا ہے.... ان کی تحویل پر مقدمہ برسوں چلتے ہیں۔ ماں باپ میں سے کوئی بچوں سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں ہوتا ہے۔ پہلے وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اب ونود نے وہ درخت جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔

سریتا پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دن رات خون کے آنسو بہائے۔ اس نے اپنے ساتھ بھائی کا بسابسایا گھر اجڑتے دیکھا جو سورگ جیسا تھا۔ وٹے سٹے کے رشتوں میں ایسا کرنا خاندانی عزت اور وقار کا تقاضا بن جاتا ہے۔ بھائی اور بھابھی بہت خوش و خرم اور خواب ناک اور مثالی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ پاپا کی مخالفت کے باوجود ماں نے بہو کو واپس بھیج دیا۔ ماں نے بیٹے کے دل کی فریاد بھی نہیں سنی۔ یہ معاملہ انا اور انتقام کا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد بھابھی نے بھی وہی کیا جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔ دادا دادی کو سزا دینے کے لیے وہ اپنے بچے بھی ساتھ لے گئی۔ مصالحت کی ہر کوشش رائیگاں گئی یا ناکام بنادی گئی۔ دونوں طرف کے قانونی مشیروں نے طلاق نامے کے ساتھ اپنے بچوں پر حق سے دستبرداری کے کاغذات تیار کیے۔

جن کے گھر تباہ ہوئے دو خاندان ان کی عزت اور وقار پر قربان ہو گئے مگر انہوں نے سماجی اور اخلاق کے خلاف بغاوت کی ہمت نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو دستیاب وسائل کے ساتھ اپنے خاندان کے ساتھ آنند پور سے کہیں بھی جاسکتے تھے۔ جن کے پاس پیسا تھا ان کے لیے کوئی سرحد نہیں تھی۔ وہ کناڈا' امریکہ سے آسٹریلیا اور ملیشیا تک ہر جگہ آباد ہو کر اپنا مستقبل اور زندگی بنا رہے تھے۔

سریتا نے اپنے پتی کو دیکھا تھا۔ ایک پتنی سے زیادہ پتی کو قریب سے اور کون دیکھ سکتا تھا۔ رگ رگ اور فطرت' ذہنیت اور فضائل چھپے نہیں رہ پاتے ہیں.... پتی گھر کے اندر کی عورت اور باہر کی عورت کے درمیان ذاتی اخلاق کے دہرے معیار رکھتا تھا۔ وہ بڑا پاپی تھا۔ خود اس کا بھائی کیا کرتا تھا؟ یہ سریتا نہیں جانتی تھی مگر وہ بھی بہرحال اس معاشرے کا مرد تھا۔ پتنی کی محبت اور اس کے اعتماد کو پارہ پارہ کرتا تھا اور اس کے کرتوت کیا تھے بھگوان ہی جانتا تھا۔

دونوں کے بچوں نے باپ کی شفقت اور تربیت یا شخصیت کا کوئی روپ نہیں دیکھا جو بھی روپ ان کے سامنے وہ مثبت نہیں تھا۔ ایک مرتبہ سریتا کے بڑے بیٹے نے جو آٹھ برس کا تھا اس نے اپنی ماں سے کہا تھا۔

"ممی! جب میں اپنے کمرے سے بیدار ہو کر نکلا تو ڈیڈی ننگو تھے اور کرینہ (چودہ برس کی ملازمہ کی بیٹی) کو بھی وہ ننگو کر کے بستر پر کشتی لڑ رہے تھے۔ ایک روز وہ اس کی ماں کے ساتھ بھی ایسی حرکت کر رہے تھے۔"

وہ اسے دو ایک مرتبہ سوتا دیکھ کر کمرے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ چھٹی والے دن ایک دو بجے سوتا تھا۔ وہ سب بازار گئے ہوئے تھے سریتا کے پاپا ایک مہینے کے بعد دل کے برسوں کے عارضے کے مریض تھے۔ صدمہ برداشت نہ کر سکے تو اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ بلڈ پریشر جو پہلے قابو میں رہتا تھا ٹینشن سے بے قابو ہو گیا اور وہ اس سنسار سے رخصت ہوئے تو ایک کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزارنے والے کی طرح مطمئن نہ تھے۔ یہ ذہنی اذیت کرب اور صدمہ آخر کب تک سہتے۔

پرکاش آنند کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نقلی سونے کی شناخت کرائی بلکہ اس سے اعتراف جرم بھی کرلیا۔ دس برس بعد اسے اپنے جرم کی سزا بھی مل گئی۔ اس کی پتنی کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہوا کہ پتی کے بغیر وہ کب تک جی سکی۔



بلیو کیپ کے مہذب باوردی ڈرائیور نے دبئی سے آئے مسافر کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"سر! یہ آنند پور کا ایئرپورٹ خود یہاں کے صنعت کاروں نے بنایا ہے۔ یہ جمشید پور کا پہلا ایئرپورٹ ہے۔" سوٹ والے مسافر نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کسمسا کر کہا۔

"آج گرمی کچھ زیادہ ہے۔ لہٰذا اے سی چلاؤ۔ برا حال ہو رہا ہے۔"

"یس سر....!" اس نے جواب دیا اور پوچھا۔ "آنند پور میں آپ کہاں جائیں گے؟"

مسافر کے ساتھ بیٹھی ہوئی "سپنا" عمر رسیدہ عورت نے انگریزی میں تند لہجے میں جواب دیا۔

آنند پور پہنچ کر بتادیں گے۔ تمہیں اتنا تجسس کیوں ہے؟"

ڈرائیور نے اسے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے اس کے تلخ لہجے کا برا منائے بغیر انگریزی میں ہی شائستگی سے کہا۔

"اگر مجھے صحیح پتا معلوم ہو گا تو آپ کا وقت ضائع نہیں ہو گا میڈم....!" مسافر ہنسا اور اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آنند پور ایک قصبہ تھا جس پر شہر کا سا گمان ہوتا تھا جس میں دبئی گیا تھا۔" ڈرائیور بہت باتونی ہوتے ہیں۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ بولا۔

"یہ بہت پرانی ہو گی سر! غالباً" میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں.... پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ اس وقت جمشید پور کے لیے صرف پرانی بس چلتی تھی۔"

"اب آپ دیکھ لیں.... یہ بلیو کیپ ٹویوٹا کا بالکل نیا ماڈل ہے۔ اب آنند پور کے لوگ پیزا ہٹ، میکڈونلڈ اور کے ایف سی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بارلی کیو، شراب خانے اور اے ون ریسٹورنٹ جہاں لڑکے لڑکیاں اور جوڑے بھی آتے ہیں۔ اس پر دہلی کے کناٹ پیلس کا گمان ہوتا ہے۔ لوگ ٹیکسی میں جاتے اور واپس بھی آتے ہیں۔" عورت نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے ہم سفر سے دریافت کیا۔

آنند پور اب کتنی دور ہے۔ کتنی مسافت باقی ہے شوکی! کہیں پہنچتے پہنچتے رات تو نہیں ہو جائے گی؟"

"ہم پہنچ ہی گئے ہیں میڈم....!" ڈرائیور نے کہا۔ "پلیز! آپ پریشان نہ ہوں۔"

مسافر نے حیرانی سے اس صنعتی علاقے کو دیکھا جس میں کئی چھوٹے بڑے کارخانے وجود میں آچکے تھے۔ اس کے بعد نئی آبادی نظر آرہی تھی جس کی آغوش میں جدید طرز کے بنگلے اور کوٹھیاں نظر آرہی

تھیں اور کئی منزلہ مکانات بھی تھے۔
"یہ کرشن نگر اور ماڈل ٹاؤن اور اننت نگر ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔
"مگر یہ کالونیاں تو جمشید پور کے قریب تھیں؟ آنند پور میں نہیں؟"
"اب تو ہر جگہ ہے سر! جیسے موبائل فون اور کیبل ٹی وی.... سر! کیا آپ مجھے راستہ بتائیں گے؟"
"ہاں .... یہاں ایک پرکاش آنند زرگر کی دکان تھی۔" مسافر نے جواب دیا۔
"زرگر؟ سر! وہ کیا کام کرتے تھے؟" اس نے مسافر کی طرف گردن گھما کر دیکھا۔
سونے کے زیورات بناتا تھا' ان کی مرمت کرتا تھا اور کیا کرتا تھا.... جوئیلر تھا۔" مسافر نے جواب دیا۔
ڈرائیور نے ذہن پر زور دے کر کچھ دیر سوچا۔ پھر اس نے دوسرے لمحے کہا۔
"سر! ویسے تو میں آنند پور کا رہنے والا ہوں لیکن مجھے کسی جوئیلر سے معلوم کرنا پڑے گا۔"
"شوکی ڈارلنگ ....!" عورت نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "کس قدر دھول مٹی اڑ رہی ہے جیسے گرد و غبار کا طوفان آیا ہوا ہے؟"
"میری جان من .... ! تم دبئی میں نہیں ہوں۔ تم بہت جلد اس کی عادی ہو جاؤ گی اور ہونا پڑے گا۔ یہ ہندوستان ہے۔ آنند پور ہے۔ دہلی میں بھی ...."
گاڑی کو ایک قدیم جوئیلر کی شاندار دکان کے سامنے روک کر ڈرائیور اس دکان میں گھس گیا۔ دبئی سے آنے والے مسافر کا سن کر اس کا مالک ڈرائیور کے ساتھ آ گیا۔ مسافر نے گاڑی کا شیشہ اتار لیا۔
آنند پرکاش زرگر تو اب نہیں ہیں سر....!" اس نے کھڑکی کے قریب آ کر کہا۔ "ان کا قتل ہو گیا تھا گزشتہ برس...."
اشوک کے لیے حیرانی کے بعد یہ دوسرا صدمہ تھا جو بجلی کا جھٹکا بن کر لگا تھا۔ پھر اس نے افسردگی سے پوچھا۔
"ان کی پتنی.... کیا وہ زندہ ہیں....؟"

"جی نہیں ...." دکان دار نے نفی میں سر ہلایا۔ چھ مہینے پہلے وہ سورگ باش ہو گئیں .... کیا وہ آپ کے جاننے والے تھے؟" اشوک نے بے خیالی میں سر ہلایا۔ "جی ہاں یہی سمجھ لیں۔"
"میں سمجھا کہ آپ نے ان کی گڈولی کا ذکر سنا ہو گا کسی سے .... زیورات میں اب گڈولی ہے ہماری سر! آپ اندر تشریف لائیں۔"
"شکریہ .... ہم کسی دن ضرور آئیں گے۔ اب آپ ڈرائیور کو ان کا پتا سمجھا دیں جہاں پرکاش آنند رہتے تھے۔"
آئی ایم ساری سر! میں نے صرف ان کا نام سنا تھا ان کا.... ان کی رہائش کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم ہے۔" اشوک کو اچانک کچھ یاد آیا تو اس نے کہا۔
"اچھا ایک دیپک جنرل اسٹور تھا۔ وہ کہاں ہے۔ دراصل میں پندرہ بیس برس پہلے آیا تھا۔"
"وہاں تو میں آپ کو لے جا سکتا ہوں۔" ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "وہاں تو میں آپ کو لے جا سکتا ہوں بس پانچ منٹ کا راستہ ہے۔"
ایک بار پھر اشوک نے اپنے بھائی کی دکان میں قدم رکھا تو حالات کے ساتھ اس کے جذبات بھی بدل چکے تھے۔ اس وقت وہ ضرورت مند بن کے چھوٹے بھائی سے قرض مانگنے آیا تھا اور اسے فقیر کی طرح دھتکار دیا گیا تھا۔ آج وہ اس حیثیت میں تھا کہ کھڑے کھڑے اسٹور کو خرید لے۔
اشوک نے دیپک جنرل اسٹور کی جگہ نیا سائن بورڈ دیکھا جس پر دیپک ڈیپارٹمنٹل اسٹور لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پورے رہائشی گھر کو نئے سرے سے جدید انداز سے تعمیر کرنے کے بعد سامان سے بھر دیا تھا۔ اب وہاں کراکری' کٹلری اور الیکٹرانکس' ٹوائے شیلفس الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ جس سے دکان کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گیا تھا۔
دیپک خود کار شیشوں والے دروازے کے دائیں جانب ایک شیشے کے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ پورا اسٹور

ایئرکنڈیشنڈ تھا۔ اس میں تین سیلز مین لڑکیاں جو نیم عریاں لباس میں جو آج فیشن کے زمرے میں آتا تھا۔ ملبوس تھیں۔ وہ گاہکوں کی رہنمائی کررہی تھیں۔

دیپک نے بڑے بھائی کو تھوڑا سا غور کرنے کے بعد پہچان لیا اور اک دم سے اٹھا اور بھائی سے بڑی محبت اور گرم جوشی سے لپٹ گیا۔ اس کا بھائی بڑا بارعب اور پروقار اور صاحب حیثیت بھی لگ رہا تھا۔

''بھیا.... ! آپ اتنا عرصے بعد مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے سپنا دیکھ رہا ہوں.... آپ کو پتا ہو گا کہ اب پتا جی رہے اور نہ ہی ماتا جی....'' اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

''ہاں دیپک! معلوم ہے مجھے۔'' اس نے جواب دیا ''یہ تیری بھابھی ہے۔''

دیپک کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ اس نے اپنی بھابھی کو دیکھا جو کھلے گریبان اور بغیر آستینوں کی جرسی میں دیکھا۔ اجلی رنگت کی تھی۔ سینے کے بھرے بھرے فراز جھانک رہے تھے اور سڈول گداز اور عریاں بانہوں میں بڑی جاذبیت تھی جینز پہن رکھی تھی جن میں سڈول گوری گوری پنڈلیاں متوجہ کررہی تھیں۔ اس لباس میں وہ بے لباس دکھائی دی لیکن آج اس میں کوئی برائی نہ تھی۔ عورت کا فیشن تھا۔ اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ باہر نکلے تو جسم پر دھجی تک برداشت نہ کرے۔

''اچھا.... اچھا....'' دیپک نے اسے منافقانہ نظروں سے دیکھنے کے بعد خود کو سنبھال لیا۔ ''ہندی' اردو بول لیتی ہیں؟ بھابھی کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''کینیا کی.... انڈین ہیں مگر وہ وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے ماں باپ الہ آباد کے ہیں۔ تم نے گھر کو دکان بنا لیا ہے۔ اب رہائش کہاں ہے؟''

''چلو بھیا! میرے ساتھ چلو.... آپ کی بھرجائی بہت خوش ہوگی آپ سے مل کر.... خیر سے ہمارے بچے اب کالج میں پڑھ رہے ہیں.... آپ کے بچے....؟ وہ کیا آپ کے ساتھ نہیں آئے؟'' دیپک نے سوال کیا۔

''ہم کسی وجہ سے ساتھ نہیں لائے۔'' پتنی کے کچھ کہنے سے پہلے اشوک نے جھوٹ سے بات نبھادی۔

''ابھی رہیں گے ناوہ ایک دن تو؟ دیپک نے اپنی مرسڈیز کا الیکٹرونک لاک کھولا۔ ''ٹیکسی والے کی چھٹی کردو۔''

دیپک کی جدید وضع کی کوٹھی میں ماڈل ٹاؤن میں ہی سڑک کے کنارے تھی جہاں سے وہ کچھ دیر پہلے گزر گئے تھے۔ دیپک کی بیوی سابق محلے میں رہتی تھی۔ اس کے بھائی نے عزت سے کھیلا تو شادی کرنی پڑی تھی۔ اس کے ماں باپ کہاں تھے اشوک کو غرض نہ تھی۔ اب اصل حوالہ یہ تھا کہ دیپک ڈپارٹمنٹ کے مالک کا بھائی اپنی غیر ملکی پتنی کے ساتھ دبئی سے آیا تھا۔ ان کے رشتے میں دولت مندی قدرے مشترک تھی۔ خون کا رشتہ بھی برابری کی بنیاد پر تھا۔

اس نے دیپک کی بیوی کو دیکھا۔ آسودگی' فراغت اور شباب کی آخری منزل پر پہنچ کر اس کے جسم میں بڑا گداز اور دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ گو وہ فربہی مائل ہو گئی تھی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا۔ وہ جواں بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد دونوں بھائی نشست گاہ میں جاگتے رہے اور اپنے گزرے ہوئے وقت کی باتیں کرتے رہے۔ دیپک نے اپنے باپ کی اور پھر اپنی ماں کی موت کے افسوسناک واقعات کا ذکر کیا۔ گزر جانے والا وقت کسی سمادھی کے کتبے کی طرح ہوگیا تھا جس پر تاریخ دیہانت درج ہو۔ باقی سب یادوں کے شمشاد گھاٹ سمادھی میں بے نشان لمحے ہوتے ہیں۔

''بھیا جی.... ! یہ آپ نے کس سے شادی کرلی؟'' دیپک نے تاسف سے کہا۔

''کس سے کیا مطلب....؟'' اشوک نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ ''ایک عورت ہے یہ بھی تو....''

''عورت تو ہے مگر عمر میں آپ کی.... کافی بڑی لگتی ہے.... میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ بیس کی عمر زیادہ ہے۔ آپ آج بھی کیسے خوب صورت اور وجیہہ

ہیں۔ قصبہ میں کتنی لڑکیاں عورتیں دیوانی ہوتی تھیں۔ مرتی تھیں فیاضی سے مہربان ہو جاتی تھیں۔ پکے پھل کی طرح ٹپک پڑتی تھیں صرف ایک اشارے کی دیر ہوتی تھی.... آج بھی آپ کی شخصیت بڑی پرکشش ہے۔ برا نہ مانیں بھیا! آپ نے اس میں ایسی کون سی خوبی اور کشش دیکھی.... یہ کیا ہندوستانی عیسائی ہے؟ مسلمان بھی ایسی نہیں ہوتی ہے۔"

"نہیں دیپک....! اس کا باپ بھی سکھ تھا۔ وہ تقسیم سے پہلے ہی کینیا چلے گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک ہندو فیملی میں بیاہ کیا۔ بیٹی کا نام تو کلدیپ کور ہے .... مگر دھرم اس کا کچھ بھی نہیں.... نہ سکھ نہ ہندو' باہر چلتا ہے دیپک! اس کے لیے میرے ہندو دھرم کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں اصل کہانی سناتا ہوں۔ دراصل جب میں دبئی پہنچا تو بڑے مشکل حالات تھے۔ کیوں کہ جس شخص کے آسرے پر گیا تھا وہ مجھے ملا نہیں۔ اس کا نام مہندر رناتھ تھا۔ خیر میں نے ادھر ادھر کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کیے جو سب ہی کو حالات گردش میں کرنے پڑتے ہیں۔ مجھے تو کوئی خاص کام آتا نہیں تھا۔ میں نے مزدوری کی۔ پھر ڈرائیونگ لائسنس لے لیا۔ ایک کمپنی میں اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ ایک سکھ فیملی کرائے کی گاڑیاں چلاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ اس نے ٹیکسی دے دی۔ وہ بعد میں اپنی ہو گئی۔ سڑک پر ایک شخص میری گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا۔ مجھے تو ہو جاتی سزائے موت.... ادھر کوئی دیر نہیں لگتی۔ جان ایک ہی صورت میں بچ سکتی تھی کہ مرنے والے کی فیملی دیت قبول کرے.... وہ لاکھوں میں بنتی تھی۔ میں کہاں سے لاتا۔ اس وقت یہ عورت کلدیپ کور میرے کام آئی۔ اس حادثے سے قبل ایک رات وہ میرے کمرے میں آئی تو میں نے اسے ایسا خوش کیا کہ وہ مجھ پر مر مٹی۔ اس نے وارثوں کو دیت کی رقم ادا کی۔ میری ٹیکسی چھڑائی.... اور اس کے لیے مجھے اس سے شادی کرنی پڑی۔ اس نے کہا کہ میں ہندو دھرم قبول کر لیتی ہوں۔ میں نے اس کا نام کانتا رکھا.... لیکن یار وہ سب مجھے پھانسنے کے لیے تھا۔ وہ دل سے سکھ ہی رہی۔ ہم دونوں نے اپنا بیاہ رجسٹر کروا لیا۔

"اور آپ نے اس بڑھیا کی ہر بات اور شرائط مان لی؟"

"دیپک....! میں کیا کرتا.... ورنہ آنے والے جمعے یا اس سے اگلے جمعے کی نماز کے بعد میرا سر قلم کر دیا جاتا۔ جان بچانے کے لیے سب کچھ کرنا پڑا مجھے.... اب اس کا وہ قرضہ الگ ہے جو اس نے دیت کی ادائیگی کے لیے دیا تھا۔ اگر اسے طلاق دوں تو پانچ لاکھ درہم اس کے علاوہ.... میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بیاہ کے وقت میری عمر تھی چوبیس برس.... یہ خود کو چالیس برس کی بتاتی ہے۔"

"میرے خیال اور اندازے کے مطابق وہ اڑتالیس برس کی ہوگی۔ آپ سے دگنی عمر کی ہو گئی نا؟ شاید بچے اس لیے نہیں ہوئے نا؟"

"ہاں...." اشوک نے سر ہلایا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس عمر میں بھی یہ عورت کسی دوشیزہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں جو پارلرز ہیں ان میں اسی سو برس کی عمر کی عورت کو بھی لوشنز سے دوشیزہ بنا دیا جاتا ہے اور جسم بھی پرکشش' تناسب بھی.... اس کے علاوہ یہ عورت جانتی ہے کہ مرد کو کس طرح خوش کیا جاتا ہے۔ سچی بات تو ہے کہ وہاں لڑکیوں عورتوں سے تعلقات ہیں لیکن ان میں جیسی کوئی بات نہیں.... بڑی گرم جوش عورت ہے۔ لیکن وہ یہ بات زبان پر کیسے لاتا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "یہ عورت مرد کو خوش کرنے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔" پھر اس نے موضوع بدلا۔ "یہاں کی سنا.... آنند پور اچھا بھلا شہر ہو گیا ہے۔ مجھ سے تو راستے ہی پہچانے نہیں جا رہے.... یہاں ایک زمین دار تھے۔ چودھری فیملی.... نام ان کا بھول گیا۔ وہ پتا جی سے زیور بنواتے تھے۔"

"چودھری صاحب کا دیہانت ہو گیا۔" اس نے اپنا سر ہلایا۔ "ان کا ایک بیٹا ہے۔"

"ان کی ایک بیٹی بھی تو تھی....؟" اشوک نے کہا۔

"اس کے حسن کا بڑا چرچا تھا۔"

"ہاں.... بھائی کے گھر میں شادی کی تھی۔ پھر طلاق ہوگئی۔ ابھی بھی گھر ہی ہے.... جہاں زمین تھی۔"

اس کا بھائی نہ جانے کیا کچھ بتا رہا تھا لیکن اشوک کا ذہن پرانے وقتوں میں بھٹک رہا تھا۔ یادوں کی سنسان گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ اسے مدھوبالا یاد آ رہی تھی۔ نہر کا پل اور کنج یاد آ رہا تھا جس میں وہ ماں اور بیٹی کو لے جاتا تھا۔ شدید سردی میں برانڈی پلاتا اور اس کی مالش ان کے جسم پر کرتا تھا۔ یوں بھی وہ بہت گرم تھیں اور اس کا دل بہلاتی اور کسی بات سے انکاری نہیں ہوتی تھیں۔ کیا عمر تھی اس وقت نشو کی.... سترہ اٹھارہ برس .... آج پندرہ برس بعد وہ ہوگی پینتیس چھتیس برس کی .... یعنی اس کی ہم عمر.... کلدیپ کور ہوگئی، بچپن کی .... کہنے والے اسے پتنی کی جگہ ماں سمجھ لیتے تھے.... لیکن نشو کیسی ہوگی؟! اگر اسے طلاق ہو چکی ہے تو اسے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بیاہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ کلدیپ کور جائے میری بلا سے نرک میں.... یہاں وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ میں لوٹ کر دبئی نہ جاؤں۔ میری مالی حیثیت اب پہلے جیسی نہیں.... اگر میں اپنا سرمایہ دبئی سے یہاں منتقل کرالوں جو کہ مشکل نہیں مستقل رہ سکتا ہوں اور پھر بھائی جیسا اسٹور بھی کھول سکتا ہوں یا بیزاہٹ۔

وہ سونے کے لیے کمرے میں آیا تو کلدیپ کور بے لباسی کی حالت میں گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ اسی طرح ہر رات سوتی تھی۔ اس نے ایک ناقدانہ نظر اس کے سراپا اور نشیب و فراز پر اس طرح ڈالی جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہا ہو۔ چوں کہ وہ چھریرے اور متناسب بدن کی تھی۔ اجلا رسیلا بدن اور کسا کسا انگ انگ جو ستار کے تاروں کی طرح تھا۔ انگ انگ میں مستی ابلی پڑتی تھی۔ ایسی شادابیاں اور رعنائیاں تھیں کہ مردوں کے جذبات کو بھڑکا دیں۔ چہرے کے نقوش میں اتنی جاذبیت نہیں تھی جتنی جسم میں تھی۔ اس کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ رات کے آخری پہر میں سویا تو اس کے خواب میں نصف صدی پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلم "محل" چلتی رہی۔ مدھوبالا جھولے میں بیٹھی گا رہی تھی۔ لالٹین ہاتھ میں تھامے ویران حویلی میں گھوم رہی تھی۔ چاند جیسے روشن چہرے پر کالے بادلوں جیسے ریشمی چمکیلے بال بکھرائے.... لتا کی رس بھری آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ آئے گا.... آئے گا .... آئے گا.... آنے والا آئے گا۔

دوسرے دن صبح اشوک دوستوں سے ملنے نکل گیا۔ اس کی بیوی کلدیپ کور سو رہی تھی۔ دیپک کی بیوی رسوئی میں تھی۔ دیپک بھابھی سے دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھنے دروازے پر دستک دے کر دروازہ کھول کر داخل ہوا تو اس نے کلدیپ کور گہری نیند میں غرق پایا۔ اس کے بدن پر جو چادر تھی وہ فرش پر گری ہوئی تھی۔ وہ کسی بے نیام تلوار کی طرح پڑی تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک بڑے سکون، اطمینان اور غور سے دیکھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ بڑھیا بھابھی کا ایسا گداز اور پرشباب بدن لباس میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ نہ تو تناسب ڈھلے تھے اور نہ ہی سینے کے فراز.... کسی کنواری لڑکی کی طرح لگ رہی تھی۔ دیپک بھی اشوک سے کم نہیں تھا۔ وہ منہ کا ذائقہ بدلتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے اسٹور میں جو سیلز گرلز رکھی تھیں وہ مشروط .... اس نے ان کی دوشیزگی داغ دار کی اور یہ سلسلہ جاری رہتا تھا اور جاری تھا۔ اس کے علاوہ وہ لڑکیاں عورتیں جو بلیو فلموں کے کیسٹ اور سی ڈیز خریدنے آتی تھیں۔ اس نے ایک فلیٹ کو عشرت کدہ بنایا ہوا تھا۔

اس کے ذہن نے کلدیپ کور سے سرفراز ہونے کے بارے میں سوچا۔ اس وقت ناممکن اس لیے تھا کہ اس کی پتنی گھر میں موجود تھی۔ ملازمہ بھی ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کلدیپ کور کے ہونٹ بڑے گداز اور رسیلے تھے۔ گالوں میں جاذبیت اور دل کشی اس لیے تھی کہ وہ گورے گورے تھے۔ وہ بستر کے قریب اس لیے ہوگیا تھا کہ وہ گہری نیند میں غرق تھی اور سانسوں کے زیر و بم سے اس کا ابھرا ابھرا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس کے جی میں آ رہا تھا کہ کلدیپ کور کے چہرے پر جھک کر اپنے

ہونٹوں میں اس کے لبوں کی مٹھاس جذب کرلے۔ گالوں پر گرم گرم بوسوں کی بوچھار کردے.... پھر گردن، سینے اور جسم کے انگ انگ اور گوشوں سے ہونٹوں کو سیراب کردے۔ پھر اسے ایسا لگا کہ کہیں اس کی پتنی نہ آجائے۔ وہ جانے کے لیے مڑا تھا کہ اس کے کانوں میں سر بول اٹھا۔

"دیور جی....! آپ واپس کیوں جارہے ہیں؟ کیا مجھے چومنے کا ارادہ بدل دیا؟"

وہ اک دم سے اچھل پڑا۔ اس نے مڑ کے دیکھا تو کلدیپ کور کو کھڑے اور اسے پیاسی نظروں سے دیکھتے پایا۔ پھر چشم زدن میں جو ہوا اسے یقین نہ آیا۔ کلدیپ کور نے قریب آکر اس کے گردن میں اپنی بانہوں کے خنجر حمائل کرکے اس کے ہونٹوں میں اپنے لب پیوست کردیے۔ وہ جذباتی ہوتی گئی اور اس میں خود سپردگی بڑھتی گئی۔ اگر پتنی نہ ہوتی تو پھر وہ باہم پیوست ہوجاتا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے غیر محسوس انداز سے اسے الگ کیا۔

"میری پتنی رسوئی میں ہے۔" دیپک نے سرگوشی کی "میں پروگرام بناتا ہوں۔ پھر ہم دل کے سارے ارمان پورے کریں گے۔" پھر وہ کمرے سے نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد کلدیپ کور تیار ہوکر ناشتے کی میز پر آئی اور بولی۔

"میں تمہارا اسٹور دیکھنا چاہتی ہوں.... کیا تم دکھانا پسند کروگے دیور جی!"

"کیوں نہیں...." دیپک نے جواب دیا۔ "لیکن واپسی لنچ تک ہوگی۔ آپ بور تو نہیں ہوجائیں گی؟"

"صرف اسٹور ہی نہیں بلکہ تمہاری گاڑی میں پورا قصبہ دیکھنا چاہتی ہوں.... کیوں نرملا دیوی! تم بھی چلوگی؟"

"مجھے لنچ تیار کرنا ہے.... تم ان کے ساتھ چلی جاؤ.... ہم شام کو ڈنر پر چلیں گے۔" نرملا نے جواب دیا۔

دیپک اسے اپنے عشرت کدے پر لے آیا جہاں دونوں دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہوکر ان جانے راستے پر چل پڑے۔ کلدیپ کور اتنی گرم جوش، فیاض اور مہربان ہوگی دیپک کو اندازہ نہ تھا۔ وہسکی نے نشے اور لوتیت میں اضافہ کردیا۔

نرملا نے اپنی ملازمہ کسی بہانے چلتا کردیا۔ اس کے لڑکے کالج سے سہ پہر کے وقت آتے تھے۔ لنچ وہ کسی ہوٹل سے منگوا لیتی۔ اشوک کی معیت میں وقت گزارنے کے تصور نے اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑا دی۔ اس نے کھڑکی سے اشوک کو ٹیکسی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ایسا کیا بیڈ روم کا دروازہ پورا کھول دیا۔ کپڑے اور زیر جامے کرسی کی پشت پر ڈال کر ملحق غسل خانے میں جو قد آدم آئینہ تھا اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اشوک اسے پکارتا اور تلاش کرتا بیڈ روم میں آیا تو اس نے نرملا کو اپنے سواگت کے انتظار میں پایا۔ پھر دونوں بستر پر چلے گئے۔

"شوکی....؟" نرملا میٹھے لہجے میں بولی۔ "تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو نا؟ دیپک کا خیال ہے کہ اس نے میری دوشیزگی کو عورت میں اس نے ڈھالا ہے.... یہ غلط بات ہے نا؟"

"ہاں...." اشوک نے اس کے بالوں کو سہلایا۔ "اندھیرے میں اس نے تمہیں دبوچ لیا اور اتفاق سے تمہاری ماں آگئی تھی اور پھر تمہیں اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ ورنہ آج تم میری پتنی ہوتیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اتنے برسوں کے بعد تم مجھے کیسا محسوس کررہے ہو؟" نرملا نے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرکے پوچھا۔

"تم تین بچوں کی ماں ہوکر بھی بڑی پرکشش اور گداز ہوگئی ہو.... پہلے سے کہیں حسین۔" وہ اسے چومتے ہوئے بولا۔

"تم جب تک یہاں رہوگے ہم دونوں ایک دوسرے کو خوش کرتے رہیں گے؟" وہ بولی۔

اشوک کے لیے وقت پھر پندرہ برس پیچھے چلا گیا۔ اس وقت جب وہ اٹھارہ برس کا بھرپور نوجوان تھا جس کا دل پہلی بار نشو کو دیکھ کر ایسے دھڑکا تھا۔ جیسے ضدی بچہ مچل جاتا ہے۔ اک دم اس کے سامنے

مدھوبالا آ کھڑی ہوئی تھی جس کی ایک رسالے سے نکالی ہوئی تصویر وہ سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ دوست اور دوسرے لڑکے اس پر ہنستے تھے اسے دیکھو..... کس پر مرتا ہے جو خود مر چکی ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ مدھوبالا کا حسن اس کی نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اسے مدہوش اور مسحور کر دیتا تھا۔ اگر وہ آج کے دور میں ہوتی تو بولڈ نظر آتی اور حسن کی کرشمہ سازیاں واضح ہو جاتیں۔ نشو کے روپ میں ایک دن اچانک نظر آ گئی تھی جو اسے ایسا لگا جیسے سندر سا سپنا دیکھ رہا ہو۔

اشوک نے وہ فاصلہ پیدل ہی طے کیا تھا۔ کسی دشواری کے بغیر وہ نہر تک پہنچ گیا تھا۔ نہر بالکل وہیں تھی اور ایسی ہی تھی۔ اس میں بہنے والا گدلا پانی بھی وہی تھا۔ حد یہ کہ وہ پل بھی ایسا ہی تھا۔ آنند پور نے بڑی ترقی کی تھی۔ نئی سڑکیں اور جدید عمارتیں بھی بن گئی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ آگے نہر پر کہیں ایک نیا اور بہت چوڑا پل بھی بنا ہے جس پر سے رات دن کاریں اور بسیں گزرتی ہیں اور یہ پرانا پل متروک ہو گیا تھا۔ اس پر سے لوگ پیدل نہر کو عبور کرتے تھے یا کوئی سائیکل سوار گزر جاتا تھا۔ یہاں جیسے وقت کی نبض رک گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی کے گزر جانے والے پندرہ برس اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ جذبات کی شدت اسے آج پھر اسے ویسی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ جوانی جو شاید گزر گئی تھی اور پھر نوجوانی سے جیسے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی پریم کتھا میں کوئی وقفہ ہی نہیں آیا۔ اس کے لیے وہی پہلی پریم کہانی تھی جو آخری بھی بن گئی تھی اور آج پھر وہ وہیں تھا جہاں سے پریم کہانی نے جنم لیا تھا۔

وہ نہر کے پرانے پل جنگلے پر جھک کر نیچے سے گزرنے والے گدلے پانی کو دیکھنے لگا۔ ایک مشہور انگریزی کا دور تھا جو وقت گزرنے کی صحیح عکاسی کرتا تھا کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے۔ یہاں لگتا تھا کہ وہ پانی آج بھی بہہ رہا ہے۔ رواں دواں ہے۔ انجام سے آغاز کی طرف لوٹ جانے کا یہ تجربہ اپنے اندر ایک انوکھی سنسنی رکھتا تھا۔

اس کا یہ احساس مزید شدت اختیار کر گیا جب اس نے ایک گاڑی کو پل کے آغاز میں لانس بھائے نشیب کی طرف رکتا دیکھا..... یہ گاڑی وہی تھی..... اشوک کو یقین نہ آیا..... وہ نشو آج پندرہ برس کے بعد میں وہی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کے پاس جدید ترین ماڈل کی کار ہو گی۔ کچھ لوگ پرانی چیزوں اور یادوں کو دل و جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان سے گویا ایک ذہنی اور جذباتی وابستگی ہوتی ہے۔ کیا نشو کے لیے بھی اس کے ماضی کا ہر نقش ایک قیمتی سرمایہ تھا۔

وہ کیسے اندازہ کر سکتا تھا نشو نے آج بطور خاص یہ گاڑی نکالی تھی جو اس کے آں جہانی پاپا کی نشانی تھی۔ ذاتی استعمال کے لیے اس کے پاس ایک نہیں دو نئی کاریں تھیں۔ گزشتہ روز جب اس کی اشوک سے بات ہوئی تھی اس نے تب ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا وہ ایک بار پھر اس کی پریم کہانی کا پہلا منظر یاد دلائے گی۔ یوں جیسے کوئی پرانی تصویر میں قید لمحہ وقت کسی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتا برقع اس نے کسی وجہ اور بعض اوقات کسی نہ کسی مقصد کے لیے لے رکھا تھا لیکن یہ پرانا برقع اس کی پرانی چیزوں کے ساتھ آج بھی محفوظ تھا۔ اسے سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے رخصت کر دیا تھا مگر اس کی یادوں کو دل میں بسائے رکھا تھا۔ اس کے استعمال کی ہر چیز اس کے کمرے میں موجود تھی۔ پرانے کپڑے..... جوتے، کتابیں..... یہاں تک کہ پرانی گڑیاں اور کھلونے اور وہ جہیز جو گڑیا کی شادی پر گڈے والوں کو دیتی تھی۔

ایک اور بات اس کے لیے تعجب خیز تھی وہ یہ کہ..... کنج آج بھی موجود تھا۔ ان پندرہ برسوں میں وہ خستہ ہوا تھا اور نہ ہی اس کا نام و نشان مٹا تھا بلکہ اندر سے وہ کسی گھر کے کمرے کی طرح صاف ستھرا تھا۔ اس کے اندر کی فضا طرح طرح خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ کونے میں ایک چارپائی تھی جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کے چادر کی شکنیں گزرے لمحات کا فسانہ سنا رہی تھیں۔ فرش پر چارپائی کے نیچے چوڑیاں ٹوٹی

پڑی تھیں اور ایک ڈبیا پڑی تھی جس پر ایک جوڑے کی رنگین عریاں تصویر ہم آغوشی کی حالت میں اوپر چھپی ہوئی تھی۔ اس پر ہندی میں چھپا ہوا تھا.... دوست.... یہاں جوڑے آتے تھے اور وقت گزاری کر کے جاتے تھے۔ اب تو بدکاری نئی نسل میں حد سے بڑھ گئی تھی اور عام ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ انٹرنیٹ، بلیو فلمیں اور فلموں کے بولڈ مناظر تھے۔ اس نے پڑھا تھا کہ نئی نسل میں ناجائز بچے ہر روز سو سے زیادہ جنم لیتے ہیں۔ اب آج نشو سے وقت گزاری کر کے ماضی کی رنگین یادیں تازہ کر سکتا تھا۔ نرملا یوں تو روز ہی اسے سرفراز کرتی تھی۔ اس نے یہاں آنے کے بعد ایک روز بھی کللیپ کور سے دل بستگی نہیں تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ بیگانہ سی رہی۔

وہ ایک بار پھر برقع میں پل کے اوپر سے گزری جہاں وہی اشوک نیچے سے گزرتے پانی کو دیکھنے میں محو تھا۔ پہلے بھی نشو کا مقصد اپنی شناخت کو ظاہر نہ ہونے دینا تھا اور آج بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھے تو پہچان لے۔ آنند پور میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ وہ سخت پردہ کرتی تھیں۔ برقع اور چادر کے بغیر نہیں نکلتی تھیں لیکن ان میں آج برقع کا رواج تھا۔ اشوک ایک اشارے پر اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ ڈھلوان پر قدم جماتی نیچے کی طرف چلتی گئی جہاں پل کے نیچے نہر کے کنارے بڑی محفوظ پناہ فراہم کرتے تھے۔ وہ دونوں یہاں فائدہ اٹھاتے اور دل کے ارمان پورے کرتے تو کسی کی نظر میں نہیں آسکتے تھے۔

اشوک نے دودھیا چاندنی کے منجمد دریا میں ایک ہاتھ کو طلوع ہوتے دیکھا۔ آسمان تک پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک چاند اپنی روشنی پھیلا رہا تھا.... دوسرا برقعے کی سیاہی میں سے نشو کا چہرہ بن کے ابھرا اور اس کے دل کو روشن کر گیا۔ برقع میں اس کے دل کش سراپا اور نشیب و فراز کے سارے خدوخال اس طرح نمایاں ہو رہے تھے جیسے وہ صرف برقع میں ملبوس ہے۔

اشوک کی سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ جب وہ بے لباس آئی ہے اور برقع میں ملبوس ہے تو وہ یہاں کیوں اسے لے آئی ہے۔ کنج میں بھی جا سکتے تھے۔ اب کیا وہ برقع کو چادر کا کام لے گی؟ یہاں پر لمبی لمبی خود رو گھاس کا سبزہ تھا۔

”نشو جانی....؟“ اس نے بے اختیار پرجوش لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی؟“

”مجھے بھی یقین تھا کہ تم بھی یقیناً“ آؤ گے ہی آؤ گے....؟“ نشو نے تائیدی لہجے میں کہا۔

اشوک نے اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کی کاٹ کو صاف محسوس کر لیا۔ وہ پندرہ برس پہلے کے عہد و پیمان اور گزرے لمحات کا حوالہ دے رہی تھی۔

”میری جان نشو....! مجھے افسوس ہے کہ میں وچن دے کر نہ آسکا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”مگر مجھے کوئی افسوس یا شکایت نہیں ہے۔“ نشو نے کہا۔ ”تم نادم نہ ہو۔“

اشوک نے موضوع بدلا اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”تم آج بھی ویسی ہی لگتی ہو۔ ایک نوجوان دوشیزہ کی طرح۔“

”یعنی جیسی مدھوبالا.... جیسی فلم محل میں لگتی تھی۔“ نشو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تم نے ان پندرہ برسوں میں اپنے حسن و شباب، سراپا اور نشیب و فراز اور تناسب کو سنبھال کر رکھا۔ ڈھلنے اور متاثر ہونے نہیں دیا۔ تم سولہ برس کی دوشیزہ دکھائی دیتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اتنا وقت گزر گیا۔“

”یہ تم نے اندازہ کر ہی لیا ہو گا کہ کیسا گزرا....؟“ نشو بولی۔

”ہاں.... کچھ لوگوں سے معلوم ہوا اور کل تم سے فون پر بات ہوئی تو پتا چلا۔ تمہارا نمبر بڑی مشکل سے ملا تھا مگر تلاش سچی ہو تو بھگوان بھی مل جاتا ہے۔“

”تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کا تم سپنا دیکھتے تھے اور جس کی آرزو بھی تھی۔“

”سوائے تمہارے....“ اشوک نے جواب دیا۔ ”آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ مال و دولت، کوٹھی اور

کار۔۔۔"

"اور پتنی بھی۔۔۔ میں نے اسے کل دیکھا تھا تمہاری ساتھ۔"

"ہاں۔۔۔" اشوک چونکا۔ "وہ بس۔۔۔ ایک مجبوری تھی۔ وہ بہرحال تمہارا نعم البدل نہیں۔"

"نعم البدل کسے کہتے ہیں اشوک کمار عرف غوری۔۔۔ اس پر بھی کبھی غور کیا تم نے؟ کیا اس وقت کا نعم البدل ہو سکتا ہے جو خواب دیکھتے یا تعبیر کی جستجو میں گزر جاتا ہے۔ زندگی میں سب پانے کی لگن میں۔۔۔ آج میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں خالی برتن کی طرح ہوں۔"

"میں کل دبئی جا رہا ہوں۔۔۔ لیکن تم میرے ساتھ چلو۔۔۔ میں اپنی روانگی ملتوی کر سکتا ہوں۔" اشوک نے کہا۔

نشو نے اک دم سے برقع میں سے ریوالور نکال لیا جس کی نال پر سائیلنسر نصب تھا۔

"اب کچھ ملتوی نہیں ہو سکتا۔۔۔" نشو نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

اشوک کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ اس کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ وہ بہ مشکل بولا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟"

"اس پریم کہانی کا انجام۔۔۔" نشو ہنسی۔ اس کی ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ "ہر پریم کہانی میں یہی ہوتا ہے۔۔۔ فرہاد نے خود کو شیشہ مار کر ہلاک کر لیا۔۔۔ سوہنی کچے گھڑے پر دریا میں ڈوب گئی تھی۔ رومیو جولیٹ نے زہر کھا لیا تھا۔"

"ایشور کے لیے ہوش میں آؤ نشو۔۔۔" وہ ہذیانی لہجے میں چلایا۔ "یہ سب کیا ہے؟؟"

"میں حساب چکتا کر رہی ہوں معہ سود' در سود کے۔۔۔ کچھ اندازہ ہے کہ تمہیں کیا کیا اور کس کس خون کا حساب دینا ہے۔۔۔ وہ میں صرف زندہ تھی جو تمہیں مارنے کے لیے زندہ تھی۔۔۔ تم نے میری دوشیزگی کو داغ دار کر کے عورت بنا دیا اور داشتہ کی طرح مجھ سے دل بہلاتے رہے۔ سبز باغ دکھائے۔۔۔ اور تم نے کتنے

ادب سے۔۔۔!

شاعر' دل شاہجہانپوری زندگی کے آخری برسوں میں بہت بیمار رہے اور تقریباً چار برس تک متفرق امراض کا شکار رہے۔ صحت بہت خراب ہو گئی۔ ایک بار اتنے شدید بیمار ہوئے کہ زندگی کی امید نہ رہی۔ بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ایک بار جب ہوش آیا تو کچھ دوستوں نے مزاج پرسی کی۔ آپ کہنے لگے۔

"موت اور زندگی کے مابین جنگ ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ فتح کس کو ہوتی ہے۔" پھر اپنی یہ رباعی پڑھی۔

مہلت تو ہو' دنیا سے گزرنے کے لیے
فرصت تو ملے' قصد یہ کرنے والے
اے پیکر اجل' تو اسے مجبور نہ کر
تیار نہیں جو ابھی مرنے کے لیے

مار دیے۔ ان کا کوئی حساب ہے؟ تم نے سونے میں ملاوٹ کر کے باپ کو مارا' اپنی ماں کو مارا۔۔۔ پھر میرے پاپا کو مارا۔۔۔ میرے بچوں کا باپ تمہاری وجہ سے جدا کر دیا گیا۔۔۔ یہی تم نے میرے بھائی کے بچوں کے ساتھ کیا۔۔۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔؟" وہ وحشت سے چلایا۔

"ہاں۔۔۔ نہ گولی کچھ کرتی ہے نہ ریوالور کا قصور ہوتا ہے۔۔۔ خنجر خود کچھ بھی نہیں کرتا۔۔۔ قصوروار تو قاتل کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اتنے لوگ تم نے نہیں مارے مگر صرف اور صرف تمہاری وجہ سے مارے گئے۔" وہ ہذیانی انداز سے ہنسی۔ "تم تو سمجھ رہے ہو گی کہ میں اپنی پریم کہانی کا پھر سے آغاز کروں گی۔ انٹرول کے بعد۔۔۔ وہیں سے جہاں تم نے چھوڑا تھا۔"

اس نے ایک فائر کیا۔ اشوک منہ کے بل گر گیا۔ خون اس کے دل سے ابل رہا تھا اور بہہ کر نہر کے گدلے پانی میں شامل ہو رہا تھا۔ نشو نے اس کے دل

میں ایک اور سوراخ کردیا۔
"میں تمہاری پریم کہانی کو وہیں ختم کرنے آئی تھی جہاں سے یہ شروع ہوئی تھی۔"
اس نے اطمینان سے ریوالور کو اپنے دستی بیگ میں ڈالا اور چڑھائی پر قدم جماتی اپنی کار تک آگئی۔ اس کی گاڑی پرانے راستے پر سے ہوتی ہوئی ونود لاج کی طرف مڑگئی۔ اس نے لائٹس روشن نہیں کی۔ اسے راستہ دکھانے کے لیے چاندنی بھی تھی۔ اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی۔ کہ آج کی رات ونود کی پرسنل سکریٹری جو داشتہ بھی تھی اور جس نے اس کا گھر اور بچوں کا مستقبل تباہ کیا تھا وہ ونود کی کوٹھی میں داد عیش دے رہی ہے۔ ونود کو مٹھی میں رکھنے کے لیے اپنی بہنوں کو بھی اس سے آلودہ کراتی رہتی ہے۔

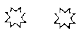


پل کے نیچے پڑی لاش کی جیب میں ایک موبائل فون کی گھنٹی صبح تک چلاتی رہی۔ کلدیپ کور کے لیے اشوک کا یوں بتائے بغیر اچانک کہیں چلے جانا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ انہیں دبئی جانے کے لیے دہلی سے فلائٹ پکڑنی تھی۔
بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے گھڑی دیکھ کر اور دیپک کی آغوش سے نکل کر کہا۔
"اوکے ڈارلنگ.... !بس اب میں چلتی ہوں۔ اب میں تمہارے بھائی کا مزید انتظار نہیں کرسکتی.... تم نے جو مجھے اتنا خوش کیا اسے کبھی بھول نہیں سکتی.... واپس جب آؤں گی تمہارے ساتھ وقت گزاروں گی.... میں اس لیے جارہی ہوں کہ کہیں میری فلائٹ نہ نکل جائے۔ بھابھی میکے سے آئے تو نمسکار کہہ دینا.... اشوک بعد میں آجائے بعد میں.... نہیں آتا ہے تو نرک میں جائے میری طرف سے...." پھر اس نے دیپک کے گلے میں باہیں حمائل کرکے ایک طویل بوسہ لیا۔
دیپک اس وقت تک کلدیپ کور کو دیکھتا رہا جب تک اس کی ٹیکسی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

اس نے سوچا کیا عورت تھی۔ واقعی مرد کو خوش کرنا جانتی ہے۔ بڑی مہارت اور تجربہ بھی ہے۔ اس نے نشاط انگیز لمحات میں بتایا تھا کہ جب وہ تیرہ برس کی تھی تب سے اس کی زندگی میں نوجوان لڑکے اور شادی شدہ مرد آتے رہے۔



نشو نے اپنی کار قدرے دور اور کوٹھی کے عقب میں کھڑی کی۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ سے دستانے نکال کر پہنے.... پھر وہ عقبی راستے سے دیوار پر چڑھ کر سبزہ زار پر کود گئی۔ جس کمرے میں روشنی ہورہی تھی اس کا راستہ وہ جانتی تھی۔ اس وقت سے جب وہ سریتا اور دلہن بن کر ونود کھنہ کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔
اس نے ریوالور کے دستے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کے ریوالور میں چار گولیاں تھیں۔ دو گولیوں پر ونود کا نام .... "دو گولیوں پر اس کی سکریٹری **سمیتا** کا ...."
جب اس نے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھما کر کھولا تو کمرا روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ دونوں فطری حالت میں باہم پیوست تھے۔ ہنس رہے تھے۔ اس کی سکریٹری ونود سے کہہ رہی تھی۔
"میری سب سے چھوٹی بہن جو بارہ برس کی ہے وہ گزشتہ اتوار سیانی ہوگئی ہے۔ تم جمشید پور کا فلیٹ میرے نام کردو تو اسے تمہاری سیوا کے لیے...."
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ تڑپ کر ونود کی آغوش سے نکلی۔ "یہ کون مسلم عورت...."
پھر نشو نے دو گولیاں سکریٹری کے.... دو گولیاں ونود کو داغ دیں۔ جب دونوں خون میں اشنان کرکے سنسار سے چلے گئے۔ تب اس نے ونود کے منہ پر اپنی قوت یک جا کرکے ریوالور دے مارا۔ تھوک کر نکل آئی۔ خونی پریم کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔



پس ایجاد

ابو ضیاء اقبال

کسی بھی شے کی ایجاد ایک بڑا کام ہے اور اس ایجاد کی حفاظت اس سے بھی بڑا کارنامہ۔ اس ایجاد کے لیے انٹر نیشنل سطح پر جاسوسی اور سازش کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ جرمن سیکرٹ سروس کے بہترین دماغ اس کی چوری کے لیے کوشاں تھے تو برٹش سیکرٹ سروس والے اس کی حفاظت کے لیے سرگرداں

اس کہانی کو پڑھ کر آپ قہقہ لگانے پر مجبور ہوجائیں گے

وہ 86ء کا موسم خزاں تھا' جب ہیری چیلنج قلعوں اور باغات کے شہر کلوک برگ پہنچا تھا اور ایک رات کے پچھلے پہر اسے بوری میں بند کر کے جھیل ٹاچن کے ٹھٹھرے ہوئے پانی میں پھینک دیا گیا تھا' ایک ہفتہ قبل اکہرے بدن کا تیس سالہ ہیری ایک کیس کو نپٹا کر قاہرہ میں آرام کررہا تھا کہ اسے نیو یارک سے کیبل ملا۔ "پیارے بیٹے' آرام طلبی کا لبادہ اتار کر زبروٹانیا کے دارالحکومت میں فوراً" پہنچو اور ہماری موکلہ سے گرینڈ ہوٹل میں ملو۔ وہ برطانوی ہے' نام ایما کنگس مل ہے۔ وہ پریشان ہے کہ اس کا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا پاپا ایک اوپیرا سنگر کے پیچھے پاگل ہورہا ہے۔ وہ ایک معروف موجد ہے۔ میں ایک بہت بڑی رقم کی بو سونگھ رہا ہوں۔ غفلت نہ کرنا۔ تمہارا بے حد چاہنے والا باپ' دی چیلنج انٹرنیشنل ڈی ٹیکٹو ایجنسی۔"

منگل کی شام کو ہیری بارش سے بھیگی ہوئی سڑکوں سے گزر کر شہر کے وسط میں واقع ہوٹل گرینڈ امپریل پہنچا۔ ہوٹل کے ماحول میں قدامت پرستی کی جھلک تھی۔ وسیع لابی میں اندر زینے پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ باہر اور کمروں کی دیواروں پر بھی رنگین نقش و نگار تھے۔ اس قسم کے مہنگے ہوٹل ہیری کے مزاج کے مطابق نہیں تھے' لیکن وہ وہاں ٹھہرنے پر مجبور تھا۔

کاؤنٹر پر رجسٹر میں اپنے نام کا اندراج کرتے ہوئے اس نے استقبالیہ کلرک سے اپنی موکلہ کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ ایما کنگس مل نام کی کوئی خاتون اس ہوٹل میں نہیں



ٹھہری ہوئی ہے، نہ ہی اس نے آنے سے پہلے کمرا ایک کرایا تھا۔ کلرک نے البتہ ایک چٹ اسے تھمادی کہ یہ اسے دینے کے لیے دی گئی ہے۔ چٹ پر نفاست سے یہ تحریر تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی دیر سے آئے، مسز جارج اولیور سے اس کے کمرے میں مل لے۔ ہیری کے پوچھنے پر استقبالیہ کلرک نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا کہ خاتون کا کمرا سب سے بالائی منزل پر ہے۔ اس نے کمرا نمبر معلوم کیا اور زینے طے کر کے اوپر گیا۔ کمرا کشادہ تھا، لیکن فضا میں یاسیت سی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مسز جارج اولیور اس کے تصور کے برعکس سرخ بالوں والی بہت خوب صورت، نوجوان لڑکی تھی۔ ہیری کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جھٹ دروازہ بند کر لیا اور قدرے جذباتیت کا مظاہرہ کر بیٹھی پھر فوراً ہی سنبھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ ہیری کی حیرانی دیدنی تھی۔

"میں کبھی کبھی نہ جانے کیوں بہک سی جاتی ہوں۔" مسز جارج خفت سے بولی۔

"کیا مطلب میڈم!" ہیری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنا عورت پن بھول جاتی ہوں۔" مسز جارج نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "فادر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ میری پرورش بن ماں کے گھریلو ماحول میں ایک غیر حاضر دماغ سائنس داں کے ساتھ رہتے ہوئی ہوئی ہے۔"

"تم ایما کنگس مل ہو؟" ہیری نے تجسس سے کہا اور اس کے کہے بغیر بھاری بھر کم کشن پر بیٹھ گیا۔

"تم جیسا خوب صورت اور دلکش شخص سراغ رساں کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ کہہ گئی، پھر جلدی سے بولی۔ "اوہ! میں یہ کس رو میں کہہ گئی! دراصل جو میرے ذہن میں آتا ہے، بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ میرے ناولوں میں تو یہ ٹھیک رہتا ہے، لیکن روز مرہ زندگی میں...."

"مسز جارج اولیور نے بہترین ناول لکھے ہیں۔" ہیری نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن.... کیا.... میرا مطلب ہے مسز جارج اولیور تم ہی ہو؟"

"میں جس طرح کے جذباتی ناول لکھتی ہوں، ان کے لیے قلمی نام ہی مناسب ہے۔ ایک کنواری لڑکی کے کے لیے یہ سب کچھ لکھنا قطعی درست نہیں ہے۔" ایما نے کہا۔ "لیکن تم تو دقیانوسی مصنفوں کو پسند کرتے ہو گے۔"

"سنو مس کنگس مل!" ہیری نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں قاہرہ سے طویل فاصلہ طے کر کے یہاں ادبی گفتگو کرنے نہیں آیا ہوں۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ایما جلدی سے بولی۔ "ایک پیالی چائے پینے کی زحمت کرو گے؟"

"نہیں۔" ہیری نے منہ پھلا کر کہا۔

"بہت بہتر.... کیونکہ اس وقت روم سروس بھی بند ہو چکی ہے۔" ایما دبیز چرمی کرسی میں دھنستی ہوئی بولی۔ "بائی دا وے، تمہارے آتے ہی میں نے جس والہانہ پن کا اظہار کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میں محض خوشی سے بے قابو ہو گئی تھی۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرو۔"

"نہیں کروں گا۔" ہیری نے یقین دہانی کے انداز میں کہا۔ "پرائیویٹ سراغ رساں ایک ڈاکٹر یا پادری جیسا ہی ہوتا ہے۔"

ایما قہقہہ لگا کر بولی۔ "میں تمہیں اس زاویے سے نہیں دیکھتی۔"

"بہرحال مطلب کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کہ ہماری ایجنسی سے تمہیں کیا کام لینا ہے؟"

"کیا یہ کوئی بڑی ایجنسی ہے؟"

"صرف میرے والد اور میں۔ بس یہ ہے ہی ہے کل ایجنسی۔"

"بڑے اکھڑ مزاج ہیں تمہارے والد۔ گو میں نے صرف بذریعہ کیبل ہی ان سے رابطہ قائم کیا، لیکن ان کے مزاج کا اندازہ ہو گیا۔"

"تم ان کے بارے میں یہ کہہ سکتی ہو۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

”جتنا کہ میں نے سوچا تھا اس سے کہیں زیادہ سنگین نکلا۔ میں فادر کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئی۔ اپنے فلمی نام سے کمرا لیا تاکہ اصل نام سے کوئی اسکینڈل نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ بات اتنی سی نہیں جسے ایک بوڑھے آدمی کی لغزش یا حماقت سمجھا جائے۔“

”پھر کیا ہے، کس قسم کی ہے؟“

ایما آواز کو دبا کر بولی۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ معاملہ انٹر نیشنل سازش اور جاسوسی کا ہے۔ اگر میں تمہیں صرف ہیری کہوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں ایما۔“ ہیری نے بھی نام کے تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا۔

”جس طرح تم نے میرے نام کا تلفظ ادا کیا ہے، اس سے مجھے بہت لطف آرہا ہے۔ اس انداز میں مردانگی ہے، امریکی انداز تکلم کی جھلک ہے۔ اف! میں پھر بھٹک گئی۔“ ایما نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم فادر کا کام جانتے ہو؟“

یہاں آنے سے پہلے ہیری نے قاہرہ میں آرتھر کنگس مل کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ ”وہ ایک بہت کامیاب موجد ہیں۔ گزشتہ برسوں میں انہوں نے چند قابل ذکر چیزیں متعارف کرائی ہیں، مثلاً ”کنگس مل ریپڈ فائر مشین گن“، کنگس مل پوائزن گیس بم اور.....“

”ہاں، تم میرے فادر کو اچھی طرح جانتے ہو۔“ ایما نے جھرجھری لے کر کہا۔ ”تم یقیناً“ کسی کا بھی نام تباہ کن اور جان لیوا چیزوں سے وابستہ ہونے کو اچھا نہیں سمجھو گے۔“

”کیا ان کی کسی نئی ایجاد کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“ ہیری نے تجاہل سے پوچھا۔

ایما نے اپنا خوب صورت سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ یہی بات ہے، انہوں نے حال ہی میں کنگس مل فلائنگ تارپیڈو مکمل کیا ہے۔ یہ اتنا خطرناک ہتھیار ہے کہ انگلینڈ میں بڑے بڑے فوجی دماغ چکرا گئے ہیں۔ تین ہفتے پہلے.....

افسوس صد افسوس، فادر اپنی لیبارٹری کو چھوڑ چھاڑ کر ایک..... ایک عورت کے پیچھے نکل گئے۔ وہ اوپیرا سنگر یا ایسی ہی کوئی شے ہے۔ خاصی خوب صورت اور گداز بدن ہے۔“

”للی ہوپ تو نہیں؟“ ہیری بول پڑا۔

”ہاں۔“ ایما اچھل پڑی۔ ”لیکن تم نے کیسے جانا؟ یا پھر یہ کہ فادر کی احمقانہ حرکتوں کی خبر چہار دانگ پھیل چکی ہے اور قاہرہ میں تم تک بھی پہنچ گئی؟“

”اسٹیشن سے یہاں تک آتے ہوئے میں نے راستے میں للی ہوپ کے بے شمار پوسٹر دیکھے تھے۔“ ہیری نے سرسری انداز میں کہا۔ ”مجھے خیال گزرا کہ یہاں اس کے گانے کے پروگرام ہو رہے ہیں۔“

”تم اس عورت کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟“

”الجزائر میں اس سے ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔“

”میرے خیال میں اس کی عمر اچھی خاصی ہے۔“

”میری ہم عمر ہوگی، تیس سال کی۔“

”اچھا! پھر تو.....“

”وہ تمہارے والد کے اس اڑنے والے تارپیڈو کے بارے میں نقشے، خاکے وغیرہ.....“ ہیری نے اس کے پھر بھٹکتے ہوئے ذہن کو روک لیا۔ ”اس وقت وہ سب کہاں ہیں؟“

”تم نے مسئلے کا بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔“ ایما سسکیاں لینے والے انداز میں بولی۔ ”فادر نقشوں کا واحد سیٹ اور تارپیڈو کا ماڈل اپنے ساتھ یہاں لے آئے تھے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہوں نے حفاظت کے لیے ایسا کیا تھا، لیکن اب میرا خیال بدل رہا ہے۔“

”یہاں آنے کے بعد تم اپنے والد سے ملیں؟“

”نہیں، میں ان کے سامنے نہیں آئی، لیکن ان کی نگرانی کر رہی ہوں۔ چہرے پر بھاری نقاب ڈالے ان کے ہوٹل ”پرنس او ٹو پلازہ“ کے سامنے کھڑی رہی ہوں۔ ان کا پیچھا کیا ہے۔ ان کی بیشتر شامیں جھیل ٹاچن کے مقابل رائل کیسینو میں گزرتی ہیں۔ وہ عورت مستقل ان کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ بہت زیادہ شیمپین پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ نقشے اور ماڈل کو خطرہ لاحق ہے؟“

ایما نے آنکھیں جھکا کے کہا۔ ”مجھے اعتراف کرنا ہے ہیری کہ میں ہوٹل میں فادر کے کمرے میں چوروں کی طرح داخل ہوئی تھی۔ وہاں نقشوں اور ماڈل کا نام ونشان نہیں تھا۔“

”ہو سکتا ہے انہوں نے ان چیزوں کو کہیں چھپا دیا ہو یا ہوٹل کے سیف میں رکھوا دیا ہو۔“

”یہ ممکن ہے‘ لیکن دو روز ہوئے رولینڈ فلیٹ وے کے یہاں آنے سے مجھے شبہ گزرا کہ دال میں کالا ہے۔“

”ہاں.... وہ برٹش سیکرٹ سروس کا بڑا گھاگ ایجنٹ ہے۔“

”اسے حلیہ بدلنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ وہ بے چارے فادر پر نظر رکھنے کے لیے ہر شام کسی بھروپ میں کیسینو آتا ہے۔“

”اور تم اسے پہچان لیتی ہو۔ وہ کیسے؟“

”اپنی آنکھوں‘ ذہن اور انداز کی مدد سے۔“ ایما نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں اسے نظروں میں تولتی رہتی ہوں‘ اس کی حرکات و سکنات پر توجہ دیتی ہوں اور پھر.... میں رائٹر ہوں۔“

”بہت خوب!“ ہیری کھڑا ہو گیا۔ ”میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔“

”کیا تم فادر کو ان کی حماقت کے نتائج سے بچا سکتے ہو؟“ ایما کے لہجے میں التجا تھی۔ ”تمہیں نہ صرف انہیں اس عورت کے چنگل سے نکالنا ہے‘ بلکہ ان کے نقشے اور ماڈل کا بھی تحفظ کرنا ہے۔“

”یقیناً“ یہ میں یہ دونوں کام کر سکتا ہوں۔“ ہیری نے جواب دیا۔

”معاوضے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”نہیں ہوگا‘ لیکن ایجنسی کو رقم کی ضرورت ہے۔“



”رائل کیسینو“ کی پر شکوہ عمارت ٹاچن جھیل کے ساتھ پانی کی سطح سے دو سو فٹ بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ بارش اس کی سرخ ٹائل کی چھت پر طبلہ بجا رہی تھی۔ ہیری اس کے سامنے ٹیکسی سے اترا اور کرایہ ادا کر کے دوڑ کر ماربل کے ٹیرس پر پہنچ گیا۔ کشادہ دروازہ کھلا تھا اور نصف رات گزرنے کے باوجود اندر جگمگاتی روشنیوں نے دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔ شوخ نقش و نگار سے مزین دیواروں اور خوش نما قالینوں سے آراستہ وسیع ہال میں سو کے لگ بھگ افراد تھے۔ عورتیں اور مرد سب ہی تعیش پسندی اور خودنمائی کے نمونے تھے۔ چار رولیٹ مشینوں پر ہار جیت کا کھیل جاری تھا۔ ہیری نے دروازے میں رک کر سگریٹ سلگائی اور گہری نظریں حاضرین پر دوڑانے لگا۔ جلد ہی اس کی مشاق نگاہوں نے رولینڈ فلیٹ وے کو جا لیا۔ وہ گرگ باراں دیدہ برطانوی سیکرٹ ایجنٹ ہندوستانی مہاراجہ کے روپ میں ایک چمکتے ہوئے صوفے پر براجمان تھا اور قریب ترین رولیٹ مشین کی طرف بظاہر لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا۔

ہیری کو اس مشین کے گرد ہجوم میں سرخ بالوں والی للی ہوپ نظر آ گئی۔ اس نے سفید سلک کا جدید لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں کا جوڑا سا بنا رکھا تھا اور ان میں ہیرے دمک رہے تھے۔ ہیری جانتا تھا کہ وہ نقلی ہیں۔ اس کا وزن پہلے سے بڑھا ہوا لگتا تھا‘ لیکن اس کی رعنائی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا شخص ملتجی انداز میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ کمزور بدن کا‘ دراز قد اور ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ تیز روشنی میں اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی نظر آ رہی تھی۔ جھکی ہوئی موچھوں نے اس کے چہرے کو بے کسی کی تصویر بنا رکھا تھا۔ للی بے زاری سے اس کی سرگوشی سنتی رہی‘ پھر سر ہلا کر جانے لگی۔ اس شخص نے ساتھ جانا چاہا‘ لیکن للی نے کچھ کہا اور وہ رک گیا۔ ہیری جان گیا کہ وہ آرتھر کنگسں ل تھا‘ ہر چند کہ اس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ للی ہجوم میں راستہ

تی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہیری نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور اسے پھینک کر للی کے پیچھے ہو لیا۔

ٹیرس پر للی اپنے تقریباً ہم عمر شخص کے ساتھ کھڑی گڑگڑا کر کہہ رہی تھی۔ "نہیں فلپ..... پلیز ایسا مت کرو۔"

اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "مجھے مت روکو للی۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اپنی ساری پونجی ہار چکا ہوں۔" اس نے پستول کی نال کنپٹی سے لگالی۔

"لیکن میں بہ آسانی تمہیں قرض دے سکتی ہوں۔" للی نے اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ پکڑلیا۔

"نہیں میں عورت سے پیسے نہیں لوں گا۔" فلپ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پستول بدستور اس کی کنپٹی پر تھا۔

"ٹھہرو!" ہیری دہاڑا اور لپک کر ان دونوں کے قریب گیا۔ "یہاں خودکشی نہیں ہوگی۔"

للی اس کی طرف گھوم کر التجا سے بولی۔ "پلیز میری مدد کرو تم جو کوئی بھی ہو۔"

ہیری نے فلپ کی کلائی مضبوطی سے پکڑلی اور کہا۔ "رقم کی خاطر اپنی جان نہیں دینا چاہیے یہ کوئی....." الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس کے کان کے قریب ایک سخت ضرب لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ تیورا کر گرا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔



ہیری ہوش میں آیا تو تاچن جھیل میں تھا۔ کم از کم اس کا یہ ہی خیال تھا کہ وہ وہاں ہے۔ وہ کینوس کی بوری میں بند تھا اور آہستہ آہستہ پانی کی تہ میں بیٹھتا جارہا تھا۔ زنجیر کی جھنکار سنائی دے رہی تھی، جس سے غالباً بوری کا منہ بند کیا گیا تھا۔

"بے وقوف!" اس نے خود کو مخاطب کیا۔ "کتنی آسانی سے للی کے جال میں آگیا۔" اس نے جیکٹ کی جیب سے قلم تراش نکالا، جسے وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا اور اس کی نوک سے بوری کو پھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سرد لہریں بھی بوری سے گزر کر جسم کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پورے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی اور تنگ جگہ ہونے کی وجہ سے قلم تراش بھی تیزی سے کام نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ بوری میں اتنا شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ باہر نکل سکے۔ یخ پانی اس کا خون منجمد کیے دے رہا تھا، تاہم اس نے اوپر اٹھ کر سرپانی سے نکالا تو جھلملاتی روشنی کی فٹ بال جیسی کسی شے پر نظر پڑی۔ اسے خیال آیا کہ وہ چاند نہیں ہو سکتا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند اتنا قریب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال ہوا میں سانس لے کر اس کے حواس قدرے بحال ہوئے۔

"آب دوز نہیں، تاہم اچھی چیز نظر آرہی ہے۔" آواز آئی۔

"لورنیزو!" ہیری نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ "صورت حال کو دیکھتے ہوئے پورے بل کا تقاضا نہیں کروں گا۔" کوئی دو گز کے فاصلے پر کشتی میں بیٹھے ہوئے شعبدہ گر لورنیزو نے کہا۔ وہ شعبدہ دکھانے والوں کے مخصوص سیاہ لمبے کوٹ میں ملبوس تھا اور اسی طرز کا ہیٹ لگائے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی، جس کی گول چمنی ہیری کو چاند جیسی شے نظر آئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "کیا تمہیں مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہو رہی؟"

"مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم شہر میں آچکے ہو۔" ہیری کشتی کی سمت تیرتے ہوئے بولا۔ کشتی میں بیٹھ کر اس نے کہا۔ "میں نے ایک دیوار پر پوسٹر دیکھا تھا۔ تم میجسٹک تھیٹر میں شو دکھا رہے ہو۔ للی ہوپ بھی یہیں جلوے دکھانے آئی ہوئی ہے۔"

"ہاں..... وہ رائل تھیٹر میں لوگوں کی جیبیں ہلکی کرے گی۔" لورنیزو نے ہاتھ نیچے لے جا کر برانڈی کی بوتل اور دو گلاس اٹھائے اور ایک گلاس بھر کر ہیری کو

دیا۔
ہیری نے گلاس سے چسکی لے کر کہا۔ ”یقیناً“ اسی نے مجھے بوری میں بند کرا کے پانی میں پھنکوایا یا خود پھینک دیا۔ یہ ٹاچن جھیل ہی ہے نا؟“
”یہ ہی ہوا ہے پیارے۔“ لورنیزو نے کہا۔ ”ان دونوں نے مل کر تمہیں ٹیرس سے پانی میں اچھال دیا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ ٹاچن جھیل ہی ہے۔“
”اور تم عین وقت پر یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ ہیری نے گلاس سے گھونٹ بھرا۔
”اپنی باطنی طاقت سے میں نے تصور میں دیکھا کہ تم ایک صندوق میں بند ہو اور وہ اس جھیل میں غرق ہونے کو ہے۔ چنانچہ میں کشتی میں یہاں پہنچ گیا۔“ لورنیزو نے لہک کر کہا۔
”مذاق مت کرو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔“ ہیری نے منہ بنایا۔ ”تم نے انہیں، مجھے بوری میں بند کرتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو شور کیوں نہیں مچایا؟“
”میں اس وقت ایسا نہیں کر سکتا تھا۔“ لورنیزو نے سنجیدگی اختیار کرلی۔ ”اس میں کچھ مصلحت تھی جو میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا۔ یہ کشتی میں بڑی مشکلوں سے کرائے پرلی ہے۔“
”میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں لورنیزو۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ میرے گیارہ سالہ کیریئر میں یہ پہلا موقع ہے کہ انجانے میں میری جان کو لالے پڑ گئے تھے۔“ ہیری نے گہری آواز میں کہا۔



تیسرے روز دوپہر تک سورج پوری توانائی سے چمکنے لگا تھا۔ بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ بارش زدہ سڑکیں خشک ہو کر حدت دے رہی تھیں۔ البتہ ہوا خوش گوار تھی۔ لب سڑک فیشن ایبل کیفے ناش کی ایک میز پر لورنیزو سیاہ پہاڑوں کی طرف رخ کیے کافی کے گھونٹ کے ساتھ کش لگا رہا تھا۔ ہیری آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”میں نے تھوڑا بہت معلوم کرلیا ہے۔“
”تم نے معلوم کرلیا کہ وہ خوب صورت قطالا کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟“ لورنیزو نے دور دکھائی دینے والے پہاڑوں پر نگاہیں جمائے کہا۔
ہیری اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان پہاڑوں میں کوئی رہائشی جگہ ہوگی؟“
”بالکل ہے۔“ لورنیزو نے پہاڑوں پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”وہاں مسطح جگہ پر بیرن واگن ہیم نے ولا بنا رکھا ہے۔ یہاں سب اسے بد طینت بڈھا کہتے ہیں۔ وہ چھیاسی سال کا ہے، لیکن افواہ ہے کہ قرب و جوار کی شاید ہی کوئی جوان لڑکی اس کی ہوس پرستی سے بچی ہو۔ تمہاری دشمن جاں اسی کے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔“
”اسے دیکھ رہے ہو؟“ اچانک ہیری نے سڑک کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ خانہ بدوشوں کے حلیے میں ایک شخص بڑا سا اکارڈین بجاتا ہوا جارہا تھا۔ اس پر کپڑے کا بنا ہوا بندر تھا۔ ہیری نے بتایا کہ وہ برطانوی سیکرٹ سروس کا ایجنٹ رولینڈ فلیٹ وے ہے۔
”یہ یہاں کیا کررہا ہے؟“ لورنیزو نے پوچھا۔
”یہ پہلے کسی اور غرض سے یہاں وارد ہوا تھا، مگر اب میرا پیچھا کرتا پھر رہا ہے۔“ ہیری نے کہا اور پھر لورنیزو کو ہیری نے تفصیل بتائی۔
”اگر یہ تمہارا پیچھا کررہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے نقشے اور ماڈل کا پتا نہیں چل سکا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔“ لورنیزو نے کہا۔
”میں نے اسے پہاڑوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔“ ہیری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر للی، بیرن کے ولا میں ٹھہری ہوئی ہے تو اس نے نقشے اور ماڈل وہیں چھپا رکھے ہیں۔“
”ولا ایک طرح سے خطرناک مجرموں کی خفیہ پناہ گاہ ہے۔“ لورنیزو بولا۔ ”اس میں پرپیچ راہداریاں اور تہ خانے ہیں، کوٹھریاں ہیں، قدیم اور جدید اسلحے کا ذخیرہ! اور دنیا بھر کی چیزیں ہیں۔ ماڈل اور نقشے کیسے ہاتھ لگ سکتے ہیں؟ اور پھر تم وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ للی

کے قبضے میں ہیں؟ آرتھر نے وہ اسے کیوں دے دیے ہوں گے؟ وہ اس کے پاس کیوں نہیں ہو سکتے؟؟"
"یہ میرا قیاس ہے اور اس قیاس کی معقول وجہ ہے۔" ہیری نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق جرمنی کی سیکریٹ سروس کا اسمارٹ ایجنٹ فرز لیوزر یہاں آرہا ہے یا پہنچ چکا ہوگا۔ للی، جرمنوں کے لیے کام کررہی ہے۔ وہ نقشے اور ماڈل فرز کو فروخت کردے گی۔ اس نے وہ آرتھر سے چرالیے ہوں گے یا ہتھیا لیے ہوں گے۔ میں کسی طرح اس بڈھے بیرن کے ولا میں جانا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی طریقہ سوچو۔"
"سوچنا کیا ہے۔ دی گریٹ لورنیزو، میجی شیئن آف دی ورلڈ کے ذہن سے کیا چیز بعید ہے۔" لورنیزو نے آگے پیچھے جھولتے ہوئے کہا۔ "ذرا انتظار کرو، ولا میں کاسٹیوم شو ہونے والا ہے۔ میں تمہیں اس کا دعوت نامہ اور رابن ہڈ کا سٹیوم لادوں گا۔ مزے سے ولا میں چلے جانا۔"
"دعوت نامہ کیسے لوگے؟" ہیری نے اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ آخر میں یہاں اپنے فن کے جوہر دکھا رہا ہوں۔ ایسے پروگرام کے لیے دو چار دعوت نامے لے لینا کیا بڑی بات ہے؟"

☆ ☆ ☆

ہال میں مختلف حلیوں میں دو سو سے کم مہمان نہیں تھے۔ رابن ہڈ بنے ہوئے ہیری نے دروازے میں کھڑے بٹلر کو دعوت نامہ دکھاتے ہوئے ہال پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ بحری قزاق اور بادشاہ تھے، ملکائیں اور شہزادیاں تھیں، تین قلوپطرائیں، پانچ جادوگرنیاں تھیں، پانچ شیطان بھی تھے۔ جون آف آرک، حوا اور ملکہ سبا تھی۔ للی، سلومی کے کاسٹیوم میں ایک طرف کھڑی وائسرائے ولنگٹن سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ ہیری اسے پہچان گیا۔ وہی فلپ تھا جس نے خودکشی کا ڈراما رچایا تھا۔ ہیری خاموشی سے ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
"ایسا ناممکن مت سمجھو، جیسا کہ نظر آتا ہے۔" فلپ کہہ رہا تھا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ یہاں دو مرتبہ آچکا ہے۔ نقشے اور ماڈل اس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔"
"کیا تم سمجھتے ہو ایک سیکرٹ ایجنٹ ہمارے لیے اتنا ہی خطرناک ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"ہاں۔۔۔ لیوزر کے آنے سے پہلے اگر وہ چیزیں اس کے قبضے میں چلی گئیں تب کیا ہوگا؟" وائسرائے ولنگٹن نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔
"ہاہاہاہا۔۔۔" للی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "رولینڈ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ بڈھا گدھ بیرن ان چیزوں کی نگرانی کررہا ہے۔"
"چلو یہ تو ہوا، لیکن ہم ہنری سے کیسے پیچھا چھڑا سکیں گے؟ وہ تو زندہ پھر رہا ہے۔" فلپ نے بے چینی سے کہا۔
"ہنری نہیں، ہیری۔" للی نے تصحیح کی اور نہ جانے کس خیال میں گم ہوگئی، پھر "رابن ہڈ" کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "آہا! کیا ہی کہنے! اس کاسٹیوم میں کیسے بچ رہے ہو ہیری ڈیر!"
"تم سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی للی ڈیئر۔" ہیری نے ترکی بہ ترکی کہا۔
"ہاں۔۔۔ ہماری ملاقاتیں ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔ معاف کرنا فلپ ڈارلنگ۔" للی نے کہتے ہوئے ہیری کا بازو تھاما اور بغلی دروازے کی طرف بڑھی۔ "تم نے شاید فلپ کو یہ کہتے ہوئے سن لیا ہوگا کہ تمہیں ڈبونے سے پہلے ہم نے تمہارے ہاتھ پیر کیوں نہیں باندھ دیے۔ شاید وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت بے وقوف اور جذباتی عورت بن گئی تھی۔ دراصل میں تیونس کی ان حسین راتوں کو نہیں بھولی تھی۔" وہ ٹیرس پر جا کھڑے ہوئے۔
"الجزائر میں تم نے مجھے اذیت دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"
"واقعی؟ لیکن اب تم تو زندہ ہو۔ میں اپنی قسمت کو

کوستی ہوں ہیری کہ ہم دونوں مخالف کیمپوں میں ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟"

"تمہارے چال بازیاں کرتے رہنے تک ایسا ہی رہے گا۔"

"یہ تم نے بڑی سخت بات کہہ دی ہے۔"

"نرم الفاظ میں بھی کہی جا سکتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں تمہارے لیے' یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ مجھ جیسی خداداد آواز رکھنے والی' سازشوں کی دنیا میں کیسے آ گئی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ ایسا کیوں ہے۔"

"سمت بتاؤ۔"

ہیری نے اس کے دوسرے بازو کی کلائی پر کھڑا ہاتھ مارا اور چھوٹا سا پستول فرش پر گر گیا۔ ہیری نے کلائی مروڑ دی۔

"ہیری.... اف.... چھوڑو۔" وہ کراہی۔

ہیری نے کلائی چھوڑ دی۔ للی بڑبڑاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کلائی کو سہلانے لگی۔ اچانک وہ ہاتھ اسکرٹ کے اندر لے گئی اور فولادی پنجہ نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے ہیری کے منہ پر جماتی' اس نے اس کی خوب صورت ٹھوڑی پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر چاروں شانے چت گر گئی۔ اس کے حرکت میں آنے سے پہلے ہیری ہال میں چلا گیا۔



ٹرین روانہ ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ ہیری کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا تھا اور لورنیزو پلیٹ فارم پر تھا۔ لورنیزو کہہ رہا تھا۔ "تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں ماڈل اور نقشے کیسے مل گئے۔"

"تمہاری مدد سے۔" ہیری نے ہنس کر کہا۔ "تم نے اس بوالہوس بڈھے بیرن کے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تھا نا۔ وہ اپنا بیشتر وقت کہاں گزارتا ہو گا؟"

"اپنے بیڈ پر اور کہاں۔" لورنیزو نے بھی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"للی نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ چیزیں اس کی نگرانی میں تھیں۔ اس نے نقشے اور ماڈل بیرن کے بیڈ کے نیچے چھپا رکھے تھے۔ میں کھڑکی کے راستے بیڈ روم میں داخل ہوا تو حسب توقع بڈھا داد عیش دے رہا تھا۔ میں نے لڑکی کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور بیڈ کے نیچے سے مطلوبہ چیزیں نکال لیں۔ بڈھا اتنا خوف زدہ تھا کہ کچھ نہ کر سکا۔" ہیری نے مزے لے کر بتایا۔

"اب آرتھر اپنی چیزیں لے کر انگلینڈ جا چکا ہے تو کیا وہ اپنی ایجاد کا باقاعدہ اعلان کرے گا؟" لورنیزو نے پوچھا۔

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے اور گورنمنٹ کیا قدم اٹھاتی ہے۔ مجھے اپنی ایجنسی کے مفاد سے واسطہ ہے' یعنی اپنی موکلہ ایما یا اس کے باپ سے ملنے والی فیس سے۔" ہیری نے کہا۔ "دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کیس میں میرا واسطہ اپنی اس حریف عورت سے پڑا جسے میں پہلے بھی شکست دے چکا تھا۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" لورنیزو ٹھوڑی کھجاتا ہوا بولا۔ "رولینڈ کا مشن کیا تھا؟ وہ یہاں انگلینڈ سے کیوں آیا تھا؟"

"غالباً اس لیے کہ برٹش حکومت آرتھر کی ایجاد کا تحفظ چاہتی تھی۔ وہ اپنی چیزیں یہاں لے آیا تو لازمی طور پر ان کے ہتھیائے جانے کا خدشہ تھا۔" ہیری نے کہا۔

"اب تم واپس جا کر اپنی موکلہ سے فیس وصول کرو گے؟ یہاں تم نے اسے کیوں نہیں پکڑا؟"

"وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی.... بہرحال...."

گاڑی کی وسل میں اس کی آواز دب گئی۔ پہیوں نے جنبش کی اور معاً ساتھ کے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں ایما نمودار ہوئی۔ وہ لورنیزو اور ہیری دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہوئی ہاتھ ہلانے لگی۔

✲ ✲

کونپل

اسرار احمد

طلاق کے بعد میاں، بیوی کا رشتہ تو ٹوٹتا ہے لیکن بچوں پر بہت بری گزرتی ہے۔ بچے جو کونپل کی طرح نازک ہوتے ہیں' تن تنہا خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ انہیں نہ ماں کی شفقت ملتی ہے نہ باپ کی محبت۔ ان کے اندر نفرت بھر جاتی ہے اور وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو شفقت اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایسے ہی بروکن فیملی کے بچے کی کہانی۔ ایک معاشرتی المیہ



میں نے پہلی مرتبہ لیری کو اس وقت دیکھا، جب وہ ایک پرانی رولز رائس کار میں ایک دراز قامت سنہری زلفوں والی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ نشے کی وجہ سے لیری کی حالت ابتر تھی۔ لڑکی اس سے بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ جائے تاکہ وہ خود ڈرائیو کر کے اسے گھر پہنچا سکے۔ لڑکی کی آنکھوں میں اتنی چمک تھی کہ میں بھی مجبور ہو کر لیری کو سہارا دینے کے بہانے کار کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں چلے تو گئے لیکن میں لڑکی کی سبز آنکھیں دیر تک نہیں بلکہ مہینوں تک فراموش نہ کر سکا۔ وہ آنکھیں آج بھی مجھے یاد آتی ہیں۔

۔۔۔اور جب میں نے دوسری مرتبہ لیری کو دیکھا تو وہ قلاش ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سائیکل بھی نہ تھی، اور جب سائیکل نہیں تھی تو کسی سنہری یا سیاہ زلفوں والی کا ساتھ ہونا بھی کوئی جواز نہ رکھتا تھا۔ وہ اس وقت بھی نشے کی حالت میں تھا لیکن اس نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا تھا۔

میں نے اسے کھانا کھلایا کیونکہ وہ بھوکا تھا اور اپنے پیکٹ کے آدھے سگریٹ اس کی جیب میں ڈال دیے۔ پھر اس سے میری اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں اسے قرض دیتا رہا، مجھے نہ جانے کیوں اس سے انسیت سی ہو گئی تھی۔ وہ تھا دلکش، اس کے لمبے قد پر کسی بھی قسم کا لباس بہت جچتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہمیشہ بے چینی نظر آتی تھی اور ہونٹ مسکرانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ پھر میں اس سے ایک عرصے تک نہیں مل سکا۔ وہ اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔

کئی روز بعد، ایک دن جب آسمان پر سفید بادل کا کوئی چیتھڑا تک نہیں تھا اور دھوپ شہر کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی تو مجھے ایک خطیر رقم کا چیک ملا جو لیری نے بھیجا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو میں وقتاً فوقتاً اسے دیتا رہا تھا۔ چیک کے ساتھ ایک خط منسلک تھا جس کے مطابق وہ ڈارلنا کلب میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے وہاں آنے کی بھی دعوت دی تھی۔ ڈارلنا کلب میں اس کی ملازمت کا مطلب صاف تھا کہ وہ جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔

جونامی ایک شخص اس کلب کا مالک تھا۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو یہ سن کر بڑا قلق ہوا کہ جو نے اس سبز آنکھوں والی سے شادی کر لی ہے جو ایک روز لیری کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ بے چارے لیری کی محبت دولت کی صلیب پر چڑھ گئی ہے۔

پھر ایک روز جب سوتے سوتے اچانک ہی میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک سائے کو اپنے بیڈ کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس سائے کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”میری پتلون کی جیب میں بارہ ڈالر ہوں گے، گھڑی شیلف پر رکھی ہوئی ہے، بس یہی کچھ ہے، اسی پر قناعت کرو اور بھاگ جاؤ، مجھے نیند آرہی ہے۔“

سائے نے کھڑکی کے قریب جا کر بڑے محتاط انداز سے باہر جھانکا اور پھر جب وہ پلٹا تو میں نے اسے پہچان لیا، وہ لیری تھا۔

اس کی حالت بہت ابتر تھی۔ چہرے پر تھکن کے آثار تھے، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے ایک کالر پر گلاب کا پھول نظر آرہا تھا۔

اس نے بیٹھ کر ریوالور گود میں رکھ لیا۔ چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا اور پھر ریوالور اس کی جیب میں چلا گیا۔ ”تم مجھے برڈو تک لے جاؤ گے۔ مجھے جلد از جلد شہر سے نکلنا ہے کیونکہ وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“

”کیا ہوا۔ تفصیلات تو بتاؤ۔“ میں نے آنکھیں ملنے سے فارغ ہو کر پوچھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ میرے اپارٹمنٹ میں کس طرح داخل ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے اپارٹمنٹ کا قفل بہت معمولی سا ہے جو تار سے بھی کھل جاتا ہے۔

”تم نے اومارا کی گمشدگی کے بارے میں خبریں

پی لی ہوں گی؟''
''ہاں۔مگراس کا تم سے کیا تعلق؟''
''میرے پاس یہاں بیٹھ کر باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔اگر میں نے وقت ضائع کیا تو فرار نہیں ہوسکوں گا۔میرا خیال ہے کہ میں ابھی تک ان کی نظروں میں نہیں آسکا ہوں۔''
میں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ ایک گلاس ہی پی لے اور ساتھ ہی باتھ روب پہن لیا۔
''میں اور اومارا بہت قریبی دوست تھے۔'' وہ اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔''ہم دونوں کے فرائض میں ہیمی پوائنٹ سے منشیات لانے کا کام تھا۔ہم ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے تھے جس کی اب جو سے شادی ہوگئی ہے۔اومارا نے ایک لکھ پتی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔وہ جنرل ویڈ کی اکلوتی بیٹی ہے جس کو طلاق بھی ہوچکی ہے۔''
''میں سب کچھ جانتا ہوں۔''
''سنتے رہو۔اس لڑکی نے اومارا کو بالکل اسی طرح پسند کیا تھا جس طرح ہم سگار بکس سے کوئی سگار پسند کرتے ہیں۔اومارا کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ وہ جس زندگی کا متمنی تھا، وہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں گزر سکتی۔میرا خیال ہے کہ اس کے دل میں ہماری مشترکہ دوست مونا کی محبت شادی کے بعد بھی موجود رہی تھی۔اس دوران اسے علم ہوا کہ جو اور براڈی ہم سے ادویہ کی ترسیل کا نہیں بلکہ منشیات کی منتقلی کا کام لیتے ہیں۔براڈی، جو کا پارٹنر ہے۔اومارا نے اس بارے میں مجھے بھی مطلع کردیا اور اس کی سن گن انہیں بھی ہوگئی کہ ہم ایک خطرناک راز سے واقف ہوگئے ہیں لہٰذا انہوں نے اومارا کو راستے سے ہٹادیا۔جس روز اومارا کو راستے سے ہٹایا گیا، اسی رات مونا بھی غائب ہوگئی لیکن یہ کوئی پراسرار گمشدگی نہیں تھی۔مجھے علم ہے کہ انہوں نے مونا کو ارنج بلٹ میں ریلاٹو کے پیچھے کہیں چھپا رکھا ہے۔وہاں ارٹ نامی شخص کا گیراج بھی ہے جو چوری کی کاروں سے پرزے نکال کر فروخت کرتا ہے۔میں مونا کی گمشدگی پر بہت بے چین تھا لہٰذا میں نے ایک روز جو کا تعاقب کیا تو مجھے حقائق کا علم ہوگیا۔''
''مگر تم مونا کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے؟''
''یہ دلوں کا معاملہ ہے دوست۔'' اس نے طویل سانس لے کر کہا۔''اور میں یہ سب کچھ تمہیں صرف اس لیے بتارہا ہوں کہ تم مجھ پر بہت مہربان رہے ہو۔''
''مونا کو وہاں چھپانے کی کوئی وجہ؟''
''وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اومارا مونا کو لے کر فرار ہوگیا ہے۔'' یہ کہہ کر لیری کھڑکی کے قریب جاکر پھر جھانکنے لگا اور پھر پرتشویش انداز میں بولا۔''نیچے ایک ایسی نیلی سیڈان کھڑی ہے جس کو میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ممکن ہے، یہ محض وہم ہو۔''
وہ ایک بار پھر بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔''تمہیں علم ہے کہ ریلاٹو، بولیوارڈ کے شمال میں پہلے سائیڈ روڈ پر واقع ہے۔وہاں سب سے الگ تھلگ ایک مکان اور گیراج ہے۔اس کے قریب ہی ایک پرانا پلانٹ ہے جہاں سائنائیڈ بنتی ہے۔ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس روز اومارا غائب ہوا، اسی روز براڈی کو جنرل ویڈ کے محل نما مکان کے قریب دیکھا گیا تھا۔یہ بات مجھے براڈی کے ڈرائیور نے بتائی تھی۔''
یہ تو واقعی بہت دلچسپ بات ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ہم خود انڈے میں سے بچہ نکال لیں۔میرے خیال میں تو پولیس کا محکمہ اسی لیے قائم کیا گیا ہے کہ۔۔۔''
''سب سے بری بات یہ ہوئی کہ کل رات میں بھی نشے میں بہک گیا تھا اور میں نے محض دل لگی کے لیے براڈی کو بتادیا کہ مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔پھر جب مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کہہ گیا ہوں تو میں وہاں سے بھاگ نکلا۔گھر پہنچا تو کسی نے مجھ پر گولی چلائی۔اس کے بعد میں گھر کے اندر نہیں گیا بلکہ رات بھر ادھر ادھر چھپتا رہا۔اب تم مجھے شہر سے نکال دو۔''
''ضرور۔لیکن فی الوقت یہیں رہو۔یہاں

زیادہ محفوظ ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے اومارا کا پتا صاف کر دیا ہے؟''

''مجھے یقین ہے۔ وہ کوئی کمزور پہلو نہیں چھوڑتے۔'' لیری یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانکنے لگا۔'' کار ابھی تک یہیں کھڑی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ مت چلو ورنہ تمہیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''بکومت۔ میں نہا کر واپس آ رہا ہوں۔ تم ایک گلاس اور پی لو۔'' میں نے باتھ روم میں جا کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

میں نہا کر واپس نکلا تو وہ جا چکا تھا۔ میں نے گھبرا کر باہر جھانکا۔ وہاں ایک دودھ والے کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ دودھ والا بوتلوں سے بھری ہوئی باسکٹ اٹھائے عقبی زینے سے اتر رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر پوچھا کہ اس نے کسی شخص کو اترتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟ وہ مسکرانے لگا۔ اس کے دانت بھی دودھ کی طرح سفید تھے۔ مجھے ان کی رنگت اسی وجہ سے یاد رہی کہ اس کے مسکراتے ہی میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔

یہ آواز نہ تو زیادہ قریب سے آئی تھی اور نہ ہی زیادہ دور سے۔ مجھے ایسا لگا، جیسے گیراج کی طرف سے آواز آئی ہو۔ میں نے دو مرتبہ گولی چلنے کی آواز سنی اور پھر تابڑ توڑ چھ گولیاں چلیں۔ اس کے بعد کار کے انجن کا شور سنائی دیا جو بتدریج دور ہوتا چلا گیا۔

دودھ والے نے اپنا منہ اس طرح بند کر لیا، جیسے گولیاں اسی کے منہ سے چلی ہوں اور پھر بوتلیں فرش پر رکھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔''گگ۔۔۔ گولیاں چل رہی ہیں۔'' وہ تقریباً کانپتا ہوا بولا۔

یہ سب کچھ چند سیکنڈوں میں ہو گیا۔ میں بھاگ کر اندر آیا اور کپڑے پہن کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ کہیں دور سے سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سڑک پر لیری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور کالی سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور سڑک پر بھی خون ہی خون تھا۔ سڑک کا وہ حصہ جہاں لیری گرا تھا، کتھئی ہو گیا تھا۔

ایک پولیس والا، دودھ کی گاڑی کا ڈرائیور، میں اور اسکول کے دو بچے لاش کو گھورنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی لیری کو نہیں پہچانتا تھا لہٰذا میں نے بھی مہر بہ لب رہنے کا فیصلہ کیا۔

لاش اٹھائی جا چکی تو میں اپارٹمنٹ واپس آ گیا۔ کوٹ پہن کر جب ہیٹ اٹھانے شیلف تک گیا تو مجھے ایک پھول اور ایک رقعہ رکھا ہوا ملا۔

''تم بہت اچھے دوست ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کو تمہارے پیچھے نہیں لگانا چاہتا لہٰذا میں تنہا ہی شہر سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگر مونا سے ملاقات ہو تو یہ گلاب اسے دے دینا، لیری۔''

میں نے رقعہ اور گلاب جیب میں رکھ کر پورا گلاس حلق میں انڈیل لیا۔

☆☆☆

اسی سہ پہر، تین بجے میں وڈ پیلس کی انتظار گاہ میں تھا۔ اب تک میں اپنے اپارٹمنٹ یا دفتر کے قریب بھی نہیں گیا تھا نہ ہی میں نے کسی سراغ رساں سے ملاقات کی تھی۔ میں اس کیس کی تفتیش کے لیے وقت چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے جنرل وڈ سے بھی ملاقات کرنی تھی جس سے ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

''جنرل صاحب باغیچے میں آپ کے منتظر ہیں جناب!'' بٹلر نے واپس آ کر بڑے ادب سے کہا۔ چند لمحوں بعد میں ایک ایسے بڑے ہال میں تھا جہاں چاروں طرف مختلف بیلیں، درخت اور پودے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بہت گرمی تھی۔ درختوں، پودوں اور پھولوں کے درمیان جو جگہ خالی تھی، وہاں وہیل چیئر پر ایک بہت بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی تھی لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔ باقی چہرہ موت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پچکے ہوئے گال، دھنسی ہوئی کنپٹیاں، نمایاں ستواں ناک، لٹکے

ہوئے کان اور ابھری ہوئی پیشانی، ایک ایسے شخص کی کہانی سنا رہی تھی جو کبھی کڑیل جوان تھا اور جس نے دشمن کی فوج کا ایک مہینے تک محاصرہ کر کے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''مسٹر کامریڈی تشریف لے آئے ہیں، جنرل صاحب!'' بٹلر نے اعلان کیا۔ جنرل ویڈ مجھے گھورنے لگا اور پھر حیرت انگیز طور پر تیز آواز بولا۔

''مسٹر کامریڈی کے لیے کرسی لائی جائے۔''

میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ جنرل نے برانڈی لانے کا حکم دیا اور پھر ہم شراب کی مختلف اقسام پر گفتگو کرنے لگے۔

''اپنا کوٹ اتار دیں جناب۔'' جنرل ویڈ نے مجھے پسینے میں نہاتے ہوئے دیکھ کہا۔ ''اوارا تو صرف قمیص پہن کر ہی یہاں آتا تھا۔ بات یہ ہے کہ پودوں کی زندگی کے لیے حرارت ضروری ہے اور اتنی حرارت سے ہمیں پسینہ آ جاتا ہے۔''

پھر اوارا کے بارے میں بات چل نکلی۔

''اوارا میرا داماد ہے جناب۔'' جنرل نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''شاید آپ اس کے بارے میں کچھ بتانے کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں۔''

''جی ہاں۔ لیکن میرا علم محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے، جناب۔'' چمکتی ہوئی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔

''شاید آپ نجی سراغ رساں ہیں اور معاوضے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں سانس لینے کا بھی معاوضہ لیتا ہوں۔ میں نے جو کچھ سنا ہے، وہ آپ کو بتا سکتا ہوں تاکہ آپ گم شدہ افراد کے بیورو سے رابطہ قائم کر سکیں۔''

''اوہ۔ تو آپ کسی اسکینڈل کا ذکر کرنے والے ہیں!''

''اس میں ایک لڑکی بھی ملوث ہو سکتی ہے۔'' میں نے شیمپین کے گلاس کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کی صاحبزادی سے ملاقات سے قبل اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوئی تھی۔ آپ اس لڑکی [illegible] ایک جرائم پیشہ شخص سے شادی کر لی ہے اور...''

''مجھے سب کچھ معلوم ہے مسٹر کامریڈی۔'' جنرل نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اوارا کہاں ہے، ٹھیک ہے اور خوش ہے یا نہیں؟''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ اس کے لہجے میں جذباتیت اور اوارا کے لیے محبت تھی۔

''ممکن ہے، میں بہت زیادہ باتیں کر رہا ہوں۔'' جنرل نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں چند باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میں معذور اور اپاہج انسان ہوں۔ میری دونوں ٹانگیں اور نچلا حصہ مفلوج ہے۔ میں نہ تو زیادہ کھاتا ہوں اور نہ ہی زیادہ سو سکتا ہوں۔ میری زندگی بہت خشک اور بے زار کن سی ہے۔ میں اپنی ذات سے خود ہی اکتا چکا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھے اوارا کی غیر موجودگی بہت کھلتی ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' جنرل نے جو جذباتی ہیجان میں اتنی زیادہ گفتگو کرنے سے یقینی طور پر تھک گیا تھا، ایک چسکی لیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ''وہ مجھے سلام کیے یا خدا حافظ کہے بغیر اچانک ہی چلا گیا۔ ایسا کرنا اس کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک روز وہ اپنی کار میں گیا تو واپس نہیں آیا۔ نہ ہی اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملی۔ اگر وہ میری احمق لڑکی سے پریشان ہو گیا ہے یا کسی دوسری عورت میں دلچسپی لے رہا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ممکن ہے، اس کی اپنی بیوی سے تو تکار ہو گئی ہو اور وہ طیش میں کہیں چلا گیا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک بار مجھ سے مل لے تاکہ میں اسے یہ بتا سکوں کہ میں اپنی لڑکی کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر اسے رقم کی ضرورت ہے تو وہ میری جائیداد میں سے جو بھی چاہے لے سکتا ہے۔''

جنرل ویڈ کے مرجھائے ہوئے بوڑھے گال شاید مسلسل باتیں کرنے کی مشقت برداشت نہ کرتے

ہوئے تمتمانے لگے۔ آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی۔ پھر اس نے طویل سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

''فرض کریں کہ وہ اس لڑکی کے شوہر کی وجہ سے کسی مصیبت سے دوچار ہوگیا ہو، اس لڑکی کے شوہر کا نام جو ہے۔''

''اومارا کسی مصیبت کو خاطر میں نہیں لاتا۔'' جنرل ویڈ نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جناب۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس لڑکی مونا کے بارے میں حکام کو مطلع کردوں کہ وہ کہاں مل سکتی ہے؟''

''نہیں۔ وہ لوگ ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکے اور نہ ہی کرسکیں گے۔ وہ جو کچھ کررہے ہیں، انہیں کرنے دو۔ تم کسی نہ کسی طرح اومارا سے مل کر اسے میرے جذبات سے آگاہ کردو، میں تمہیں ایک ہزار ڈالر دوں گا۔ اس سے کہنا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارا بوڑھا دوست تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور اس کی صحت بھی ٹھیک ہے۔''

بوڑھے جنرل کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں تو اس نے انہیں پھر میچ لیا۔ میں نے یہ جذباتی کیفیت دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اسے لیری سے ہونے والی گفتگو اور لیری کا حشر کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ میں کوٹ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ ''آپ نے بہت زیادہ رقم کی پیشکش کی ہے جنرل صاحب!'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کے بارے میں ہم پھر کبھی گفتگو کرسکیں گے۔ مجھے صرف اتنی اجازت دے دیں کہ میں آپ کی طرف سے کوئی قدم اٹھا سکوں۔''

جنرل ویڈ نے گھنٹی بجا کر بٹلر کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ میری ہر فرمائش پوری کردے۔ بٹلر میرے ساتھ باغیچے سے انتظار گاہ میں آیا تو میں نے کہا۔ ''جنرل کی خواہش ہے کہ میں مسز اومارا سے ملاقات کروں۔''

☆☆☆

کمرے میں دیوار سے دیوار تک سفید قالین بچھے ہوئے تھے۔ تمام کھڑکیوں پر باریک سفید پردے لہرا رہے تھے۔ یہاں سے باہر کا منظر اور کچھ دور پہاڑیوں پر دھند نظر آرہی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ بارش شروع ہونے والی ہے۔

مسز اومارا کیتھرائن۔ سفید دیوان پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیر برہنہ تھے۔ وہ گہرے رنگ کی دراز قد عورت تھی جس کا چہرہ ریشمین تھا اور چھوٹا سا دہانہ قیامت ڈھا رہا تھا۔

''بھلا میں تمہاری کس طرح مدد کرسکتی ہوں۔'' اس نے تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہوا ہے، اس سے سب واقف ہیں لیکن میں تم سے واقف نہیں ہوں۔''

''میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔'' میں نے مشتعل ہوئے بغیر جواب دیا۔ ''تمہاری اس سے کس طرح ملاقات ہوئی تھی؟'' میں نے بھی اپنے لہجے میں اسی کا رنگ سمولیا کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں آئی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح میں اسے پسند نہیں آیا تھا۔

''بس۔ سرِراہ ملاقات ہوگئی تھی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''وہ پہلی ہی نظر میں بہت ہینڈسم لگا تھا۔ اس کے گھونگریالے بال اور آئرش مسکراہٹ بہت دلکش تھی لہٰذا میں نے اس سے شادی کرلی۔ شادی کی وجہ یہ تھی کہ میری زندگی بہت بے کیف ہوچکی تھی اور میں اس میں نئے رنگ بھرنا چاہتی تھی۔''

''وقوعے کے روز تم نے اسے گھر سے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں۔ وہ بغیر بتائے چلا جاتا تھا اور بغیر بتائے ہی آجاتا تھا۔''

''اس سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟''

جھگڑے کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔'' وہ بات ٹال گئی۔

''تمہیں مونا کے بارے میں تو علم ہوگا کہ اس کے اومارا سے کس قسم کے تعلقات تھے؟''

کیتھرائن نے اثبات میں جواب دیا اور پھر مجھے بتایا کہ وہ شادی کے وقت بھی ان تعلقات سے

لف تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ڈارن کلب میں لی جاتی رہتی تھی اور ایک مرتبہ تو پورے ہفتے تک ہاں رہی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات اومارا سے ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنے والد کے بارے میں گفتگو روع کردی۔ اومارا کی گمشدگی کا پاپا نے بہت اثر لیا ہے۔ اگر اس کا کوئی خط بھی آجاتا تو وہ مطمئن ہو جاتے یا کم سے کم اس کے بارے میں کوئی قطعی طلاع آجائے تو وہ صبر کرلیں۔''

'' تمہارے والد معذور، بوڑھے اور لب ور انسان ہیں جن کے دل میں محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔'' صرف اومارا ں ان کی زندگی اور موت کے درمیان ایک دھاگے ں مانند ہے۔ اگر یہ دھاگا ٹوٹ گیا تو وہ مرجائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس سے اجازت لی ر سنگ مرمر کے زینے سے اترتا ہوا ہال وے میں گیا جہاں بٹلر نے میرے لیے دروازہ کھولا۔ باہر یک اور خوب صورت باغ تھا۔ یہیں سے سرخ بجری لا ایک راستہ گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ میں گیٹ کی رف بڑھ گیا اور راستے میں ایک دس سالہ لڑکے سے میری ملاقات ہوئی جو شاید کیتھرائن کے نقوش لے کر ہی پیدا ہوا تھا۔ لڑکا درخت سے لٹکے ہوئے یک ٹارگٹ پر ڈارٹ پھینک رہا تھا۔

'' کیا تم اومارا کے بیٹے ہو؟'' میں نے بڑی فقت سے پوچھا۔

'' میں ڈیڈ ہوں اور میرے باپ کا نام اومارا ہیں ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔'' تم کون ہو؟''

'' سراغ رساں۔ اور میں اومارا کو تلاش کررہا ہوں۔'' لڑکے نے سر جھٹک کر ایک بار پھر چھوٹے چھوٹے تیروں سے ٹارگٹ پر نشانے لگانے شروع کردیے۔ وہ بہت اکھڑا اکھڑا سا تھا لہٰذا میں نے اس کی دلچسپی کے مطابق گفتگو شروع کردی۔

'' میرا خیال ہے کہ تم تیس فٹ کے فاصلے سے رگٹ نشانہ نہیں بنا سکتے ڈیڈ۔'' حسب توقع اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

'' لگاؤ شرط۔'' اس نے پیشکش کی اور میں نے فوراً ایک ڈالر کی شرط لگادی۔ اس نے ٹھیک تیس فٹ دور جاکر ڈارٹ سے ٹارگٹ کو نشانہ بنایا اور جیت گیا۔

'' واہ۔'' میں نے بے ساختہ طور پر اسے داد دی تو وہ بڑے شاہانہ انداز میں بولا۔'' یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر میرا نشانہ دیکھنا چاہتے ہو تو ٹارگٹ روم میں چلو جو گیراج کے عقب میں ہے۔''

'' نہیں۔ پھر کبھی۔'' میں نے گیراج کے قریب سفید عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' تو اومارا تمہارا باپ نہیں۔ اگر میں اسے تلاش کرلوں تو تمہیں خوشی ہوگی نا؟''

اس نے کندھے اچکا کر میری طرف دیکھا۔'' پولیس تو انہیں تلاش نہ کرسکی، بھلا تم کیا کرلوگے۔'' یہ کہہ کر وہ رہائشی حصے کی طرف دوڑ گیا۔

ابھی میں احاطے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ میں نے درختوں کی آڑ میں کھڑی ہوئی نیلی سیڈان دیکھی اور مجھے لیری کا وہ جملہ یاد آگیا جو اس نے میرے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ادا کیا تھا۔

'' ایک نیلی سیڈان کھڑی ہے۔'' میں نے فوراً دو میں سے ایک ریوالور جیب میں سے نکال کر پنڈلی کے ساتھ موزے میں، جوتے کے اندر تک چھپالیا۔ اگرچہ اس طرح میں بھاگ دوڑ نہیں کرسکتا تھا لیکن اس کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں چھپتا چھپاتا اپنی کار میں بیٹھا اور فوراً ہی کار نے چالیس میل کی رفتار سے دوڑنا شروع کردیا۔ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ ابھی میں چار پانچ میل دور ہی آیا تھا کہ مجھے پولیس سائرن سنائی دیا اور میں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کردی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی ہے لیکن جب چڑیاں کھیت چگ جائیں تو پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نیلی سیڈان والے مجھے گھیرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لمبوترے چہرے والے شخص نے

سب مشین گن کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے میری طرف تان دی۔

"میری کار میں آجاؤ دوست۔" اس نے خطرناک لہجے میں کہا۔"میں خون بہانے سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔"

میں انتہائی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی کار میں بیٹھ گیا۔ میری کار کی چابی اسی میں رہی۔ "چلو لوئس۔"

لمبوترے چہرے والے نے ڈرائیور سے کہا۔ کار میں صرف یہی دو تھے۔ لوئس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے قبل میری جیب سے کولٹ نکال کر لمبوترے چہرے والے کو دے دیا۔

سیڈان جھٹکا لیے بغیر مخالف سمت میں چلنے لگی۔

"اس نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" لمبوترے چہرے والے نے لیری کا نام لیے بغیر مجھ سے پوچھا۔

"صرف یہ کہ جس روز اومارا غائب ہوا، اسی رات مونا بھی فرار ہوگئی۔ جنرل ویڈ کو بھی اس کا علم ہے۔"

"ذرا کھل کر بات کرو دوست۔"

"میں کبھی بند ہو کر بات نہیں کرتا۔"

"کہاں چلنا ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے منزل کا پتا نہیں۔

"بیورلے گیلن۔ مل ہالینڈ ڈرائیو۔" لمبوترے چہرے والے نے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ "تم برے آدمی نہیں ہو، صرف بے وقوف ہو اور زبان بند رکھنا چاہتے ہو۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے، اسے تم اگل دو۔"

"میں سب کچھ اگل چکا ہوں۔"

"تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ سودا کیوں نہیں کر لیتے۔"

"کیسا سودا؟"

"تمہیں جو کچھ معلوم ہے، اسے بھول جاؤ، کسی کو بھی کوئی بات معلوم نہ ہو اور۔۔۔ اور اومارا کی گمشدگی کے بارے میں سوچنا بھی بند کردو۔"

"معاوضہ؟"

"ایک ہزار ڈالر۔" لمبوترے چہرے والے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"مجھے منظور ہے۔"

"گڈ۔ لیکن اگر تم نے دھوکا دیا تو تمہاری زندگی میں صرف چوبیس گھنٹے کا فاصلہ باقی رہ جائے گا۔"

اس نے اپنا پرس نکالتے ہوئے کہا اور پھر اس میں ایک ہزار ڈالر کے نوٹ گننے لگا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے نوٹ جیب میں رکھ لیے اور اس نے قریب ہی پڑی ہوئی ایک بوتل اٹھالی۔ "معاہدے کی خوشی میں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کار میں گلاس تو نہیں ہیں لہٰذا ہم بوتل سے ہی منہ لگا کر گھونٹ پی لیں۔ لو آغاز تم کرو۔"

میں نے بوتل کھولی اور پھر اچانک ہی میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیری نے کہا تھا کہ مونا کو جس جگہ رکھا گیا ہے، وہاں قریب ہی سائیڈ کا پلانٹ بھی ہے۔

مجھے شراب سے اجنبی بو آرہی تھی۔ وہ بہت ہلکی تھی۔ اگر عام حالات ہوتے تو میں اسے محسوس بھی نہیں کرتا لیکن۔۔۔

میں نے بوتل منہ سے لگالی اور میرے اعصاب تڑخنے لگے۔ میں نے بہت جلد ایک فیصلہ کیا۔ بوتل کو صرف اسی حد تک اونچا کیا کہ شراب منہ میں داخل نہ ہوسکے پھر اس طرح میں نے بوتل منہ سے ہٹائی جیسے پھندہ لگ گیا ہو اور بری طرح کھانسنے لگا۔

"ارے۔ تم ایک ہی گھونٹ میں چیں بول گئے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ان میں سفاکی اور بے رحمی نظر آرہی تھی۔ میں کھانستے کھانستے آگے کی طرف جھکا۔ بوتل میں نے اس طرح گرادی، جیسے ہاتھوں میں سکت باقی نہ رہی ہو، پھر ایک کونے میں سمٹ کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ موقع ملتے ہی میں نے موزے میں چھپا ہوا ریوالور نکال لیا اور اس سے قبل کہ لمبوترے چہرے والا کچھ سمجھتا، میں نے بائیں ہاتھ ہی سے دو گولیاں چلائیں، تیسری گولی میں نے کار کی چھت کے اس

حصے کے آر پار کردی جس کے نیچے لوئس بیٹھا ہوا تھا۔
لیکن لوئس وہاں نہیں تھا۔ وہ تو کار روک کر بریکوں کے پاس سر سیٹ کے نیچے کیسے شتر مرغ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں لمبوترے چہرے والے کی طرف دیکھتا لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ اب وہ کوئی شرارت نہیں کر سکے گا۔

میں نے لوئس سے محض ایک انچ دور سیٹ کے گدے کو نشانہ بنایا تو وہ روتا ہوا نمودار ہو گیا۔ ''مم۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے مجھے دس ڈالر دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا۔''

میں نے اسے کار سے نکلنے کی ہدایت کی اور خود بھی لمبوترے چہرے والے کی لاش پھلانگتا ہوا سڑک پر اتر آیا۔ میں نے ہتھکڑی نکال کر لوئس کو پہنادی۔ وہ یا تو بہت خوف زدہ تھا یا بہت بزدل۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ پھر میں نے لاش کھینچ کر باہر نکالی اور ہتھکڑی کا دوسرا کڑا مردہ کلائی میں ڈال دیا۔

''کک۔۔۔ کیا مطلب؟ کیا تم مجھے لاش کے ساتھ یہیں چھوڑ جاؤ گے؟'' وہ ہکلانے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں لرزنے لگیں۔

میں نے دونوں کو وہیں چھوڑا اور سیڈان میں بیٹھ کر اس طرف روانہ ہو گیا جہاں میری کار کھڑی تھی پھر اپنی گاڑی میں شہر واپس چلا آیا۔ جہاں میں نے پولیس کی کرائمز برانچ کو فون کیا اور گرینی میں سارجنٹ کو اس واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے مطلع کر دیا کہ وہ زندہ ڈرائیور اور مردہ بدمعاش کو کہاں پایا جا سکتا ہے۔ البتہ او مارا یا لیری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ گرینی سے مجھے معلوم ہوا کہ پولیس ایک دودھ والے کی گواہی کو بنیاد بنا کر میری تلاش میں ہے تاکہ مجھ سے لیری کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا سکے۔

سورج ڈھلتے ہی میں ریلاٹو کے لیے روانہ ہو گیا۔ آٹھ بجے میں ریلاٹو کے علاقے میں داخل ہوا جس کی سڑک پر فارم ہاؤس کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ میں آگے نکلتا چلا گیا حتیٰ کہ کھیت اور کھلیان نظر آنے لگے۔ تین میل کی مزید ڈرائیو کے بعد میری نظر ایک سائیڈ روڈ پر پڑی۔ میں نے سائیڈ روڈ پر موڑ کاٹتے ہوئے سڑک کے کنارے پر زور سے بریک لگائے اور نتیجہ حسب منشا نکلا۔ کار کا اگلا اور پچھلا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میرے پاس صرف ایک فاضل وہیل تھا۔ میں کار سے اتر کر اس مکان کی طرف چل دیا جو سب سے الگ تھلگ تھا اور جس میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

یہی وہ جگہ تھی جس کی میں تلاش میں تھا۔ اس کے برابر گیراج کے پھاٹک نظر آ رہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں، بورڈ چمک رہا تھا۔ ''آہٹ بک۔ آٹو ریپئر اینڈری فنشنگ۔''

''کون ہے؟ کیا بات ہے؟'' گیراج کے دروازے پر دستک دیتے ہی جواب ملا۔

میرے دو وہیل پنکچر ہو گئے ہیں بھائی۔ ذرا زحمت کر کے پنکچر تو لگا دو۔''

پھاٹک کے دوسری طرف سے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ اور قدرے تاخیر سے دروازہ کھل گیا۔ ''اندر آ جاؤ۔'' کسی نے ہدایت کی اور اس ہدایت دینے والے کے ہاتھ میں ایک بدنما پستول بھی مجھے ہدایت دے رہا تھا کہ شرافت سے کام لینا۔

''تمہاری سڑک پر کیلیں بہت ہیں دوست۔ شاید تم ہی نے پھیلا رکھی ہیں تاکہ تمہارا کاروبار چلتا رہے۔'' میں نے بے خوفی سے اس شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ پستہ قد، مضبوط جسم کا مالک تھا۔ گیراج کے ہال میں وارنش اور پینٹ کی بو بھری ہوئی تھی اور چند قدم دور ایک بڑی سیڈان پر پینٹ گن رکھی ہوئی تھی۔ کار بالکل نئی تھی اور اس پر نیا رنگ کرنے کا مقصد صاف ظاہر تھا۔ وہ چوری کی کار تھی۔

اس شخص نے پستول جیب میں ڈال لیا۔

اسی لمحے ایک اور شخص ہال میں داخل ہوا۔ طور طریقوں سے وہ بھورے شخص کا ماتحت نظر آ رہا تھا لیکن جب بھورے شخص نے اسے آرٹ کہہ کر پکارا تو

میں سمجھ گیا کہ گیراج کا مالک محض آلہ کار ہے۔

''جاؤ آرٹ۔ ان کی کار کے دو وہیل پنکچر ہیں۔'' بھورے شخص نے حکم دیا اور آرٹ میری کار کے بارے میں پوچھ کر چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ بھورا شخص براڈی ہے۔ جوکا ساتھی۔ میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا کیونکہ اس وقت میری آنکھوں میں اپنے ایک دوست کی لاش گھوم رہی تھی۔ لیری کی لاش۔

کچھ ہی دیر بعد آرٹ دونوں وہیل اٹھائے واپس آ گیا۔ اس نے ٹیوبیں نکال کر ان میں ہوا بھری اور پنکچروں کا پتا چلانے کے لیے ٹیوبوں کو پانی میں دبا دبا کر دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ ایک ٹیوب لے کر اٹھا، اور ایک ہی لمحے بعد اس نے وہ ٹیوب میرے سر پر دے ماری۔ میں اچانک اس حملے سے بوکھلایا تو نہیں لیکن ایک لمحے کے لیے حیران ضرور ہوگیا۔ انہوں نے میری اس حیرانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔

مجھے پتا نہیں کہ میں کس طرح زمین بوس ہوا۔

☆☆☆

میرے ہوش بحال ہوئے تو میں نے اپنے قریب نسوانی خوشبو محسوس کی اور جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے اس خوشبو کو ایک لیمپ کے قریب بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میری آنکھیں لیمپ کی روشنی اور اس کے حسن سے خیرہ ہوگئیں۔ وہ روشنی سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اس کی سنہری زلفیں روشنی میں چمک رہی تھیں۔ وہ ایک خوب صورت اور سبز رنگ کا ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے قدموں میں ایک لیڈیز بیگ پڑا ہوا تھا اور وہ سگریٹ پی رہی تھی جب کہ سائیڈ ٹیبل پر ہلکے نارنجی سیال سے بھرا ہوا گلاس رکھا تھا۔

''ہیلو۔'' میں اسے متوجہ کرنے کے لیے بولا۔

میں اسے اچھی طرح پہچان گیا تھا، وہ وہی تھی جو اس روز لیری کی رولز رائس میں نظر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی بلا کی چمک تھی۔ سبز آنکھیں اتنی دلکش تھیں کہ میں جھومنے لگا تھا۔

''اب تمہارا کیا حال ہے؟'' اس کی آواز بھی اس کے حسن کی طرح ملائم تھی۔

''بہت شان دار۔۔۔ کچھ ایسا لگ رہا ہے، جیسے کسی نے میرے جبڑے پر ایٹم بم کا تجربہ کیا ہو۔''

''تو تمہیں یہاں کس قسم کے رویے کی توقع تھی، کامریڈی۔'' وہ تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے بولی۔

''اوہ۔ تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے، مونا؟'' میں نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔ تمہاری بے ہوشی کے دوران انہوں نے تمہاری مکمل تلاشی لی تھی۔ انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے اور اسی لیے میں بھی تمہارا نام جانتی ہوں۔''

میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ میرے پر کاٹ دیے گئے ہیں۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی تھی اور پنڈلیوں پر بھی رسی کا دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ ''تو وہ لوگ اب میری قبر کھود رہے ہیں، مونا۔'' میں نے کلائیوں پر آہنی کڑیوں کی چبھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''بھلا تمہیں اس کی کیا پروا کامریڈی۔ وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔'' وہ اٹھ کر میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ اب گلاس اس کے نازک ہاتھ میں تھا۔ اس نے جھک کر گلاس میرے لبوں سے لگا دیا اور میں نے چند لمبے لمبے گھونٹ لے کر منہ بند کر لیا۔

''میری دعا ہے کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔'' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے قتل و غارت گری سے سخت نفرت ہے۔ پتا نہیں، تم سے اتنی ہمدردی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ بغور کچھ سننے لگی۔ کمرے کے دو دروازوں میں سے ایک تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد ہوگئی لیکن پھر جب اسے احساس ہوا کہ وہ جس آواز پر چونکی تھی، وہ بارش کی آواز تھی تو اس کے چہرے پر شادابی واپس آ گئی۔ ''تم یہاں کیوں آئے تھے کامریڈی؟ کیا تمہیں خطرے کا احساس نہیں تھا؟'' اس مرتبہ اس نے قالین کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''آہ۔ میں تمہیں گلاب دینے آیا تھا، مونا۔''

میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ ''لیری نے مجھے تمہارے لیے گلاب دیا تھا۔''

''ہاں۔ وہ مجھے مل گیا ہے لیکن اس کے ساتھ جو خط تھا، وہ مجھے نہیں ملا۔ انہوں نے خط اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ کیا وہ تمہارے نام تھا؟''

''نہیں۔ وہ تمہارے لیے ہی تھا۔ قتل ہونے سے چند منٹ قبل وہ خط اور گلاب میری میز پر رکھ گیا تھا۔''

اس کے چہرے پر شدید کرب کی وجہ سے سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ بہت کچھ محسوس کر رہی تھی۔ اسے لیری یاد آ رہا تھا۔ گلاب کی مرجھائی ہوئی پتیوں نے اسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا۔ لیکن ایک ہی لمحے بعد وہ پھر ٹھیک ہو گئی اور سلوٹیں دور ہو گئیں۔ ''تو کیا لیری مر گیا؟''

''ہاں۔ اسے گولی مار دی گئی۔ اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے یہ علم ہو گیا تھا کہ جو اور براڈی نے اومارا کو قتل کر کے لاش ضائع کر دی ہے۔''

''نہیں۔ اس کا جو سے کوئی تعلق نہیں۔'' مونا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اومارا سے عرصہ ہوا، میری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اس بارے میں اخبارات میں جو کچھ چھپا ہے، وہ غلط ہے۔ جو شکاگو میں ہے، وہ کل ہی طیارے سے گیا ہے، وہاں اسے کوئی کاروباری سودا کرنا ہے۔ اگر سودا کامیاب ہو گیا تو میں اور براڈی بھی شکاگو چلے جائیں گے۔ میرے اغوا کی کہانی بھی سو فیصد جھوٹ ہے، جو قاتل نہیں ہے۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔

''کیا۔ کیا لیری کو۔ واقعی۔۔۔''

''وہ مر چکا ہے۔ اسے ٹامی گن سے شکار کیا گیا لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کام جو اور براڈی نے خود کیا ہوگا۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ کمرے میں اتنی خاموشی چھا گئی کہ میں اس کی سانس کی آواز تک سننے لگا۔ پھر وہ ایش ٹرے میں سگریٹ رکھ کر بڑے وثوق سے بولی۔ ''جو ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا، کامریڈی! میں جانتی ہوں کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قاتل نہیں۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''جو کو اومارا کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ نہ ہی میں جانتی ہوں کہ اومارا پر کیا بیتی؟''

''شاید وہ رئیس بیوی سے اکتا کر سمندر میں کود گیا ہے۔'' میں نے نرم مگر طنزیہ انداز میں کہا۔

''سنو۔ یہاں صرف ایک کار موجود ہے جو براڈی کے استعمال میں ہے۔ اگر میں تمہاری رسیاں کاٹ دوں تو کیا تم ریلاٹو تک پیدل جا سکتے ہو؟'' اس نے اچانک ہی انتہائی اہم پیشکش کر دی۔

''ضرور۔ مگر تمہارا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا مگر وہ جواب دیے بغیر بڑی تیزی سے کمرے سے چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے پھرتی سے میری پنڈلیوں پر کسی ہوئی رسیاں کاٹیں اور میں بندھے ہوئے ہاتھوں سمیت کھڑا ہو گیا۔ اب میں دوڑ بھاگ کر سکتا تھا۔

''ہتھکڑی کی چابی براڈی کے پاس ہے۔'' اس نے چاقو ایک طرف رکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ اب ہمیں یہاں سے بلا تاخیر نکل جانا چاہیے۔''

''میں تمہارے ساتھ بھلا کیوں چلوں۔ میں یہیں رہ کر جو کے پیغام کا انتظار کروں گی۔ مجھے شکاگو جانا ہے۔''

''میرے فرار کا الزام تم ہی پر آئے گا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس کا کیا مطلب ہوگا۔ براڈی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔''

''فرض کرو کہ ایسا نہ ہو؟''

''فرض کرو کہ اس نے اومارا اور لیری کو قتل کیا ہو؟''

''بکومت'' وہ جھنجلا کر بولی۔ ''میں اس کی داشتہ نہیں ہوں۔ اس کے باس کی بیوی ہوں، وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

میں اس کی طرف سے مایوس ہو کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دیوانہ وار فرنٹ ڈور کی طرف دوڑی۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اور پھر اس طرح سر ہلانے لگی، جیسے باہر کوئی نہ ہو۔ راستہ صاف تھا۔ ''خدا حافظ مونا۔''

''خدا حافظ۔ کاش تم لیری کے قاتل کا پتا چلا سکو'' وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میرا رخ سڑک کی طرف تھا۔ لیکن سو گز دور جا کر میں ایک دم پلٹا۔ میرا رخ اب پھر مکان کی طرف ہو گیا تھا لیکن میں زیادہ قریب نہیں گیا بلکہ ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

میری کار چند گز دور کھڑی تھی۔ ایک ریوالور میری خفیہ جیب میں موجود تھا جسے وہ لوگ تلاش نہ کر سکے تھے۔ میں نے ریوالور بندھے ہوئے ہاتھوں میں دبوچ کر کچھ سوچا اور مکان کی طرف سرکنے لگا۔ ابھی میں مکان سے پندرہ بیس گز دور تھا کہ انجن کے گنگنانے کی آوازیں سنائی دیں اور میں ہیڈ لائٹس کی زد میں آتے آتے بچا۔ میں ایک گڑھے میں کود کر دعا کرنے لگا کہ اس نے مجھے دیکھ نہ لیا ہو۔

کار میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ مکان کے سامنے اس کے ٹائر چیخے اور وہ ایک دھچکے سے رک گئی۔ انجن بند ہوا اور ہیڈ لائٹس گل ہو گئیں۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی میں گڑھے سے نکل کر مکان کی طرف رینگنے لگا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ ایک پرانی فورڈ میں آیا تھا۔ میں نے کار میں جھانک کر دیکھا۔ اندر کوئی نہ تھا۔ پھر میں نے مکان کی طرف کان لگا دیے۔ اندر سے نہ تو کسی کی بولنے کی آوازیں سنائی دیں اور نہ ہی کوئی چیخ سنائی دی۔

میں سوچنے لگا کہ مونا نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا اور اب وہ براڈی کے ساتھ اس مکان میں شاید کوئی بہانہ بنا رہی ہوگی۔ ممکن ہے، وہ براڈی کے کسی سوال کا جواب نہ دے اور اگر براڈی کوئی سوال کرے تو وہ خاموش کھڑی اسے گھورتی ہے۔ وہ اس کے باس کی بیوی تھی نا۔

میں جانتا تھا کہ براڈی اسے پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر میں اسے نہ ملا تو وہ اسے یہاں سے کہیں اور لے جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ طیش میں آ کر کوئی اور قتل کر دے۔ پھر معاً مجھے لیری یاد آ گیا۔ اس کی لاش یاد آ گئی، اس کی مردہ آنکھیں یاد آ گئیں اور پھر مجھے کچھ اور یاد نہ رہا۔ میں بائیں ہاتھ میں ریوالور تھام کر مکان کے بہت قریب پہنچ گیا۔ میں نے بندھے ہوئے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑے پکڑے دوسرے ہاتھ سے کنکر اٹھا کر کھڑکی کے شیشے پر دے مارا۔ یہ بڑی کمزور سی کوشش تھی کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن مجھے کامیابی کی امید ضرور تھی۔ پھر میں کسی بلی کی طرح کودتا ہوا فورڈ کے عقب میں آ گیا جس کے اگنیشن لاک میں چابی موجود تھی۔ میں فورڈ کے دروازے کو پکڑے پکڑے جھک گیا۔

کار کے انجن کی پکار نے اسے باہر بلا ہی لیا۔

کھڑکی کھلی اور یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔

میں بہت زور سے چیخا۔ میرا حربہ کامیاب ہو گیا۔ پھر میں نے کسی کے قہقہے کی آواز سنی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بڑی احتیاط سے سر اٹھا کر دیکھا۔ مونا پورے وقار سے سر اٹھائے باہر آ رہی تھی۔ اور اس کے عقب میں براڈی چل رہا تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے براڈی۔'' میں نے مونا کی مترنم آواز سنی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ڈرائیو وے پر آ چکی تھی اور براڈی اب بھی اس سے کئی قدم پیچھے تھا۔

پھر اس کی موت اسے مونا سے آگے لے آئی۔ وہ میرے ریوالور کی زد پر آیا تو میرے ریوالور نے چار مرتبہ اس پر تھوکا۔ اس کے ہاتھ سے گن گر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں اس طرح لہرائے، جیسے وہ کوئی سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بجری پر بیٹھ گیا۔ پھر لیٹ گیا اور پھر ساکت ہو گیا۔ شاید وہ مر چکا تھا۔

''کامریڈی۔'' مجھے مونا کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر اس کے سامنے آیا تو اس نے میرا بازو دبوچ لیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ''مونا! کار کا انجن بند کر کے براڈی کی جیب سی ہتھکڑی کی چابی

لگالو۔ پلیز۔“

”احمق۔“ وہ سسک کر رو پڑی۔ ”تم میری خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کیوں واپس آئے تھے؟“

☆☆☆

میں نے راتوں رات سراغ رسانی کے چیف انسپکٹر کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں ہونے والے دونوں قتل پر کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ پہلا قتل تو دفاع کرتے ہوئے ہوا تھا، جبکہ دوسرا قتل ایک مفرور مجرم کو پکڑنے کی خاطر عمل میں آیا تا۔ وہیں مجھے علم ہوا کہ گمشدگی سے قبل اومارا کے پاس پندرہ ہزار ڈالر تھے۔ چیف انسپکٹر بھی مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ قتل اور گمشدگی کے واقعات میں جو کا کوئی براہ راست ہاتھ نہیں اور اس ضمن میں اس کے پاس ٹھوس واقعاتی شہادتیں موجود تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اومارا کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اور جب پندرہ ہزار ڈالر کی رقم خرچ ہو جائے گی تو وہ پھر واپس آ جائے گا۔ میں اپنے اس موقف پر قائم تھا کہ اگر لب گور جنرل ویڈ کو اومارا کے بارے میں کوئی اچھی اطلاع مل جائے تو اس کی موت آسان ہو جائے گی۔

☆☆☆

صبح بہت حسین تھی۔ آسمان پر کالے بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سفید بادل دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں کی طرح ادھر ادھر تیر رہے تھے اور جنرل ویڈ کے محل کے درختوں پر پرندوں کے جھنڈ منڈلا رہے تھے۔

میں لان سے ہوتا ہوا درختوں کی طرف چلا آیا جہاں کیتھرائن کا بیٹا ڈیڈ، ڈارٹ گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔ ”کیا تم نے اسے تلاش کر لیا ہے؟“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے ڈیڈی کو۔ نہیں بیٹے۔ وہ ابھی تک نہیں ملا۔“

”وہ میرا ڈیڈی نہیں ہے۔“ اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ میرے ڈیڈی تو فلوریڈا میں کہیں رہتے ہیں۔ تم اسے بھی تلاش نہیں کر سکو گے۔“

”لگاؤ شرط۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کسی اور چیز پر شرط لگاؤ۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”چلو، ٹارگٹ روم چلتے ہیں۔ میں دس فائر کر کے آٹھ نشانے بالکل ٹھیک لگا سکتا ہوں۔“

”چلو۔“ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ہم مکان کے عقبی حصے میں گیراج کی طرف چلے گئے جہاں ٹارگٹ روم تھا۔ میں ابھی اندر پہنچ کر ٹارگٹ روم کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میرے عضلات تن گئے۔ ایسا کسی خطرے کے موقع پر ہوتا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ ڈیڈ نامی شیطان نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میں زقند بھر کر کاؤنٹر کے عقب میں چھپ گیا۔ اس نے تین فائر کیے مگر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تینوں فائر کاؤنٹر کی دبیز لکڑی میں پیوست ہو گئے۔ پھر وہ یہ دیکھے بغیر کہ میرا کیا حشر ہوا ہے، ریوالور پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

سارے اسرار سے پردہ اٹھتا چلا گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور میں چند قدم دور پڑا ہوا ہیٹ اٹھا کر ٹارگٹ روم سے نکل آیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ ڈیڈ کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ مین نے ہیٹ سے گرد جھاڑی اور پھر چونک پڑا۔ ڈیڈ نے تین نہیں چار گولیاں چلائی تھیں اور ایک گولی ہیڈ کے چھجے میں سوراخ کر گئی تھی۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ یہ سوراخ اگر نیچے ہوتا تو میں بھی۔۔۔

میں ہیٹ کو دبوچے کیتھرائن سے ملنے کے لیے عمارت میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

آج وہ گہرے گلابی رنگ کے اسکرٹ اور بلاؤز مین سفید دیوان پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناشتے کے خالی برتن قریب رکھے ہوئے تھے اور وہ سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”کل تو تم بڑے شریف انسان لگ رہے تھے مگر آج تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں، کامریڈی

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''میں تم سے براڈی کے بارے میں کچھ پوچھنے آیا ہوں۔''
''وہ کیوں؟'' اس نے کسی غصے کا اظہار کیے بغیر سوال کیا۔
''تم ڈارن کلب میں پورے ایک ہفتے تک رہی ہو، کیتھرائن!'' میں نے اپنا زخمی ہیٹ لہراتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ میں اس سے واقف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ لیری اور براڈی کے بارے میں تم پہلے ہی جانتے ہو۔ میں جانتی تھی کہ تم جلد یا بدیر ذاتیات پر اتر آؤ گے اور میرے پاس تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکالنے کا راستہ ہی باقی بچا رہے گا۔''
''میں اس وقت تک دھکے کھانے کے موڈ میں نہیں ہوں، جب تک اپنی بات مکمل نہ کرلوں۔ براڈی کے ڈرائیور نے لیری کو کیوں، بتایا تھا کہ اومارا کی گمشدگی والے روز براڈی یہاں آیا تھا؟''
کیتھرائن واقعی بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ میں نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کھینچ کر ایش ٹرے میں بجھا دیا اور اپنا زخمی ہیٹ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں ہیٹ کے سوراخ پر جم گئیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔
''میں یہ ہیٹ بطور تحفہ پیش کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیتھرائن! بس ذرا گولی سے بنا ہوا سوراخ دکھانا چاہتا ہوں۔''
اس نے ہیٹ ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ''تت۔۔۔ تو کیا براڈی نے؟''
''نہیں۔ اس وقت یہاں براڈی موجود نہیں۔''
اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔
''تم اس کی ماں ہو کیتھرائن۔ اب بولو کیا کہتی ہو؟''
''میرے خدا! ڈیڈ نے، میرے بیٹے نے۔۔۔''
''ہاں۔ اس نے چار بار گولی چلائی تھی۔''
''مگر کیوں؟''
''کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈیڈ نے مجھ پر گولی کیوں چلائی؟'' وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھانے لگی۔
''شاید وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے سوتیلے باپ کے بارے میں تفتیش جاری رکھوں۔ میرا ذاتی رائے میں وہ لالچی اور کچھ پاگل بھی ہے۔ وہ ایذا پسند بھی لگتا ہے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آج اس نے پہلی مرتبہ یہ حرکت نہیں کی۔''
''کیا بک رہے ہو؟'' وہ بپھر کر بولی۔
''ہاں۔ میں بک رہا ہوں لیکن ذرا اس نکتے پر تو روشنی ڈالو کہ اس نے اومارا کو کیوں قتل کیا؟''
وہ کسی خوف زدہ بچی کی طرح دیوان کے کونے میں سمٹ گئی۔۔۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور وہ مجھے گھورتی رہی۔ ''تم۔۔۔ تم بلیک میل کرنے آئے ہو۔ رقم چاہتے ہو؟''
''میں کتنی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہوں؟''
''پندرہ ہزار ڈالر۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اومارا کی جیب میں اس وقت اتنی ہی رقم تھی، جب براڈی نے اس کی لاش کو ٹھکانے لگایا۔''
''شش۔ شیطان۔'' وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔ ''میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں گی۔''
''ضرور۔ میرا خیال ہے کہ اومارا کو ٹارگٹ روم ہی میں قتل کیا گیا ہوگا۔ وہ اپنے سوتیلے باپ سے بہت نفرت کرتا تھا نا؟''
''ہاں۔'' وہ کمزور لہجے میں بولی۔
''تو ہوا یہ کہ ڈیڈ، اومارا کو نشانہ بازی کے بہانے وہاں لے گیا ہوگا اور پھر وہیں اسے خیال آیا ہوگا کہ وہ سوتیلے باپ کو قتل کردے جس نے اس کے اپنے باپ کی جگہ لے لی تھی۔ گولی سر میں لگی ہوگی۔ اس نے میرے بھی سر کو نشانہ بنایا تھا۔ خون بھی ضرور بہا ہوگا لیکن زیادہ نہیں۔ جب لڑکے نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا ہوگا لیکن پھر اس نے کسی کو اس راز میں شریک کرلیا ہوگا۔ مجھے

یقین ہے کہ اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔''
''ہاں۔ ہاں۔ اس نے مجھے ہی بتایا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں اب میرے لیے نفرت نہیں تھی۔
''اب تم یہ کہو گی کہ یہ سب کچھ محض اتفاق تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیڈ نارمل لڑکا نہیں ہے۔ جنرل وینڈا اور نوکروں کو بھی اس کا علم ہے کہ اس کی ذہنی کیفیت ابھی سے خراب ہے۔ تم نے فوراً فیصلہ کیا ہوگا کہ لاش کو کہیں ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ پولیس کو اس قتل کا علم نہ ہوسکے۔ تم براڈی سے واقف تھیں، تم نے اسے معاوضے پر حاصل کیا تاکہ وہ لاش کو ٹھکانے لگا دے۔''
''وہ۔۔۔ اس لاش کو رات کے وقت ہی یہاں سے لے گیا تھا۔'' کیتھرائن نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔
''نوکروں میں سے کس کس کو اس کا علم ہے؟''
''صرف بٹلر کو۔ اومارا فوراً نہیں مرا تھا۔ بٹلر نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو وہ ہچکی لے کر مر گیا۔ لیکن اس سے قبل وہ یہ بتا چکا تھا کہ گولی کس نے ماری ہے۔''
''تمہارا کیا خیال ہے کہ لیری کیوں مارا گیا؟''
''اسے ان حالات کا علم ہو گیا ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ براڈی اب مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔''
''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' میرے اس جواب پر کیتھرائن اچھل پڑی لیکن اس نے کوئی جرح نہیں کی۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس کیس میں جو اور مونا ملوث نہیں تھے۔ یہ صرف اور صرف براڈی کی حرکت تھی۔ اس نے لیری کو راستے سے ہٹایا اور پھر مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تاکہ تمہیں زندگی بھر بلیک میل کر سکے۔''
وہ گم صم ہوگئی۔
''سنو۔ تمہارا بیٹا صرف دس سال کا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے یہاں سے کہیں اور لے جاؤ۔ وہ ابھی کسی پودے کی ٹہنی کی طرح ہے جس میں لچک موجود ہے۔ وہ ٹھیک ہوسکتا ہے۔ اس کا اچھی طرح علاج کراؤ اور اس کے ذہن سے نفرت نکال پھینکو۔''
وہ کھڑی ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت بالکل زرد ہوگئی۔ پھر اچانک ہی اس نے سسکی لی۔ ''ٹھیک ہے کامریڈی! میں۔۔۔ میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گی۔ میں ڈیڈ کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی ورنہ وہ صدمے سے مر جائیں گے۔ کیا براڈی مر چکا ہے؟''
''تم ڈیڈ کو یہاں سے لے جاؤ۔ جاؤ۔ اسے تلاش کرو، وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔''
میں تمہارا شکریہ بھی تو ادا نہیں کرسکتی کامریڈی۔''
اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔
''میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے انسان بناؤں گی۔ خدا حافظ کامریڈی۔ شاید میں تمہیں خط لکھوں۔۔۔ میں جہاں بھی رہوں گی، تمہاری شرافت کی مداح رہوں گی۔ خدا حافظ۔''
ہم نے ہاتھ بھی نہیں ملائے۔ میں عمارت سے نکلا تو بٹلر دروازہ کھولنے کے لیے میرا منتظر تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ ''کیا آج آپ جنرل سے ملاقات نہیں کریں گے، جناب عالی!''
''نہیں۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔''
''شکریہ جناب! آپ اس گھر کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے۔''
میں وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا اور گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

☆☆

ایٹ ایم ایم

سید احتشام

پچھلے کچھ سالوں میں میڈیا میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے کی نسبت زیادہ تشدد دکھایا جاتا ہے اور زیادہ وحشیانہ بھی تشدد فلموں اور گانوں حتی کہ ویڈیو گیمز کا اہم عنصر بن گیا ہے۔ ان میں قتل اور جنسی زیادتی کو اچھا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ تشدد ایک منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ ایک ایسی مظلوم لڑکی کی کہانی جو شوق ہاتھوں ایسے ہی ظالم لوگوں میں پھنس گئی تھی۔

اذیت ناک آزمائش سے دوچار ایک لڑکی کا فسانہ

وہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں تھا اور پچھلے کئی دنوں سے شہر در شہر ایک نوجوان کا پیچھا کرتا آ رہا تھا جو اپنی حسین و جمیل بیوی کو چھوڑ کر اپنی شوخ و شنگ محبوبہ کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا تھا۔۔۔ میامی کلیولینڈ، کیلی فورنیا۔۔۔ سراغ رساں ویلس ہر جگہ سائے کی طرح ان کا تعاقب کرتا ہوا اپنے ننھے سے کیمرے سے ان کی تصویریں کھینچتا رہا تھا۔ اس کام کے لیے ایک لیڈی سینیٹر نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں، جسے شک تھا کہ اس کا داماد اس کی خوبرو بیٹی اور دو پیارے پیارے سے بچوں کو چھوڑ کر کسی حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

ویلس نے چند روز کے بعد واپس آ کر لیڈی سینیٹر کو اپنی رپورٹ دیتے ہوئے آدھی درجن تصویریں بھی اس کے حوالے کر دیں جن میں اس کا داماد ایک حسینہ کے ہمراہ نظر آ رہا تھا۔

''آپ کا داماد دن میں فرنچائز ڈرائی کلینگ کا کاروبار کرتا تھا اور ہر رات وہ ''مجھے بچوں کی فکر لاحق ہے۔''

سراغ رساں ویلس کی نظر اپنے سامنے میز پر پڑے ہوئے تازہ اخبار پر چلی گئی۔ اخبار ''دی پیٹری اوٹ'' کی سرخی یہ تھی۔ ''صنعتی زادا 8 سال کی عمر میں چل بسا۔''

ویلس کو اس صنعتی زاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ تو اس کے جینے سے اور نہ ہی مرنے سے لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ مسٹر کرسچین، جسے اخبار نے ''زاد'' کے خطاب سے نوازا تھا، ملک کا سب سے بڑا صنعت کار تھا اور ملک کا بچہ بچہ اسے جانتا تھا۔ وہ ایک افسانوی شخصیت کا حامل تھا۔ ویلس نے اخبار کی سرخی پر سے نظریں ہٹا کر لیڈی سینیٹر کی طرف دیکھا۔ ''میرا بل لفافے میں موجود ہے۔ اگر کام ختم ہو گیا ہے تو۔۔۔!'' اس نے ہچکچا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''جی، مسٹر ویلس، شکریہ۔'' لیڈی سینیٹر نے آگے بڑھ کر اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

''یقیناً سینیٹر، بتائیں اگر میں آپ کے لیے مزید کوئی خدمت انجام دے سکوں۔۔۔!''

''میں رابطے میں رہوں گی۔'' سینیٹر خوش دلی سے بولی۔ ویلس مڑ کر اس کے خوش نما اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس کی غیر موجودگی میں برف باری ہوئی تھی اور ہر شے برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ مضافات



میں واقع اپنے گھر کے سامنے کار روک کر اترا اور اندر داخل ہوا۔ ''ہیلو۔'' وہ اپنی بیوی کو پکارتا ہوا آگے بڑھا۔

''تم آ گئے؟'' اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی۔ ''ہم یہاں پچھلے حصے میں ہیں۔۔۔ تحقیقات کیسی رہیں؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ اچھی رہیں۔'' وہ کوک کی ایک بوتل فریج سے نکالتا ہوا بولا۔ ''نصابی کتاب کی مصروفیت کیسی رہی؟''

''مجھے دس ہزار الفاظ کا ایک مضمون وفاقی تھیٹر پروجیکٹ پر موصول ہوا ہے۔''

''تو۔۔۔ دن اچھا گزرا؟''

''میامی کیسا تھا؟''

''اچھا تھا۔'' اس نے کہا اور اپنی بیوی کی گود سے اپنی شیر خوار بچی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ ''ہیلو، سنڈریلا، کیا تم نے میری کمی محسوس کی؟''

شیر خوار سنڈریلا اسے دیکھ کر خوشی سے مسکرانے لگی۔ ''اس نے تمہاری کمی محسوس کی اور میں نے بھی کی۔'' اس کی بیوی چاہت آمیز لہجے میں بولی اور اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ کیا تم سگریٹ پیتے رہے ہو؟ اس نے ہنس کر پوچھا۔

''سگریٹ؟ تم جانتی ہو کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' ویلس نے حیرت سے جواب دیا۔

اس کی بیوی پھر ہنس پڑی۔ ''تمہارے پاس سے سگریٹ کی بو آ رہی ہے۔''

''میں نے اس شخص کے تعاقب میں شراب خانوں اور دوسری جگہوں پر وقت گزارا ہے۔'' ویلس سنجیدگی سے بولا۔ ''تم ہر وقت مجھ سے اس بات پر جھگڑتی رہتی ہو۔''

میں رات کا کھانا بناتی ہوں۔ کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟"

"کیا تم کھانا پکا رہی ہو؟"

وہ کپڑے بدلنے چلا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی بیوی نے پکار کر اس سے کہا۔" جان من، تمہارا فون آیا ہے۔" وہ اضافی لائن پر تھی۔

"ٹھیک ہے، میں نے اٹھالیا ہے۔" ویلس نے اپنی میز پر پہنچ کر ریسیور اٹھالیا۔" ہاں، کون بول رہا ہے؟ اچھا، آپ سے شناسائی پیدا کرنا میرے لیے خوشی کی بات ہے، مسٹر لونگ ڈیل۔" وہ بولا۔" میں آپ کی کس طرح مدد کرسکتا ہوں؟" اس نے ایک سگریٹ سلگالیا۔" چار بجے ٹھیک رہے گا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ مجھے معلوم ہے، یہ رہائش گاہ کہاں واقع ہے۔۔۔ میں پہنچ جاؤں گا۔۔۔ ٹھیک ہے۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

وہ کوٹھی شہر کے نواح میں واقع تھی۔ ویلس، مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔" مسٹر ویلس، میں ڈینئل لونگ ڈیل ہوں۔ آپ سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔" ایک شخص نے اس کا استقبال کیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک خوش لباس شخص تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے، چہرے پر سیاہ مونچھیں تھیں اور آنکھوں پر عینک تھی۔

کوٹھی اندر سے نہایت پرشکوہ تھی۔ دیواروں پر جا بجا بڑی بڑی انتہائی بیش قیمت پینٹنگز نظر آرہی تھیں۔" میں مسز کرسچن کا وکیل ہوں۔" وہ شخص، ویلس کی رہنمائی کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔" اور ان کی جائیداد پر اختیار رکھنے والوں میں سے ایک ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ویلس، اس کی رہنمائی میں آگے بڑھتا رہا۔ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک ضعیف خاتون آتش دان کے قریب بچھی ہوئی ایک شاندار کرسی پر براجمان تھی اور ان دونوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔" یہ مسز کرسچین ہیں۔" وکیل لونگ ڈیل نے قریب پہنچ کر ویلس کا اس سے تعارف کرایا۔

"آپ سے ملنا میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے، میڈم۔" ویلس ادب سے بولا۔

"آپ کا کام قابل تعریف ہے، مسٹر ویلس۔" ضعیف خاتون نے مسکراتے ہوئے توصیفی لہجے میں کہا۔" میں نے آپ کی شہرت سنی ہے۔"

"میں نے ہیرس برگ، لنکاسٹر اور ہر جگہ اپنے مددگاروں سے بات کی ہے۔" وکیل بول پڑا۔" بااثر جگہوں پر آپ کے دوست ہیں۔"

"مجھے ایسے لوگوں کی خدمت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے جو میرے نزدیک قابل تعریف ہیں۔" ویلس، مسز کرسچین سے مخاطب ہوکر بولا۔

"تمہاری ذہانت کی تعریف سنی گئی ہے۔" مسز کرسچین نے کہا۔" معاملات کو خفیہ رکھنے کے بارے میں بھی تمہاری حمایت کی گئی ہے۔"

"شکریہ مادام۔" ویلس ممنونیت سے بولا۔

مادام نے اپنے وکیل کو اپنی وہیل چیئر گھمانے کا اشارہ کیا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وکیل نے فوراً تعمیل کی۔ مادام کہہ رہی تھی۔" جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، میرے شوہر کی حال ہی میں رحلت ہوئی ہے۔"

"جی، میری تعزیت، مسز کرسچین۔"

مادام کے سیکریٹری نے بڑھ کر مطالعہ گاہ کا شاندار چوبی دروازہ کھولا اور وہ تینوں اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرا بھی اپنے ساز و سامان کی وجہ سے شان و شوکت کا مظہر تھا۔ مسز کرسچین کہہ رہی تھی۔" ان کی وفات نے مجھے عجیب گومگو کی کیفیت سے دوچار کردیا ہے۔"

"میں آپ کی مدد کے لیے جو بھی کرسکتا ہوں، کروں گا۔" ویلس اس کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

"یہ آفس محض میرے شوہر کی مطالعہ گاہ تھی۔ اس کمرے میں زیادہ لوگ نہیں آئے۔"

"آپ کے شوہر تو ایک افسانوی شخصیت تھے۔" ویلس نے تبصرہ کیا۔

ویلس احترام سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

مادام کہہ رہی تھی۔ ''ہماری شادی کو 45 سال ہو گئے تھے۔۔۔ چار بچے ہوئے۔۔۔ سات پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں۔۔۔ لیکن میرے شوہر کا اصل جذبہ ان کے کام میں مضمر تھا۔ وہ ہمیشہ وفادار رہے۔ میں ان سے محبت کرتی تھی۔۔۔ گہرائی سے۔۔۔!'' وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئی۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' ویلس متانت سے بولا۔

مادام نے وکیل کو قدرے بلندی پر نصب ایک قد آدم پینٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے کھولو۔''

اس کے پیچھے درحقیقت ایک تجوری تھی۔ وکیل نے اس کا پٹ کھول دیا۔ مادام کہہ رہی تھی۔ ''یہ میرے شوہر کی تجوری ہے۔ اس کے اندر کی چیزوں کو میں نے ہر ایک کی نظر سے بچائے رکھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اس میں میرے شوہر کی بہت نجی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے کبھی۔۔۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔۔۔!''

''کیا آپ بتائیں گی کہ آپ کو اس تجوری میں کیا ملا، مسز کرسچین؟''

''نقدی، اسٹاک سرٹیفکیٹ۔۔۔ عام چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں۔۔۔!'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''فی الحقیقت سوائے اس کے۔۔۔!''

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی وکیل نے تجوری میں سے ایک 8mm کی چھوٹی سی فلم ریل نکال کر میز پر رکھ دی۔ مسز کرسچین اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''یہ ایک فلم ہے۔۔۔ اس میں ایک نوخیز لڑکی کو قتل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔'' ویلس نے قدرے اچنبھے سے کہا۔

''لیکن بہت سے لوگ روزانہ فلموں میں اور ٹی وی پر حقیقی انداز میں مرتے نظر آتے ہیں۔'' وکیل بول پڑا۔

''یہ ذرا نمائشی قسم کی بے کار فحش فلم ہے۔ یہ فحاشی سے شروع ہوتی ہے اور تیزی سے تشدد اور خون ریزی کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔''

ویلس نے بڑھ کر وہ فلم ریل اٹھا لی۔ ''ایسا لگتا ہے کہ آپ فحش اور قتل کی فلم کی بات کر رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''ان کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ فحش اور قتل کی فلم ایک جیسی ہوتی ہیں۔'' مسز کرسچن نے کہا۔ ''یہ غالباً اذیت سے لذت حاصل کرنے والے رجحان کی کوئی فلم ہے۔ کیا تم یہ فلم دیکھو گے اور اپنے خیال کا اظہار کرو گے؟ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ تشدد نقلی ہے یا نہیں۔ میں ثبوت چاہتی ہوں۔''

ویلس، 8mm کی وہ فلم ریل لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

گھر آ کر اس نے تنہائی میں وہ فلم دیکھی اور خوف و دہشت سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فلم میں ایک کسرتی جسم کے مالک نقاب پوش کو ایک انتہائی خوبرو، نوخیز لڑکی پر تشدد، عصمت دری اور آخر میں چاقو کے پے در پے وار کر کے قتل کرتے ہوئے دیکھایا گیا تھا۔۔۔ اگلے دن وہ پھر مسز کرسچین کے در دولت پر حاضر ہوا۔

''جس نے بھی یہ فلم بنائی ہے، وہ مصدقہ طور پر اس کا علم رکھتا ہے۔'' وہ مادام سے بولا۔ ''لیکن میں ماہر نہیں ہوں۔ میں مشورہ دوں گا کہ اس سلسلے میں پولیس کوئی فیصلہ کرے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ مشورہ بہت سی وجوہات کی بنا پر قابل قبول نہیں۔'' وکیل لونگ ڈیل نے اعتراض کیا۔ ''سب سے اہم وجہ مسٹر کرسچین کی ساکھ ہے۔ ہم تم سے چاہتے ہیں کہ تم بتاؤ کہ یہ فلم کس نے بنائی ہے اور معلوم کرو کہ یہ اصلی ہے یا نہیں۔ تم صاف طور پر اپنی قیمت بتا سکتے ہو اور معلومات خریدنے کے لیے جو بھی کچھ تمہیں درکار ہوگا، فراہم کر دیا جائے گا۔''

''میرے پاس آگے بڑھنے کے لیے واحد راستہ فلم والی لڑکی ہے'' ویلس نے کہا۔ ''میں اسے ایک گم شدہ

شخصیت کے کیس کے طور پر لے کر چلوں گا۔ سمجھ گئے؟''
''بالکل۔۔۔ ہمیں اس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ تم کسی بھی ال مین فلم کی نقل تیار نہیں کرو گے۔''
''اس کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں لیکن میں آپ سے براہ راست رابطہ رکھوں گا، مسز کرسچین، صرف آپ سے۔۔۔ آپ کے وکیل سے آپ کے تعلقات آپ کے اپنے ہیں۔ برا نہ مانیے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس پر اچھی طرح غور کرلیا ہوگا۔ آپ یہ فلم ضائع بھی کرسکتی تھیں۔''
''مجھے یہ بتادو کہ بے چاری لڑکی قتل نہیں ہوئی۔ پلیز، اسے زندہ ڈھونڈو۔'' مسز کرسچین نے التجا کی۔
''میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔'' ولیس نے جواب دیا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

''تم ابھی کلولینڈ سے اپنے گھر لوٹے تھے۔'' اس کی بیوی نے اس کے نئے کیس کے بارے میں شکایت آمیز لہجے میں کہا۔
''مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ میں ٹھہر سکوں مگر ہمارے مکان کے رہن کا مسئلہ بھی تو ہے اور سنڈی کے کالج کے اخراجات کی رقم کا بھی مسئلہ ہے۔ اگر میں مسز کرسچین کے کیس میں کامیاب ہوگیا تو جس حلقے میں ان کا آنا جانا ہے، یہ سمجھ لو کہ مجھے وہ کامیابی حاصل ہوگی، ہم جس کے منتظر تھے۔'' وہ اپنا سامان باندھنے لگا تھا۔
''مجھے نہیں معلوم کہ ہم کامیابی کے منتظر تھے۔'' اس کی بیوی ہنس کر بولی۔
''تمہارے والد شاید ایسا سوچتے ہوں۔'' ولیس نے جواب دیا۔
''تو۔۔۔ مسز کرسچین کیسی تھیں؟''
''جیسی تمہاری توقع تھی۔'' وہ بولا۔ ''مجھے ان پر افسوس ہے۔ ایک گم شدہ شخصیت کا کیس ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں انہیں چند ہفتے دوں گا۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اس میں کامیابی غیر یقینی ہے۔ یہی کچھ ہے جو میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ کبھی کبھی بہتر ہے کہ تمہیں بھی معلوم نہ ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔'' اس نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔
''ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔''
اسی وقت بچی کے رونے کی آواز سنائی دی۔''
بچی رو رہی ہے، میں جا رہی ہوں۔'' اس کی بیوی نے کہا اور جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔
ولیس اپنے سوٹ کیس میں پستول رکھنے لگا۔ اس لمحے اس کی بیوی لوٹ آئی۔ ''تم پستول لے کر جا رہے ہو؟''
''مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' وہ بولا۔
''تو پھر مت لے کر جاؤ۔''
''یہ سب صرف حفظ ماتقدم کے طور پر ہے۔ میرے متعلق پریشان مت ہو۔''
''جب تم وہاں پہنچو گے تو کیا براہ کرم فون کرو گے؟''
''کوشش کروں گا۔'' وہ بولا اور اپنی کار میں سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ سیدھا کلیولینڈ کے ریسورس سینٹر پہنچا اور سینٹر کے سربراہ سے ملا۔ سربراہ چھوٹے قد، کسرتی جسم اور چوڑے چہرے کا مالک ایک گنجا شخص تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ اس کی عمر تیس سے پینتیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ ولیس اس کے سامنے بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مخاطب ہوا۔ ''فلاڈیلفیا میں رہنے والے ایک جوڑے نے جو ایک ڈاکٹر اور اس کی بیوی ہیں، میری خدمات حاصل کی ہیں۔'' اس نے ایک من گھڑت قصہ سناتے ہوئے کہا۔ ''چند روز گزرے، انہوں نے ہائی وے 81 پر ایک لڑکی کو لفٹ دی۔ شاید اٹھارہ سال کی ہوگی، گھر سے بھاگی ہوئی۔ انہوں نے اس کے لیے کھانا خریدا، کھانے کے دوران ڈاکٹر اسے اس بات پر قائل کرتا رہا کہ اگر وہ اپنے گھر فون کردے۔۔۔ بغیر کسی تکلیف کے لڑکی نے کھانا کھایا، معذرت چاہی اور آخری موقع تھا، جب انہوں نے اسے دیکھا۔ میرا ایک دوست

پولیس میں ہے۔ اس نے اس کا یہ اسکیچ تیار کیا ہے۔‘‘ اس نے کوٹ کی جیب سے لڑکی کا اسکیچ نکال کر سربراہ کی طرف بڑھا دیا، جو اس نے خود تیار کیا تھا۔ ’’وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں اس لڑکی کو پہچان سکوں اور پھر اس کے والدین کو پیغام دے دوں۔۔۔ اور یہ بات ان کے علم میں لاؤں کہ بچی زندہ اور صحیح سلامت ہے۔‘‘ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا شناختی کارڈ بھی سربراہ کی طرف بڑھا دیا۔

’’آپ برا نہ مانیں تو میں ذرا چیک کرلوں؟‘‘ سربراہ نے اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر کہا۔

’’جی ضرور۔‘‘

تھوڑی دیر کے بعد دونوں میز پر سے اٹھ گئے۔ سربراہ ویلس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ’’آپ کو معلومات چاہیے تھیں، وہ آپ کو مل گئیں۔ آپ نے اپنا سر کھپا ڈالا۔ تقریباً آٹھ لاکھ پانچ ہزار سے لے کر دس لاکھ افراد ہر سال لاپتا ہو جاتے ہیں۔ ہم کمپیوٹر پر جتنا کچھ رکھ سکتے ہیں، رکھتے ہیں، اس کے علاوہ کیلیے انگوٹھے کا نشان، فائلیں، ریاست یا لاپتا ہونے کے سال کے حساب سے رکھی ہیں۔ ہم نے بچوں اور بڑوں کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔‘‘

☆☆☆

ریسورس سینٹر اس گمشدہ لڑکی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ویلس کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر گھر فون کیا۔ ’’ممی، یہ میں ہوں۔‘‘

’’ہیلو، تم کیسے ہو؟‘‘ اس کی بیوی نے پوچھا۔ ’’تم کہاں ہو؟‘‘

’’میں ابھی تک کلیولینڈ میں ہوں۔۔۔ میں کل رات کو تمہیں کال کروں گا۔ شب بخیر۔‘‘

’’ٹھیک ہے، شب بخیر۔‘‘

ویلس نے ریسیور رکھ دیا اور لڑکی کی تصویر کو پروجیکٹر پر چلا کر اسے اپنے کمپیوٹر میں منتقل کر کے اس کی اسکیننگ کرنے کے بعد پرنٹر سے اس کی رنگین تصویر نکال لی اور اس تصویر کو اپنے کمرے کی دیوار سے چپکا دیا۔ اگلی صبح اس نے ایک پبلک بوتھ سے مسز کرسچین کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ ’’ہیلو مسز کرسچین، میں ٹام ویلس بول رہا ہوں۔ اس وقت ہمارے پاس یہ معلومات ہیں۔ میں نے فلم کا اسٹاک چیک کیا ہے۔۔۔ یہ سپر ایکس 4-4-5 کہلاتی ہے۔ اب جس کمپنی نے اس کا اسٹاک بند کیا، وہ 1992 میں کیا۔‘‘

’’تو۔۔۔ فلم اس سے پہلے بنائی گئی تھی؟‘‘ مسز کرسچین نے پوچھا۔

’’ہاں، اور میں بہت باریک بینی سے دیکھ رہا ہوں۔ مگر آپ کو بھی اپنے شوہر کے مالیاتی ریکارڈ کو دیکھنا ہوگا۔ تقریباً چھ یا سات سال پہلے کا ریکارڈ۔ ہوسکتا ہے، تمام چیزوں میں کوئی چیز دکھائی دے جائے۔ ظاہر ہے، یہ ایسی فلم تو ہے نہیں کہ آپ دکان پر چھوڑیں اور ایک گھنٹے میں تصویریں تیار۔‘‘

’’تو تم سمجھتے ہو کہ یہ اپنی نوعیت کا واحد معاملہ ہے؟‘‘ مسز کرسچین نے پوچھا۔

’’جو فلم کیمرے سے بنی تھی، وہ ہمارے پاس ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’کوئی نیگیٹو ہے نہیں۔۔۔ ویڈیو کے برعکس اس کی نقل تیار نہیں کی جاسکتی۔ یہ جو بھی ہے، مجھے شبہ ہے کہ اس کی زیادہ نقلیں تو دستیاب نہیں ہیں۔۔۔ مسز کرسچین، میں ایک ایسی لڑکی کو تلاش کر رہا ہوں جس کے بارے میں یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لاپتا ہے اور یہ واقعہ چھ یا سات سال پہلے ہوا تھا اور میں ان لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہوں جنہوں نے یہ فلم بنائی تھی۔ صاف بات یہ ہے کہ یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔‘‘

’’لیکن میں جانتی ہوں کہ تم یہ کام کرسکتے ہو۔‘‘ مسز کرسچن نے کہا۔ ’’تم ایک حیرت انگیز کام کر رہے ہو۔ پلیز، مجھے بتاؤ کہ کیا تم اس تفتیش کو جاری رکھو گے؟‘‘

’’میں آپ کے لیے کوشش جاری رکھوں گا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’آپ مجھ پر انحصار کرسکتی ہیں۔

خدا حافظ، مسز کرسچن۔“

اس رات اس نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں ایک بار پھر پروجیکٹر پر فلم چلا کر فلم کے اس منظر کو اسٹل کر کے اپنے کمپیوٹر کے کیمرے میں قید کر لیا جس میں نقاب پوش قاتل، لڑکی کے گلے پر چاقو رکھ رہا تھا اور وہ تصویر اسکینگ کر کے پرنٹر کے ذریعے اس کی ایک بڑی کاپی نکال لی۔ اب اس نے اس منظر میں ایک اہم بات نوٹ کی، جسے وہ پہلے نظر انداز کر بیٹھا تھا۔ اس منظر میں نقاب پوش کے داہنے ہاتھ کی پشت پر انگوٹھے کے پاس ایک چھوٹا سا دائرہ تھا اور اس دائرے میں ایک ستارہ گودا ہوا تھا۔

اگلی صبح وہ نارتھ کیرولینا کے پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچ گیا اور ایسے گم شدہ بچوں کی سیکڑوں فائلوں میں سے اس لڑکی کی تصویر اور اس کی تفصیلات ڈھونڈنے لگا جو 1990ء سے 1993ء تک غائب ہوئے تھے۔ کافی چھان بین کے بعد بالآخر اسے ایک ایسی شیٹ مل گئی جس پر ایک لڑکی کی رنگین تصویر چسپاں ہونے کے علاوہ اس کے مکمل کوائف موجود تھے۔ اس نے اپنے پرنٹر سے نکلی ہوئی تصویر کا اس تصویر سے موازنہ کیا۔ وہ یقیناً وہی لڑکی تھی۔ اس کا پورا نام میری این میتھوز تھا۔ عمر 12 سال۔ وہ 1993ء سے لاپتا تھی۔ قد 5 فٹ 4 انچ، وزن 107 پونڈ، بالوں کا رنگ براؤن، آنکھوں کا رنگ براؤن، پتا۔۔۔

وہ وہاں سے سیدھا اس پتے پر پہنچ گیا لیکن گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ لوٹنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ پڑوسن بازار سے سودا لے کر لوٹ آئی۔ ”کیا تم جینیٹ کو ڈھونڈ رہے ہو؟“ اس نے اپنے مکان کی سیڑھی چڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، وہ کہاں ملے گی؟“ ویلس نے سوال کیا۔

پڑوسن نے اسے اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا پتا بتا دیا جہاں جینیٹ کام کرتی تھی۔ ویلس اس اسٹور پر پہنچ گیا۔ جینیٹ کیش رجسٹر پر کھڑی کیش گن رہی تھی۔ وہ ایک ملازم کے بتانے پر جینیٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ”ہیلو مسز میتھیوز، میں ٹام ہارٹ ویلس ہوں۔“ وہ مخاطب ہوا۔

جینیٹ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک غیر دلکش عورت تھی۔ حزن و ملال نے جیسے اس کے چہرے سے ساری شادابی نچوڑ لی تھی۔ ”میں ایک لائسنس یافتہ سرکاری سراغ رساں ہوں۔“ ویلس کہہ رہا تھا۔ ”یو ایس ریسورس سینٹر نے میری خدمات حاصل کی ہیں، لاپتا لوگوں کے سلسلے میں۔۔۔ جو انٹرنل آڈٹ کا ایک حصہ ہے۔ میں آپ سے ملاقات کا وقت لینا چاہوں گا۔“ ”آپ کی بیٹی میری این کی گمشدگی سے متعلق سوالات کے جوابات دینے کے لیے۔۔۔ آپ کے ایف بی آئی کے ایجنٹ سے کل میری ملاقات ہوئی تھی۔“

”فائل کول سے؟“

”جی، ایجنٹ کول۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ آپ کو ٹیلی فون کرے گا اور آپ سے کہے گا کہ میرا انتظار کریں، کیا اس نے فون کیا؟“

”نہیں۔“ جینیٹ نے نفی میں جواب دیا۔

☆☆☆

جینیٹ اسے لے کر اپنے گھر آ گئی اور وہ دونوں دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے لگے۔ جینیٹ نے اسے اپنے بچپن کی تصویریں دکھائیں۔ ”کیا یہ آپ ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”پانچ سال کی لگ رہی ہیں۔“

”تھوڑی زیادہ۔“ جینیٹ پہلی بار مسکرائی۔

”پیاری تصویر ہے۔“ ویلس نے تبصرہ کیا اور تصویریں میز پر رکھ کر اصل موضوع پر آ گیا۔ ”یہ اہم ہے کہ اس سے آپ کی توقعات نہ بڑھ جائیں۔ اس سے دیگر تحقیقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں، پلیز، جان لیں کہ میرے یہاں ہونے سے آپ کوئی امید نہ باندھ لیجیے گا۔“ وہ گہری متانت سے کہہ رہا تھا۔

”ہم ہر وقت لڑتے رہتے تھے۔“ جینیٹ گویا ہوئی۔ ”میری این، میں اور اس کا سوتیلا باپ۔۔۔

وہ اس سے نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ اس کا حقیقی باپ نہیں تھا۔ گھر میں مسئلہ، اسکول میں مسئلہ۔۔۔ اسے اصول پسند نہیں تھے۔ وہ میری طرح تھی۔۔۔ میرا خیال ہے، مجھے مشکلات سے گزرنا پڑا۔"

"کیا میں آپ کے شوہر سے بات کر سکتا ہوں؟" ویلس نے پوچھا۔ "یعنی اس کے سوتیلے باپ سے؟"

"ڈیو سے؟ وہ چلا گیا۔۔۔ میری این کے جانے کے دو سال بعد ہی۔۔۔" جینیٹ نے جواب دیا۔ "میری این ہر وقت بہت برا محسوس کرتی تھی۔ میں نے اس کی وجہ سے ڈیو کو کھو دیا۔۔۔ اور میں نے میری این کو بھی کھو دیا۔ اب صرف میں یہاں ہوں۔"

"میری کا کوئی بوائے فرینڈ تھا؟" ویلس نے پوچھا۔

"وہ چھپ کر کسی سے ملتی تھی۔" جینیٹ نے جواب دیا۔

"اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کون تھا۔۔۔ جب وہ گھر لوٹتی تو اس کے چہرے پر سرخ نشانات ہوتے۔۔۔ وہ ان نشانات کے بارے میں جھوٹ بول دیتی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں یہ سوال پوچھ رہا ہوں۔" ویلس بولا۔ "مگر ان حالات میں سوتیلے باپ کے ساتھ ایسے مجرمانہ حملے وغیرہ کی کوئی علامت تھی؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں تھا۔" جینیٹ نے جواب دیا۔ "پولیس اور ایف بی آئی نے پوچھا تھا لیکن کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہوتا تو وہ مجھے بتا دیتی۔"

"میں معافی چاہتا ہوں، مجھے پوچھنا پڑا۔" ویلس نے کہا۔ جینیٹ اسے اپنی بیٹی کے کمرے میں لے گئی جہاں ہر شے جوں کی توں سجی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی میز پر سالگرہ کے تحائف کے پیکٹ بھی ویسے کے ویسے رکھے ہوئے تھے۔ "یہ اس کی سالگرہ کے ہیں۔" جینیٹ بولی۔ "جب سے وہ گئی ہے، تب سے ہر سال ایک تحفہ۔۔۔ یہ تحائف اس کے منتظر ہیں کہ وہ کب واپس آئے گی۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ میں نے اسے تھپڑ مارا تھا، میں جانتی ہوں۔ ہم ا[illegible] کے متعلق لڑ رہے تھے اور وہ مجھے غصہ دلا رہی تھی اور میں نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اگلے دن وہ جا چکی تھی۔"

"جب بچے گھر سے بھاگتے ہیں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی تحریر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر احساس جرم ہوتا ہے۔" ویلس بولا۔

"کوئی تحریر نہیں تھی۔" جینیٹ نے جواب دیا۔ "پولیس نے دیکھا تھا۔"

"اغوا اور چیز ہے، گھر سے بھاگنا اور چیز۔" ویلس نے کہا۔ "بعض اوقات یہ پولیس کی ترجیحات میں نہیں ہوتا جو کہ ہونا چاہیے۔ کیا کوئی تحریر وغیرہ نہیں ملی؟"

"کیا آپ نہیں سمجھتے، میں چاہتی تھی کہ ہو؟"

"آپ شاید ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر کیا آپ مجھے دیکھنے دیں گی؟"

"آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں آپ سے کوئی امید نہ باندھوں۔۔۔ کوئی توقع قائم نہ کروں۔۔۔ آگے بڑھیے۔۔۔!" اس نے میری این کی میز کی درازوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں ذرا ڈرنک لے لوں۔۔۔ مجھے ڈرنک کی ضرورت ہے۔"

"شکریہ۔"

جینیٹ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ویلس اس کی بیٹی کی درازوں کو کھنگالنے لگا۔ لیکن وہاں اسے کوئی قابل ذکر شے نہیں ملی۔ اس نے کمرے کی لائٹ بجھا دی اور دبے پاؤں ملحقہ باتھ روم میں رینگ گیا۔ اس نے سوئچ آن کیا اور باتھ روم کا جائزہ لینے لگا، جو میری این کے لاپتا ہونے سے اب تک استعمال نہیں ہوا تھا۔ ڈبلیو سی پر لکڑی کے پرانے گرد آلود تختے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ایک تختے کو اٹھا کر زمین پر رکھا اور پھر ڈبلیو سی کے پیچھے جھانکا۔ وہاں اسے کوئی شے نظر آئی۔ اس نے ہاتھ ڈال کر وہ شے نکال لی۔ یہ ایک خوشنما ڈائری تھی جو پلاسٹک کے کور میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے ڈائری نکالی اور اس کے اوراق پلٹنے لگا۔ ڈائری کے بیچ میں

ایک خط تہ کیا ہوا رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے خط کو کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔۔۔ ڈیئر ممی۔۔۔ اگر آپ یہ پڑھیں۔۔۔ اس کا مطلب شاید یہ ہوگا کہ میں آپ کو ہالی ووڈ، کیلی فورنیا سے فون کر رہی ہوں، میں اپنی ڈائری چھوڑے جا رہی ہوں کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کیوں جا رہی ہوں۔ اور ایسا اس لیے ہرگز نہیں ہے کہ آپ نے مجھے مارا تھا۔ میں نے اسے چھپا دیا کہ کہیں ڈیو ذلیل کو نہ مل جائے۔۔۔ وارن اینڈرسن اور میں محبت کرتے ہیں اور میں اس کے ساتھ ایک بالکل نئی زندگی شروع کر رہی ہوں۔ وارن کے والد کا قصبے میں گیراج ہے لیکن وارن کے ذہن میں زیادہ بڑے منصوبے ہیں۔ وارن ایکشن فلموں کا اسٹار بننا چاہتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ میں فلموں میں کام کرنے والی بہت سی لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت ہوں اور اسٹار بن سکتی ہوں۔ جب ہم کار کے ذریعے ہالی ووڈ پہنچیں گے تو ہر کوئی میری آنکھوں کے جذباتی تاثر کو دیکھے گا کیونکہ میں محبت کی اسیر ہوں۔۔۔!

اچانک جینیٹ کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''آپ کو ڈرنک چاہیے؟''

اس نے خط جلدی سے اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور باتھ روم سے باہر آ گیا۔ ''آپ درست کہہ رہی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں ملا۔'' وہ جینیٹ سے بولا۔

''آپ کے لیے ڈرنک تیار ہے۔'' جینیٹ مسکرائی اور گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں، شکریہ۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میں کل رات کو آؤں گا۔''

وہ باہر آ گیا اور وارن کے باپ کے گیراج کی طرف جاتے ہوئے اپنی جیب سے پھر وہ خط نکال کر پڑھنے لگا۔ آگے لکھا تھا۔۔۔ ''جب آپ یہ پڑھ رہی ہوں گی تو غالباً ہم شادی کر چکے ہوں گے۔ مجھے تلاش مت کیجیے گا کیونکہ میں واپس نہیں آؤں گی۔ شاید کسی دن آپ مجھے ٹی وی پر یا رسالوں میں دیکھیں۔ میری فکر مت کریں۔۔۔ پیار۔۔۔ میری این۔۔۔!''

وہ وارن کے باپ کے گیراج پہنچا تو اس نے ایک ضعیف شخص کو ایک کار کے کھلے بونٹ پر جھکا ہوا پایا۔ ''مسٹر اینڈرسن۔۔۔!''

''کون ہے؟'' اینڈرسن سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف مڑا۔

''میرا نام ٹام ہارٹ ہے۔''

''ہاتھ نہ ملانے پر معذرت خواہ ہوں۔'' اینڈرسن بولا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''مجھے آپ کے بیٹے کی تلاش ہے۔'' ولیس نے کہا۔

''آپ کا ایک بیٹا وارن ہے۔ ٹھیک ہے؟''

بوڑھا شخص کام روک کر پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا اس سے کیا معاملہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا تم ایک پولیس آفیسر ہو؟''

''نہیں۔'' ولیس سٹپٹا گیا۔ ''میں اس کا ایک پرانا دوست ہوں۔ دراصل میں اس کا تھوڑے پیسوں کا مقروض ہوں۔''

بوڑھا شخص پہلی بار مسکرایا۔ ''تم اس کے مقروض ہو؟ یہ نئی بات ہے۔ خیر، اگر تم چاہو تو رقم یہاں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔''

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں رقم اسے بھیجنا چاہوں گا۔۔۔ کیلی فورنیا۔۔۔ ٹھیک ہے؟''

''کیلی فورنیا؟'' بوڑھا شخص پھر مسکرایا۔ ''بیٹے تمہیں معلوم ہے کہ لفے یاٹی ویلی جیل کہاں ہے؟ وارن وہاں ہے۔ نقب زنی اور ڈکیتی کے سلسلے میں آٹھ مہینے کی سزا کاٹ رہا ہے۔''

''شکریہ۔'' ولیس بولا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

وہ وہاں سے سیدھا لفے یاٹی جیل پہنچ گیا جو ریاست الی نوائے میں شکاگو کے قریب ہی واقع تھی۔ اس وقت وارن ایک وائپر سے فرش کی صفائی کر رہا تھا۔ ولیس اس کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ وارن بدستور صفائی کرتا رہا۔ ''کیا تم ایک لڑکی میری این میتھیوز کو

جانتے تھے؟'' ویلس نے پوچھا۔

''ہاں، میں اسے جانتا تھا۔'' وارن اپنا ہاتھ روکے بغیر بولا۔ ''لاس اینجلس جانے سے ذرا پہلے میں نے اس کتیا سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ وہ چوروں کی طرح میرا پیچھا کرتی ہوئی، میرے گھر پہنچی تھی۔ میں نے اس کتیا کو بتایا کہ وہ میری طرف سے جہنم میں جائے۔''

''وہ کہاں گئی؟''

''شاید جہنم میں۔'' وارن بولا۔ ''میں نہیں جانتا اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہوسکتا ہے، وہ کسی عریاں کلب میں کام ڈھونڈ لے یا اسی طرح کا کوئی کام۔۔۔ مجھ سے پوچھو تو اس کا اوپری دھڑ کچھ اتنا شاندار نہیں تھا۔''

''کیا پھر دوبارہ کبھی تمہاری اس سے بات ہوئی؟''

''اگر میرے اس سے تعلقات ہائی اسکول سے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے وہاں بھی لے جاؤں۔ وہ ہالی ووڈ آئی تھی، بڑی فلم اسٹار بننے کے لیے اور میں بھی۔۔۔ لیکن اب مجھے دیکھو کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔'' وہ وائپر روک کر ویلس کے سلگتے ہوئے سگریٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''تم مجھے ایک سگریٹ کیوں نہیں دیتے؟'' وہ بولا۔

ویلس نے اپنا سلگتا سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔ ''میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پلٹا اور جیل سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے اسی رات جینیٹ کے پاس پہنچ کر کال بیل بجائی۔ جینیٹ نے آ کر دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔ ''میں رات کا کھانا پکا رہی تھی۔'' وہ بولی اور واپس کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت وہ جرسی اور شارٹس پہنے ہوئے تھی۔

ویلس اس کے پیچھے چلتا ہوا کچن کے دروازے پر رک گیا۔ جینیٹ کہہ رہی تھی۔ ''میں نے دو افراد کے لیے کھانا پکا لیا ہے۔''

''معاف کیجیے گا، میں رک نہیں سکتا۔'' وارن بولا۔ ''میں صرف یہ بات آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس ایجنسی میں اپنے وکیل سے بات کی ہے اور ان سے میری این کے کیس کو جاری رکھنے کو کہا ہے۔''

''خیر، کم از کم ایک ڈرنک کے لیے تو رک جاؤ۔'' جینیٹ نے کہا اور ایک گلاس میں ڈرنک انڈیل کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ویلس نے گلاس تھام لیا۔

''تمہیں یقین ہے کہ تمہیں بھوک نہیں لگی ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''مجھے بہت دور جانا ہے۔''

''اکیلے کھانا بہت مایوس کن چیزوں میں سے ایک ہے۔'' جینیٹ بولی۔ ''تم سوچو گے کہ مجھے اب تک تو اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔''

ویلس اسے خاموشی سے کام کرتے ہوئے دیکھتا اور ڈرنک کی چسکیاں لیتا رہا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ''مسز میتھیوز۔۔۔!'' وہ ہچکچا کر رک گیا۔

''مجھے جینیٹ کہو۔'' وہ اس کی طرف پلٹ کر مسکرائی۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا تم نے بھی اس بات پر غور کیا ہے کہ۔۔۔ کیا تمہیں احساس ہوا ہے کہ ہوسکتا ہے، میری این اب کبھی واپس نہ آئے؟'' اس نے رک رک کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''میں روز اس پر سوچتی ہوں۔ جب بھی کبھی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔'' جینیٹ ہاتھ روک کر بولی۔ ''میں اب تک یہی سوچتی ہوں کہ یہ وہی ہے۔۔۔ اور وہی ہے جس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔''

''کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ اگر آپ کو انتخاب کرنا پڑتا۔۔۔ اگر آپ کو جبراً انتخاب کرنا پڑتا۔۔۔ اس تصور میں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، خوش ہے، اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن آپ نہیں جانتیں۔۔۔ آپ اسے نہیں تلاش کر سکتیں۔۔۔ یا

کہ یہ بدترین صورت حال بھی سچ ثابت ہوسکتی ہے کہ وہ مرچکی ہے۔لیکن آپ جان لیں گی۔۔۔آپ کو بالآخر معلوم ہوجائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔۔۔!''

''میں کیا منتخب کروں گی؟ ماں، میں جاننا چاہوں گی۔۔۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔۔۔!'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ کچن کی سلیب پر جھک کر سسکیاں لینے لگی۔

ویلس کچھ دیر تک اسے دکھی نظروں سے دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔''معاف کیجیے گا، مجھے آپ کا واش روم استعمال کرنا ہے۔''

جینیٹ نے سر ہلا کر اسے اجازت دے دی۔وہ خاموشی سے کچن سے نکل کر میری این کی خواب گاہ میں داخل ہوا اور اس کی میز پر رکھے ہوئے فوٹو فریم میں سے اس کی تصویر نکال کر چپکے سے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور کچن میں لوٹ آیا۔جینیٹ اب تک اپنی کیفیت پر قابو پاچکی تھی اور اس نے ایک سگریٹ سلگا لیا تھا۔ویلس نے اس کے عقب میں نمودار ہو کر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔''کیا تم جارہے ہو؟'' جینیٹ نے اس کی طرف مڑے بغیر پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔''اگر مجھے کوئی سراغ ملا تو میں فون کردوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے ہالی ووڈ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر راہ گیروں اور دکانداروں کو میری این کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھنے لگا کہ کیا انہوں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر وہ ایک بک اسٹال میں داخل ہوا جہاں فحش کتابیں، باتصویر رسالے اور جنس تشدد سے متعلق مختلف نوعیت کے آلات اور ماسک دستیاب تھے۔وہ اس خیال سے ان باتصویر رسالوں کا سرسری جائزہ لینے لگا کہ ممکن ہے ان میں میری این بھی کبھی جلوہ گر ہوئی ہو۔پھر اس نے تنہائی میں ان کو دیکھنے کے خیال سے ڈھیر سارے رسالے خرید لیے اور کاؤنٹر پر آ گیا۔بک اسٹال کا مالک ایک نوجوان لڑکا تھا جو اس وقت ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔اس لیے کتاب رکھ دی اور ویلس کے خریدے ہوئے رسالے گنتا ہوا بولا۔''مزے کریں گے، آج رات۔۔۔!''

''ہاں، ایسا ہی خیال ہے۔'' ویلس ٹالنے کے خیال سے بولا۔

''کیا آپ بیٹری والی جسمانی ساخت پسند کریں گے؟ اس میں ترغیب تو ہے لیکن۔۔۔!''

''نہیں، شکریہ۔''

''ٹھیک ہے۔آپ کا ٹوٹل 74 ڈالر 58 سینٹ ہوا۔''

ویلس نے رقم ادا کردی۔''جناب، میں بالغان کی کتاب کے اسٹور سے خریداری کرنے پر آپ کا مشکور ہوں۔'' مالک لڑکے نے کہا۔''اور اب شاندار دن گزاریے۔'' وہ مسکرایا۔

ویلس رسالے اٹھا کر بک اسٹور سے نکل گیا۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر وہ ان رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے بعض پتے اور فون نمبر نوٹ کرنے لگا۔ادھر سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر 8mm کی اس فلم کو پروجیکٹر پر چلا کر دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ اس نے ایک اور بات نوٹ کی۔ایک منظر میں جب نقاب پوش قاتل ایک طشت میں رکھے ہوئے مختلف سائز کے چاقوؤں میں سے ایک چاقو اٹھا رہا تھا تو پس منظر میں ایک اور شخص کی جھلک نظر آ رہی تھی۔اس نے اس منظر کو ساکت کردیا اور کمپیوٹر کے پرنٹر کے ذریعے اس کا پرنٹ آؤٹ نکال لیا۔ اس کے بعد اس نے مسز کرسچین کو فون کیا۔''مسز کرسچین۔'' وہ رابطہ ہونے پر بولا۔''وہ تین آدمی تھے، دو نہیں تھے جن میں سے ایک کیمرہ چلا رہا تھا اور دوسرا نقاب پوش تھا۔مجھے تیسرے آدمی کی جھلک نظر آئی ہے۔وہ تماشائی ہے۔میں دیکھوں گا کہ کمپیوٹر کے ذریعے اس کی کوئی بڑی اور واضح تصویر حاصل

کرسکوں۔ لیکن یہ تقریباً چھ سال پہلے ہوا تھا لہٰذا۔۔
ہاں، ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا رہوں گا۔۔۔ شکریہ۔
میں آپ کی طرف سے تعاون کی تعریف کرتا ہوں۔
خدا حافظ۔''

اس نے اس منظر میں نظر آنے والے شخص کی تصویر کو بڑا اور واضح کرنے کے لیے ایک فلم لیبارٹری کی خدمات حاصل کیں لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ وہ تصویر بڑی تو ہوگئی لیکن دھندلی کی دھندلی ہی رہی۔ وہ لیبارٹری سے نکل کر اس بک اسٹال پر پہنچا جہاں سے اس نے فحش رسالے خریدے تھے۔ ''میں یاد ہوں۔؟'' اس نے کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

''آخر کار بیٹری والے جسم کے لیے آ ہی گئے۔''
نوجوان بولا۔ وہ چوڑی ہڈی اور کسرتی جسم کا مالک ایک خوبرو شخص تھا۔ ویلس نے اپنا شناختی نکال کر اسے دکھایا۔ ''مجھے معلومات درکار ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ سے مدد مل جائے گی۔'' وہ بولا۔

''ٹام ویلس۔۔۔ عمدہ تصویر ہے۔'' نوجوان نے مزید کسی بات پر غور کیے بغیر کہا۔ ''آپ کو کس قسم کی معلومات درکار ہیں؟ کیونکہ میرے پاس مختلف قسم کی معلومات ہیں۔''

''میں اس قسم کی معلومات کے پیسے دوں گا۔''
ویلس اسے دکان سے باہر لے آیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔

''ٹھیک ہے، مسٹر۔'' نوجوان بولا۔ ''لیکن مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کس قسم کی معلومات چاہئیں۔ یہ بات تو شروع سے واضح ہے کہ میں ہم جنس پرست نہیں ہوں۔ آپ چیز بتائیں میں دام بتاتا ہوں۔''

وہ دونوں ایک وسیع احاطے میں پہنچ گئے۔ ''تم کب سے یہاں کام کر رہے ہو؟'' ویلس نے ایک دیوار کے سائے میں رک کر پوچھا۔

''لگ بھگ دو سال سے۔''

''اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میکس۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ وہ ایک خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھا۔

''تو، میکس! صورت حال یہ ہے کہ میں جس چیز پر کام کر رہا ہوں، اس کا تعلق زیرِ زمین فحش فلموں سے ہے۔'' اس نے رک کر ایک سگریٹ لگالیا۔ ''وہ مال جو غیر قانونی طور پر کاؤنٹر کے نیچے سے بیچا جاتا ہے۔''

''خیر۔۔۔ ایسا کچھ زیادہ غیر قانونی بھی نہیں ہے۔'' میکس بول پڑا۔

''جو بھی ہے۔۔۔ جو لوگ بھی اسے بنا رہے ہیں۔۔۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ میں انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ تو۔۔۔ اگر تمہاری وہاں تک رسائی ہے تو یہ شاندار بات ہے اور اگر نہیں تو مجھے بتادو۔''

''تم پولیس والے تو نہیں ہو؟'' میکس نے شبہ ظاہر کیا۔ ''یا ہو۔۔۔ اگر میں پوچھوں تو تمہیں بتادینا چاہیے۔''

''میں پولیس والا نہیں ہوں۔'' ویلس نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔

''تو پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

''مجھے نہیں پتا کہ تم کتنا کما لیتے ہو۔'' ویلس نے بات گھمادی۔

میکس نے کاہلی سے دیوار سے ٹیک لگالی اور ایک سگریٹ نکال کر سلگالیا۔ ''تقریباً چار سو ڈالر فی ہفتہ۔'' وہ بولا۔

''کتابوں سے۔''

''تم اس کچرے سے چار سو ڈالر فی ہفتہ کمالیتے ہو۔'' ویلس نے کہا۔ ''میں تمہیں چند روز کے پانچ۔ ڈالر دوں گا۔''

''چھ سو ٹھیک رہے گا، بڑے صاحب۔''

''اچھا۔ تو یہ رہے چھ سو ڈالر۔'' ویلس نے پرس میں سے چھ سو ڈالر نکال کر اسے دے دیے۔ ''اور یہ رہا میرا نمبر۔'' اس نے اپنا فون نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''تم کب کام شروع کرسکتے ہو؟''

''میں رات میں دیر سے فارغ ہوں گا۔''

میکس بولا۔ ''کل ٹھیک رہے گا۔''

''ویلس جانے کے لیے مڑ گیا۔'' آئندہ مجھے بڑے صاحب نہ کہنا۔''

''نہیں، یقیناً۔'' میکس نے کہا۔ ''میں آپ کے احساسات مجروح نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

اگلے روز دونوں مل کر مختلف دکانوں کی خاک چھاننے لگے جہاں جنسی تشدد پر مبنی فلموں کے کیسٹس دستیاب تھے لیکن انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک دکاندار اس قسم کے کیسٹ طلب کرنے پر مرنے مارنے پر تل گیا۔ دوسرے دن ویلس تنہا ہی ایسے کیسٹ کی تلاش میں نکل گیا۔ ایک دکان میں داخل ہو کر کیسٹس کا جائزہ لینے کے بعد وہ دکاندار کے پاس پہنچ گیا۔ ''یہ کیا ہیں؟''

''تشدد، اغلام اور ریپ کی فلمیں۔'' دکاندار نے جواب دیا۔ ''پانچ خریدو، ایک مفت۔''

''کوئی اور شدید قسم کی فلمیں نہیں ہیں؟'' ویلس بولا ''جنسی تشدد کے بعد موت۔۔۔!''

''اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔'' دکاندار نے کہا۔ ''جو آپ دیکھ رہے ہیں، وہی میرے پاس ہے، مسٹر۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ ایسی فلمیں مجھے کہاں مل سکتی ہیں؟ میرے پاس خرچ کرنے کے لیے بہت پیسہ ہے۔''

''دفع ہو جاؤ۔''

وہ خاموشی سے اسے گھورتا ہوا وہاں سے دفع ہو گیا۔

☆☆☆

اس طرح کچھ بھی ثابت نہیں ہو رہا تھا اور محض اس کا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ وہ بلیو فلموں کے کیسٹس کے حصول کو چھوڑ کر ایک بار پھر میری این کو اس کی تصویر کی مدد سے ڈھونڈنے لگا اور اس کوشش میں مشنری پہنچ گیا۔ مشنری کی عمارت کے باہر کھڑی ہوئی ایک نن کو اس نے میری این کی تصویر دکھائی اور اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی اس لڑکی کو دیکھا تھا؟ اسی اثناء میں ایک اور نن وہاں پہنچ گئی۔ اس نن نے میری این کی تصویر اپنی ساتھی کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ صاحب پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی اسے پہچانتا ہے؟''

نیگرو نن، میری این کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ ''ہاں، مجھے میری یاد ہے۔'' وہ ایک لمحے کے بعد سر ہلا کر بولی۔

ویلس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ وہ جلدی سے اس نن کے قریب آ گیا۔ ''میری این میتھیوز؟''

''ہاں۔'' نن نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگر مجھے صحیح طرح یاد ہے تو وہ یہاں تقریباً ایک ماہ رہی تھی۔''

وہ ویلس کو لے کر عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ ''ایک رات وہ واپس نہیں لوٹی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسے کیا ہوا؟''

''ابھی نہیں۔'' ویلس نے جواب دیا۔ ''میں اس کے والدین کے لیے اس معاملے کی چھان بین کر رہا ہوں۔''

''کیا آپ اسے اٹھا کر نیچے رکھیں گے؟'' نن نے شیلف پر رکھے ہوئے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اسی کا سوٹ کیس ہے۔''

ویلس نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس اتار لیا۔ ''میں اسے بھولی ہوئی تھی کہ آپ نے مجھے اس کی تصویر دکھائی۔'' نن کہہ رہی تھی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ امید لگائے رکھی کہ وہ واپس آئے گی۔ وہ بہت مایوس لگتی تھی۔ تھوڑے وقت کے بعد میں صرف اس کے لیے یہ دعا کرتی رہتی تھی کہ اسے بہتر زندگی نصیب ہو۔ کیا آپ یہ سوٹ کیس اس کی فیملی تک پہنچا دیں گے؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔''

''جی، یقیناً۔'' ویلس سوٹ کیس کو گھورتے ہوئے چونک کر بولا۔

''شکریہ۔''

ویلس نے سوٹ کیس کو کھولا۔ اندر صرف زنانہ

کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ایک گڑیا بھی تھی اور ایک خط بھی جو کبھی پوسٹ نہیں کیا جا سکا تھا۔ لیکن اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ ویلس نے سوٹ کیس بند کر دیا۔ امید کی جو ایک کرن نمودار ہوئی تھی، وہ بھی معدوم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ایک رسالے میں سے اس نے ایک فلم ساز کمپنی کا نام ڈھونڈ نکالا جو زیر زمین بلیو فلمیں بناتی تھی۔ یہ اندھیرے میں تیر چلانے والی بات تھی اور کامیابی مشکوک تھی۔ پھر بھی اس نے قسمت آزمانے کی ٹھان لی اور میوزیم کے آپریٹر کو فون کیا۔ ''ہیلو، ہالی ووڈ مومی عجائب گھر، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''مجھے سیلیبریٹی فلمز سے بات کرنی ہے اور مجھے اس کا پتا اور فون نمبر چاہیے۔'' وہ بولا۔

''فون نمبر اور پتے کے لیے ہولڈ کریں۔''

اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ سیلیبریٹی فلمز کے دفتر پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے انتظار گاہ میں چند لڑکیاں نیم عریاں لباس میں بیٹھی نظر آئیں۔ وہ انہیں نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک حسینہ اندر سے برآمد ہوئی۔ وہ سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ ''میں یہاں پہلے آئی تھی۔'' ایک شوخ حسینہ نے اعتراض کیا۔

''معذرت۔۔۔ میں صرف چند منٹ لوں گا۔'' وہ بولا اور اندر چلا گیا۔

سیلیبریٹی فلمز کا مالک ایڈی پول، کسی چیز کی تلاش میں اپنی میز کی درازیں کھنگال رہا تھا۔ وہ بھاری نن وتوش کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ سرمئی تھا جس سے سفاکی ٹپکتی تھی۔ بڑی بڑی قلمیں اور فرنچ کٹ داڑھی۔۔۔

''مسٹر ایڈی پول۔'' ویلس اس کے قریب پہنچ کر مخاطب ہوا۔

''کیا مقدمے کا نوٹیفکیشن دینے آئے ہو؟'' وہ بدستور درازوں کو کھنگالتا ہوا بولا۔

''نہیں، میں معلومات کرتا پھر رہا ہوں کہ شاید۔۔۔ اتفاقاً۔۔۔!'' ویلس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری این کی تصویر اس کے سامنے کر دی۔ ''کیا آپ نے اس لڑکی کو یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''کیا تم پولیس آفیسر ہو؟'' ایڈی پول نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''میں اس کے خاندان کا فرد ہوں۔'' ویلس نے جواب دیا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ یہاں کتنی لڑکیاں آتی ہیں؟''

''براہ کرم۔۔۔ اگر آپ ذرا سا دیکھ لیں۔'' ویلس نے کہا۔ ''اسے صرف چند سال ہوئے ہیں۔''

ایڈی نے پہلی بار نظریں اٹھا کر میری این کی تصویر کو دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔ اس کی سفاک آنکھوں کے تاثرات پتھر جیسے ہو گئے تھے اور سانس رک گئی تھی۔ ویلس کہہ رہا تھا۔ ''اس کا نام میری این میتھیوز ہے۔'' اس کی نظریں ایڈی پول پر جم کر رہ گئی تھیں۔

ایڈی نے نظریں چرالیں۔ ''اسے کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ سر جھکا کر پھر سے درازوں کو کھنگالنے میں مصروف ہو گیا لیکن اس کا لہجہ جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔

''تمہیں یقین ہے؟'' ویلس نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں، مجھے یقین ہے۔ ابھی میں نے تصویر دیکھی ہے۔۔۔ ہے نا؟'' وہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا۔ لیکن اس کا چہرہ اس کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب جان چھوڑو۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔'' وہ بولا اور دروازے کے پاس پہنچ کر بہ آواز بلند پوچھا۔ ''اب اگلا کون ہے؟''

ویلس دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اسے ایڈی پر پورا پورا شبہ ہو گیا تھا کہ وہ میری این کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا لہٰذا اس نے ایڈی پر نگاہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے تحت اس کے دفتر کے بالکل سامنے والی عمارت کا ایک کمرا

کرائے پر حاصل کرلیا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی اور ایڈی کے دفتر کی کھڑکی بالکل آمنے سامنے تھی۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان صرف ایک چوڑی سڑک تھی اور وہ دوربین کی مدد سے اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

اس روز وہ دن بھر اپنی کھڑکی کے سامنے بیٹھا، دوربین کی مدد سے ایڈی کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ پھر رات ہوگئی۔ ایڈی نے اپنا کوٹ کرسی پر سے اٹھایا اور آفس کی لائٹ آف کردی۔ ویلس تیزی سے نیچے بھاگا اور اپنی کار میں سوار ہوکر اس کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایڈی نے کار اپنے گھر کے باہر روک دی۔ اس وقت اندر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ ویلس ان سے کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان اپنی کار میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ ''کیا سب لوگ آگئے؟'' ایڈی نے کار سے برآمد ہوکر اس شخص سے پوچھا۔

''ہاں باس، سب لوگ آگئے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''اور ایک نوجوان لڑکی بھی۔''

''اچھی طرح نگرانی کرتے رہے ہو؟'' ایڈی اس کے ساتھ خیابان عبور کرتا ہوا بولا۔ ''کیونکہ پچھلی مرتبہ میری بہت سی ذاتی چیزیں چوری ہوگئی تھیں۔''

''ہاں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

دونوں اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ویلس اپنی کار سے اترا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ وہ کسی طرح عمارت کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ ابھی وہ درختوں کے جھنڈ میں کھڑا اندر جانے کا کوئی راستہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے دیکھ لیا۔

''ہالٹ۔'' وہ چیخا۔

ویلس پلٹ کر گھنے درختوں کے درمیان بھاگنے لگا۔ وہ شخص اس کے تعاقب میں آیا اور ایک پختہ گڑھے میں گرگیا۔ ویلس رک کر پلٹا اور پھر بھاگتا ہوا اپنی کار میں جا بیٹھا۔ وہ شخص بری طرح چیخ رہا تھا، غالباً اس کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ویلس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح ایڈی کے دفتر میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر اپنی میز پر آ بیٹھا اور اس نے ریسیور اٹھالیا۔ ''ہیلو، سلیبریٹی فلمز۔'' وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

''میں اس کے متعلق سب جانتا ہوں۔'' ویلس اپنے کمرے سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

''جی؟ آپ کس کے متعلق جانتے ہیں؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''اس لڑکی کے متعلق۔۔۔ چھ سال پہلے۔'' ویلس ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں، تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟''

''کون بول رہا ہے؟'' ایڈی کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ''تم نے اسے قتل کردیا تھا۔'' ویلس بولا۔ ''تم نے اور تمہارے دوستوں نے۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیا بکواس کررہے ہو۔''

''تم نے اسے قتل کیا اور فلمایا۔۔۔ اور اب تم مشکل میں گرفتار ہو، تم سب پھنس چکے ہو۔''

ایڈی نے ریسیور رکھ دیا اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ وہ بے حد پریشان ہوا تھا۔ ویلس، اپنی دوربین سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایڈی، میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے دوبارہ بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ پھر رابطہ ملنے پر گویا ہوا۔ ''ہیلو، میں بول رہا ہوں۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''سنو، ابھی ابھی میرے پاس ایک ٹیلی فون کال آئی تھی۔'' ایڈی نے کہا۔ ''ہمیں بات کرنی ہے اور ہم یہ بات ٹیلی فون پر نہیں کرسکتے لہٰذا ہم میں سے ایک کو ہوائی سفر کرنا پڑے گا۔ ٹھیک ہے؟''

''مجھے پروا نہیں۔۔۔ تم ذلیل۔۔۔!''

ایڈی کو جیسے سکتہ لگ گیا ہو۔ پھر وہ غصے کے عالم میں ریسیور کو بار بار پٹخنے اور چیخنے لگا۔ ویلس نے دوربین رکھ دی۔

''فون کی فہرست میں جو نام درج ہے، وہ مین ہیٹن، نیویارک کا ڈینو ویلوٹ ہے۔'' اگلی صبح میکس ویلس کو بتا رہا تھا۔ ''پروڈیوسر، ڈائریکٹر۔۔۔ وہ ایک

عجیب شخص ہے۔"
"اس کا حال کتنا شدت آمیز ہے؟" ویلس نے اپنی کار میں سوار ہونے سے پہلے پوچھا۔
"تم کتنا شدید چاہتے ہو؟" میکس پوچھ بیٹھا۔ "قید و بند، پراسرار، اذیت پسند، یہ سب یقیناً کمزور اعصاب کے مالک افراد کے لیے نہیں۔۔۔ کافی مشکل کام ہے۔ لیکن اس کے مداح ہیں۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اسے آرٹ سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر معقول رقم ملے تو وہ ایک آدمی کے لیے بھی فلم بنانے کو تیار ہے۔۔۔ غیر قانونی نہیں، مگر حدود پار کر جاتی ہیں۔۔۔!"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔"
"تو کیا تم نیویارک جا رہے ہو؟" میکس بولا۔ "میں مداح ہونے کے علاوہ اس سے ذاتی تعلقات بھی رکھتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔ یقیناً زیادہ رقم کے عوض۔۔۔ اخراجات الگ۔۔۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ تو، ہم کب چل رہے ہیں؟"

☆☆☆

دونوں نیویارک پہنچ گئے اور ایک ہوٹل میں دو الگ الگ کمرے بک کرا لیے۔ "میں چند گھنٹوں کے لیے باہر جا رہا ہوں۔" میکس نے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" ویلس اپنا سامان رکھتا ہوا بولا۔ "ڈیلوٹ کی جتنی فلمیں مل سکتی ہیں، ڈھونڈ کر لے آؤ اور رسید لے لینا۔"
"جی، جناب۔" میکس مڑ کر نکل گیا۔
اب رات ہو گئی تھی۔ ویلس نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر نیچے سڑک پر آ گیا اور اس نے ایک ٹیلی فون بوتھ سے سینٹر کرسچین سے رابطہ قائم کر لیا۔
"میرے شوہر کے پانچ کیش اکاؤنٹ تھے، جو وہ استعمال کرتے تھے۔" دوسری طرف سے مسز کرسچین نے اسے خبر دی۔ "نومبر 1992ء۔۔۔ اور مارچ 1993ء کے درمیان۔۔۔ انہوں نے ہر اکاؤنٹ سے ایک ہی کیش کا چیک کاٹا۔ میرے شوہر نے کبھی پیسے کو براہ راست استعمال نہیں کیا۔ کیش کی شکل میں۔ یہ چیک جو انہوں نے لکھے، عجیب رقم کے تھے۔ جب ان پانچوں چیک کو جمع کیا جائے۔۔۔ پانچ مختلف اکاؤنٹس سے۔۔۔ تو ملا کر ایک ملین بنتے ہیں۔"
ویلس اب تک خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ "یہ دلچسپ بات ہے، مسز کرسچین۔" وہ بولا۔ "میں نے اسی لیے اس کا حوالہ دیا تھا۔ کیونکہ۔۔۔!"
"تم نے کہا تھا کہ کوئی بھی غیر معمولی بات نظر آئے تو بتانا۔"
"میرے پاس اب صرف پانچ ہزار ڈالر کیش باقی رہ گئے ہیں۔" ویلس نے کہا۔ "میں نے جو منصوبہ آپ کو پہلے بتایا تھا، اگر وہ آپ کے لیے قابل قبول ہے تو مجھے پچاس ہزار ڈالر مزید چاہئیں۔ میں دوبارہ اس نقاب پوش کی شناخت کے قریب پہنچ گیا ہوں۔"
"میں مسٹر لونگ ڈیل کے ذریعے انتظام کرتی ہوں۔" مسز کرسچین نے کہا۔ "یہ تمہیں کس طرح پہنچائے جائیں۔"
"اگر آپ کے پاس قلم ہے تو آپ کو پتا لکھوا دیتا ہوں۔"

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مارے نیند کے اس کا برا حال ہو رہا تھا لیکن وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں وی سی آر پر ڈینو ویلوٹ کے بلیو پرنٹس دیکھ رہا تھا۔ ایک کیسٹ ختم ہو گئی تو اس نے اسے ایجکٹ کر کے دوسری کیسٹ چلا دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ فلم کے متحرک مناظر میں ایک بے حد خوبرو لڑکی برہنہ حالت میں زنجیروں سے جکڑی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ایک نقاب پوش نے اسے گلے سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر وہی چھوٹا سا دائرہ اور اس دائرے میں ایک ستارہ یا کراس کا نشان گودا ہوا تھا۔ وہ یکبارگی اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے اس منظر کو ساکت کر دیا اور

بھاگ کر دوسرے کمرے سے میکس کو بلا لایا۔ ”یہ کون ہے؟ نقاب پہنے ہوئے۔۔۔ یہ کون ہے؟“ اس نے ٹی وی اسکرین پر ساکت منظر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ارے جلدی آؤ۔ یہ کون ہے؟“

میکس، آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”یہ ان جنونیوں میں سے ایک ہے جنہیں ڈینو ہمیشہ استعمال کرتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ اس کی بہت سی فلموں میں ہے۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“ اس نے منظر پھر سے پلے کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ میکس بولا۔ ”اس کی گمنامی ہی سب کچھ ہے۔ یہ ہمیشہ نقاب پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو میٹ۔۔۔ نہیں، مشین کہتا ہے۔ یہ زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ بھی کرتا ہے، ظاہر ہے اس سے پیار کرتا ہے۔ میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔“

☆☆☆

اگلی صبح دونوں پیدل ہی تیزی سے ایک سمت میں چلے جا رہے تھے۔ ایک علاقے میں پہنچ کر دونوں ایک مکان کے سامنے رکے۔ کال بیل کے ساتھ ہی انٹرکام، اسپیکر اور ڈینو ویلوٹ کی بلیو فلموں کا مخصوص نشان، مکڑی، نظر آ رہا تھا۔ ویلس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔

”کون ہے؟“ اندر سے کسی کی آواز باہر اسپیکر پر گونجی۔ ”میں کیلی فورنیا سے میکس بول رہا ہوں۔“ میکس، اسپیکر پر ذرا سا جھک کر بولا۔ ”میں نے پہلے بھی فون کیا تھا۔ میں لاس اینجلس سے چنچ کا ایک دوست بول رہا ہوں۔ میں اور میرا پارٹنر مسٹر ڈینو ویلوٹ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“ اندر سے جواب آیا۔

”اسے بتاؤ کہ ہم اسے ایک بڑی رقم دینا چاہتے ہیں۔“ میکس نے کہا۔ ”اگر وہ دلچسپی نہیں رکھتا تو ہم چلے جائیں گے۔“ اس نے ویلس کو آنکھ ماری۔

اگلے ہی لمحے دروازے کا خود کار بولٹ کھل گیا۔ دونوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ اس وقت ڈینو ویلوٹ، اپنی میز پر بیٹھا، موبائل پر کسی سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا۔ ”مجھے نہیں معلوم، تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم میرے سیدھے سوال کا جواب نہیں دے سکتے؟ میں نے تم سے پوچھا ہے کہ ’لالا‘ کہاں ہے؟ ہاں، یہ بات ہے جو میں تم سے پچھلے دس منٹ سے پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”احمق۔۔۔ دو دن میں فلمبندی شروع کر دوں؟ تم میرے پیسے ضائع کروا رہے ہو۔ ہاں، بہتر ہے، تم خود کر لو۔۔۔ ذلیل انسان۔“ اس نے موبائل میز پر پٹخ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”اوہ خدایا۔“

وہ ادھیڑ عمر کا، دبلا پتلا آدمی تھا۔ لمبے چہرے پر پتلی سی داڑھی اور پتلی مونچھیں، سامنے سے گنجا، جسم پر سرخ شرٹ اور سیاہ پتلون، بڑے بڑے بال، آنکھوں میں عیارانہ چمک۔ وہ فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے بجائے کوئی بدمعاش لگتا تھا۔

”ملاقات کا شکریہ۔“ ویلس مخاطب ہوا۔ ”آپ سے ملنا باعث افتخار ہے۔“

”ہاں، تو میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہم ایک فلم بنوانا چاہتے ہیں۔“ ویلس بولا۔ ”ڈائنو ویلوٹ اور ریجنل۔۔۔ اپنی نوعیت کی منفرد فلم۔۔۔ ٹھیک ہے؟۔۔۔ میں آپ کا بڑا ہی زبردست مداح ہوں۔“

”خدایا، مجھے خوشامد پسند ہے۔“ ویلوٹ بول پڑا۔

”آپ ایک جینئس ہیں، مسٹر ویلوٹ۔۔۔ ایک زبردست جینئس۔۔۔ آپ واحد ہیں جو اب بھی مووی کو فلم سے ویڈیو پر منتقل کرتے ہیں۔ اب ایسی دیانت داری کی داد دینے والے کہاں ہیں؟ فلم میں ایسی تصویر کشی آپ ہی کا حصہ ہے۔۔۔!“

ویلوٹ اپنی تعریفیں سن کو جھومنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کر ویلس کے قریب آیا۔ ”آپ کو کون سی فلم پسند ہے؟“ اس نے پوچھا اور ایک سگار سلگا لیا۔

''میں جانتا ہوں، اگر مجھے انتخاب کرنا پڑے تو وہ ''چوک'' ہوگا یا ڈیول۔'' میکس بول پڑا۔ ''پرجلال تصویر کشی۔۔۔ چوک آپ کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔''

''ہاں، ڈیول نے مجھے جتنی خوشی دی، اتنا ہی متاثر بھی کیا۔'' ویلس نے کہا۔ ''لیکن اگر مجھے دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو مجھے دشواری پیش آئے گی۔''

ویلوٹ کچھ دیر تک انہیں باری باری گھورتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ ''ہم کتنے بجٹ کی بات کر رہے ہیں؟''

''پانچ ہزار ابھی اور پانچ ہزار فلم لیتے وقت۔''

ویلس نے نوٹوں سے بھرا ہوا ایک لفافہ میز پر رکھ دیا۔ ''دو عورتیں، ایک سفید فام، ایک سیاہ فام، شدید قید و بند یقینی طور پر۔۔۔ اس کے علاوہ آپ کی فنکارانہ صلاحیتوں پر منحصر ہے۔۔۔ میری صرف دو شرائط ہیں۔۔۔!''

''میری صلاحیتوں کا امتحان۔۔۔!'' ویلوٹ، سگار منہ میں دبا کر پرخیال انداز میں بول پڑا۔

''میں آپ کو کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''تم نقل تو نہیں کرنا چاہتے کیوں؟ میرے خفیہ طریقہ کار کو چرانا چاہتے ہو کہ میں مرچ مسالہ کیسے ڈالتا ہوں۔۔۔؟'' ویلوٹ اس کی طرف جھک کر رک رک کر بولا۔

''نہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' ویلوٹ، اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''میں اسے سراہتا ہوں۔'' اس نے سگار کا ایک کش لیا۔ ''دوسری شرط بتاؤ۔''

''دوسرا اداکار وہ ہونا چاہیے۔۔۔ جس انور کو آپ استعمال کرتے ہیں۔ نقاب پوش شخص۔۔۔!''

''مشین۔''

''ہاں۔''

''میں نہیں جانتا۔۔۔ وہ دلچسپی لے گا یا نہیں۔ ہوسکتا ہے، دلچسپی لے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کے مزید پانچ سات ہزار ڈالر لگ جائیں گے۔'' اس نے لفافہ اٹھا کر میز کی دراز میں رکھ لیا۔ ''میں دس ہزار میں واقعی بہت شاندار چیز تیار کر سکتا ہوں۔''

''ہم ادا کر سکتے ہیں۔'' ویلس نے کہا۔

''یہ میرے لیے کافی ہوگا۔'' ویلوٹ بولا۔ ''اب میں تخلیقی انداز میں سوچنا شروع کروں گا۔ یہ رقم میں ڈپازٹ کے طور پر رکھ لیتا ہوں۔ آپ مجھے رات دس کے بعد ضرور فون کر لیجیے گا۔''

''بہتر ہے۔'' ویلس نے کہا اور دونوں اٹھ کر جانے لگے۔

''آپ کو معلوم ہے، آپ کا چہرہ بہت خاص اور۔۔۔ خوب صورت ہے۔'' ویلوٹ اٹھ کر ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ''جس طرح سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔۔۔ میں آپ کی فلم بنانا چاہوں گا۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟'' اس نے کیمرہ اپنی آنکھ سے لگا لیا۔

''میں ذرا کیمرے سے گھبراتا ہوں۔'' ویلس نے کیمرے کے لینس پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ پیسوں کے سلسلے میں مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں، لیکن تصویر کے سلسلے میں نہیں۔''

''یہ مختلف قسم کا اعتماد ہے۔'' ویلس نے کہا۔ ''مجھے امید ہے، ہم کاروبار کر سکتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں وہاں سے رخصت ہوگئے۔

☆☆☆

ویلس نے رات کے دس بجے ویلوٹ کو فون کیا۔ ''ماؤنٹ ایونیو، بروکلین، رات کے تین بجے۔'' دوسری طرف سے ویلوٹ نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔'' ویلس نے پتا نوٹ کرتے ہوئے کہا اور ریسیور رکھ کر میکس کے پاس آیا اور ایک دبیز لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تو کیا ہم فلم لائن میں آ گئے؟" میکس نے پوچھا۔
"یہ تمہارے لیے ہے۔" ویلس بولا۔
"یہ کیا ہے؟"
"یہ رقم ہے۔ لوگ اس سے چیزیں اور خدمات خریدتے ہیں۔"
"یہ آپ کی بڑی فیاضی ہے۔ لیکن یہ۔۔۔ میری رقم نہیں ہے۔" میکس بولا۔
"اسے ہمیں کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اس میں ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے۔ تم آج رات لاس اینجلس کی فلائٹ پکڑ سکتے ہو۔ تمہارا میرے ساتھ یہاں آنا ہی کافی ہے۔"
"آج رات؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میکس حیرت سے بول پڑا۔ "ہم ایک ٹیم ہیں، ہم پارٹنر ہیں۔"
"ٹھیک ہے، میکس، مجھے یقین ہے۔ تمہیں احساس ہو گیا ہوگا کہ جن لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا ہے، وہ انتہائی غیر متوازن اور خطرناک ہیں۔" ویلس نے کہا۔
"میں جانتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں میری ضرورت پڑے گی۔ میں ان لوگوں کو سمجھتا ہوں۔" میکس غصے سے بولا۔
"تمہیں گھر جانا ہے۔" ویلس نے اصرار کیا۔ "تم نے ایک شاندار کام کیا ہے۔"
"کیا اس وقت، مجھے گھر چلے جانا چاہیے؟ یہ سب ہماری تحقیقات ہیں۔ ٹام، میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔۔۔ ڈائنو اور مشین اور ایڈی۔۔۔ انہوں نے ایک جنسی تشدد پر مبنی فلم بنائی۔۔۔ ٹھیک؟ لیکن جو بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟ تم مجھ پر اعتماد کرو۔۔۔ کیا مقتول۔۔۔؟"
"ٹھہرو، ٹھہرو۔ پہلی بات۔۔۔ کس نے کہا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟" ویلس نے مداخلت کی۔ "دوسری بات۔۔۔ مقتول کی بات کس نے کی؟"
"زندگی میں صرف تین اصول ہوتے ہیں، ٹام ویلس۔" میکس بول پڑا۔ "پہلا اصول ہمیشہ کوئی دا کوئی نشانہ بنتا ہے۔۔۔ دوسرا تم نشانہ مت بنو۔۔۔!"
"اور تیسرا؟"
"میں بھول گیا۔"
"یہ اچھا ہے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہم نے کیا ہے، تم سب کچھ بھول جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جہاز میں بیٹھو اور لاس اینجلس پہنچ جاؤ اور سب بھول جاؤ، اوکے؟ میں تمہیں دوبارہ بلانا پسند کروں گا اور تمہاری مدد لوں گا۔"
میکس ہنسنے لگا۔ "تم مجھے دوبارہ بلاؤ گے اور میری مدد لو گے؟"
"ہاں۔۔۔ اور جب میں نے کہا تھا کہ تم ذہین ہو تو میرا اس سے یہی مطلب تھا۔ اچھا، شکریہ۔۔۔ اپنا خیال رکھنا، میکس۔"
وہ چلا گیا۔ میکس اسے اپنے سے دور ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ "ٹھیک ہے، ٹام ویلس، شیطان تمہارا منتظر ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔
ویلس، مقررہ وقت پر اس پتے پر پہنچ گیا۔ یہ علاقہ سمندر کے کنارے واقع تھا۔ شکستہ عمارتیں، شکستہ سڑکیں، سنسان اور ویران۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ ویلس نے کار روک دی، اپنا ریوالور نکال کر چیک کیا اور اتر کر چل پڑا۔ اسے وہ عمارت ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ وہ عمارت اندر سے بھی اتنی ہی بدنما تھی، جتنی باہر سے تھی۔ وہ ایک وسیع اور سنسان ہال کو عبور کرتا ہوا، عقبی ہال میں پہنچا۔ وہاں ویلوٹ اپنی رائفل سے نشانے بازی کی مشق کر رہا تھا۔ "آپ پہنچ گئے۔ آیئے ہمارے ساتھ شامل ہو جایئے۔" اس نے پذیرائی کی۔
ویلس رک کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس کی نظر اپنے بائیں طرف ایک بیڈ پر بیٹھے ہوئے، کسرتی جسم کے مالک نقاب پوش پر پڑی جو اسے ایک ٹک گھور رہا تھا۔ "ہیلو، مشین، میں تمہارے

کام کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' وہ دور ہی سے بولا۔
مشین اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اس کے بالائی جسم پر صرف ایک کھلی ہوئی جیکٹ اور ٹانگوں میں چست پتلون تھی۔ چہرہ بدستور نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ پیروں میں بوٹس تھے۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا مالک، درمیانے قد کا تھا۔
''کیا آپ رقم لائے ہیں؟'' ویلوٹ نے پوچھا۔
''ہاں، رقم موجود ہے۔'' ویلس نے کہا اور اپنی جیب سے ایک دبیز لفافہ نکال کر پاس بچھی ہوئی ایک شیشے کی میز کے کونے پر رکھ دیا جس پر مختلف سائز کے چھوٹے بڑے چاقو، ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ ''عورتیں کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''عورتیں۔۔۔ دیر سے آتی ہیں۔'' ویلوٹ بدستور نشانہ بازی کی مشق کرتا ہوا بولا۔
اب ویلس کی نظر ان خطرناک چاقوؤں پر پڑی۔ ''یہ کس لیے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہ ایسے ہی پکڑنے کے لیے ہیں۔'' ویلوٹ بولا۔ ''عمدہ ہیں نا؟ میں اور مشین ذرا چاقوؤں کی خوب صورتی کی بات کر رہے تھے۔''
اسی وقت ایک لیموزین آ کر ہال کے باہر رکی۔ ''میرے مہمان آ گئے ہیں۔'' ویلوٹ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بہ آواز بلند کہا اور پھر اپنی رائفل سے ہدف کا نشانہ لیتے لیتے، اس نے نال کا رخ آہستہ سے ویلس کی طرف کر دیا۔ ''مسٹر ڈیلو، کیا آپ مہربانی کر کے اپنے پاس جو بھی آتشیں اسلحہ ہے، اسے ہٹا دیں گے؟''
ویلس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ''میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔''
''آہستگی سے، براہ کرم مجھے اپنا پستول دکھائیے۔'' ویلوٹ بدستور اسے اپنا ہدف بنائے ہوئے بولا۔ ''خاموشی اور آہستگی سے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ پرسکون رہیے۔''
ویلس نے آہستہ سے اپنی کمر میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ اس نے نال کا رخ فرش کی طرف کر دیا۔ ''شاباش، اب یہ کارتوس میز پر خالی کر دیجیے۔۔۔ بہت احتیاط سے۔۔۔'' ویلوٹ نے ہدایت کی۔
ویلس نے ہچکچاتے ہوئے تعمیل کی۔ اس کے پاس کھڑے ہوئے مشین نے جلدی سے اس کا پستول اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔ ''دیکھیے، مجھے نہیں معلوم کہ آپ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں۔۔۔!'' ویلس نے کچھ کہنا چاہا۔
''خاموش، کمینے۔'' یکایک ویلوٹ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''میں ابھی تمہارے حلق میں گولی اتار دوں گا، مجھے۔''
اسی وقت ویلوٹ کے عقب میں ایڈی نمودار ہوا اور اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ''یہ وہی ہے۔'' اس نے ویلوٹ سے سرگوشی کی۔
''اچھے بچے۔'' ویلوٹ زہر خند سے بولا۔ ''اب اسے پلنگ سے باندھ دو، ایڈی۔'' اس نے ایڈی کو حکم دیا۔
''جی، سر۔'' ایڈی، ویلس کی طرف بڑھا۔
''مشین۔'' ویلوٹ نے مشین کو معنی خیز لہجے میں بہ آواز بلند مخاطب کیا اور مشین ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔
ایڈی، ویلس کی کلائیاں ایک زنجیر سے باندھنے لگا۔ ''تمہیں پتا ہے، میں پہلے سمجھ ہی نہیں پایا تھا'' ویلوٹ ان کے قریب پہنچتا ہوا بولا۔ ''کہ تمہارے بارے میں کیا نتیجہ نکالوں۔۔۔ اور تم پریشانی کے عالم میں ایڈی کو یہاں لے آئے۔'' وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔
ایڈی نے ویلس کی کنپٹی پر اچانک ایک زوردار مکا مارا۔ ویلس، پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ ایڈی نے اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی زنجیریں پلنگ کے پائے سے باندھ دیں۔ ویلوٹ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن دیکھو اور غور کرو۔۔۔ غیر متوقع طور پر ایسا ہوا۔۔۔!''

اسی وقت ایک اور شخص تاریک دہلیز پر نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ ''ہمارا ایک پرانا کاروباری ہر چیز کی وضاحت کے لیے آ گیا۔'' ویلوٹ نے کہا اور آنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ مسز کرسچین کا وکیل لانگ ڈیل تھا۔ ویلس نے اسے دیکھا۔ وہ مسز کرسچین کا وکیل لانگ ڈیل تھا۔ ویلس نے اسے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔

''شیطان ایکس ٹیپا۔'' ویلوٹ نے کہا اور ویلس سے مخاطب ہوا۔ ''تمہیں مسٹر لانگ ڈیل یاد ہیں۔۔۔ ہے نا؟''

''ہمیں اس مشکل کام کو انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔'' لانگ ڈیل بولا۔

ویلوٹ نے ایک چھوٹی سی تصویر نکال کر ویلس کو دکھائی۔ یہ اُس کی بیوی اور بچی کی تصویر تھی۔ ''اس طرح کی چیزوں سے میں کیا کام لے سکتا ہوں؟'' ویلوٹ اس سے مخاطب ہوا۔ ''لیکن دوبارہ غور کرنے پر میں سوچتا ہوں، ان چیزوں کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ تم میری بات سنو گے اور وہ فلم تم واپس لانے جا رہے ہو۔ تم وہ یہاں لاؤ گے اور مجھے دو گے۔ اسے زیادہ موثر بنانے کے لیے ایک ترغیب ہے۔۔۔!''

اسی وقت مشین، میکس کو دھکیلتا ہوا وہاں لے آیا۔ میکس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، منہ پر ٹیپ تھا۔ اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی گئی تھی اور چہرہ لہولہان تھا۔ اس کی حالت بالکل غیر ہو رہی تھی۔ ویلس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے فوراً چھوڑ دو۔ اسے کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔'' اس نے منت کی۔

''کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ آگے میں کیا کہنے والا ہوں، احمق؟'' ویلوٹ چیخ کر بولا۔ ''اگر تم نے وہ فلم مجھے واپس نہیں پہنچائی تو ہم اسے قتل کر دیں گے۔ اسے عریاں کر کے اس کی فلم بنائیں گے اور اگر یہ تمہارے لیے کافی نہیں تو ہم تمہاری فیملی کے پیچھے پڑ جائیں گے۔'' اس نے وہ فوٹو اپنے منہ میں رکھ کر منہ بند کر لیا۔

''میں وہ فلم لا دوں گا۔'' ویلس جلدی سے بول پڑا۔

ویلوٹ نے وہ فوٹو منہ سے اگل دیا۔ ''اچھے بچے، تم کافی تعاون کر رہے ہو۔'' اس نے کہا اور اسے بیڈ سے کھینچ کر آگے کو دھکا دیا۔ پھر ایک ریوالور میز سے اٹھا کر لانگ ڈیل کی طرف اچھال دیا جسے لانگ ڈیل نے پکڑ لیا۔ ''مسٹر لانگ ڈیل تمہارے ساتھ ہوں گے۔'' ویلوٹ نے کہا۔

''میں کیوں؟'' لانگ ڈیل گھبرا کر بول پڑا۔

''کیونکہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا۔'' ویلوٹ نے جواب دیا۔ ''مسٹر لانگ ڈیل'' اس نے جملہ مکمل کیا۔

مشین نے میکس کو گھسیٹ کر ایک کھمبے سے باندھ دیا۔ اس کی بائیں آنکھ سے اب بھی خون بہہ رہا تھا جو انہوں نے پھوڑ دی تھی اور وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔

''جلدی آ جایئے گا، مسٹر ڈبلیو۔'' ویلوٹ نے ویلس کو لانگ ڈیل کے ہمراہ باہر جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

ویلس نے پلٹ کر میکس کی طرف دیکھا جو غالباً چند گھڑی کا مہمان تھا۔ ویلس کے تاثرات فرط خوف سے پتھر کے سے ہو گئے۔ لانگ ڈیل نے اسے باہر کی طرف دھکا دیا اور دونوں عمارت سے باہر آ کر ایک طرف چل پڑے۔ ویلس کا رخ اپنی کار کی طرف تھا۔

''جب پہلے میں تم سے نہیں ملا تھا۔'' لانگ ڈیل اسے پستول سے کور کیے ہوئے اس کے پیچھے چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''نہ تو تم نے زیادہ کچھ کہا اور نہ زیادہ کچھ کیا تھا کہ میں اس میں شامل نہ ہوتا۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، یہ نہ ہوتا۔ اگر تم اس کیس سے دستبردار ہو جاتے۔ یا بہتر ہوتا کہ یہ کام ہی اپنے ہاتھ میں نہ لیتے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم اتنی دور تک چلے جاؤ گے۔ میں نے تمہاری خدمات اس لیے حاصل کی تھیں کہ تم نوجوان ہو، زیادہ ذہن نہیں ہو اور اپنے شعبے میں زیادہ ماہر نہیں ہو۔ مگر میں نے تمہارے عزائم کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ تم نے

کرسچین کے احاطے کا ایک نظر جائزہ لیا اور تمہیں اس میں کافی کچھ دکھائی دے گیا۔ ہے نا؟ تم فقط اپنی کامیابی کا خواب نہیں دیکھ رہے تھے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ کرسچین جیسے امیر و کبیر لوگ تم جیسے اور مجھ جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ہمیں اپنی ڈنر پارٹیوں میں بلائیں؟ نہیں، ہم ان کی زندگیوں سے مشکلات دور کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔۔۔ ان کی امیرانہ مشکلات دور کرنے کے لیے۔''

''تم سے ایک جنسی تشدد کی فلم کو کہا گیا تھا۔'' ویلس اس کے آگے چلتا ہوا غصے سے بولا۔ ''وہ تمہیں لاکر نہیں دے سکے تو تم نے اپنی فلم بنانے کے لیے پیسے دیے۔ کیا ایسا نہیں ہوا؟'' وہ لانگ ڈیل کی طرف مڑا۔ ''جب تم نے انہیں اسے قتل کرنے کے لیے رقم دی تو اس وقت لڑکی زندہ تھی؟ مسٹر کرسچین نے تمہیں تمہارے خنجر کی کیا قیمت دی؟ ایک ملین ڈالر؟''

''مجھے بہت اچھا معاوضہ ملا ہے۔'' لانگ ڈیل ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔ ''لیکن تم۔۔۔ میں نے تمہیں بہت سستا خریدا۔'' اس نے ریوالور سے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور دونوں ایک بار پھر آگے پیچھے چلنے لگے۔ ''چونکہ مسز کرسچین تمہاری ذہانت کی معترف تھیں، تم نے قتل کے شواہد کو روک لیا۔ تم اپنے دوست کو اس میں گھسیٹ لائے کہ وہ قبرستان سے کھدائی کر کے اس گمنام لڑکی کی لاش نکال لائے۔ جس کی نہ تو کسی کو پروا تھی اور نہ ہی کسی کو یاد تھا۔''

''میری این میتھیوز۔۔۔ یہ تھا اس کا نام۔'' ویلس نے غصے سے کہا۔ ''اس کی ماں اسے یاد کرتی ہے۔''

''میں اس سے اکتا گیا ہوں۔ جانتے ہو تم میں اور مجھ کیا فرق ہے؟'' لانگ ڈیل بولا۔ ''میں اس سے بچ جاؤں گا اور مجھے فائدہ ہوگا، جبکہ تم نہیں بچ سکے گے۔۔۔ اب فلم لے آؤ۔''

''کیا فلم تم نے اس کے ساتھ دیکھی تھی؟ جنسی تشدد کی فلم۔۔۔ کیا تم نے کرسچین کے ساتھ دیکھی تھی؟'' ویلس غصے، بے بسی اور گہرے کرب کی ملی جلی کیفیت کے تحت بولا۔

''اس سے تمہارے دوست کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔'' لانگ ڈیل نے کہا۔ ''اب تم فلم لے آؤ اور ہم چلیں۔''

''کیا مسٹر کرسچین اس فلم سے جنسی طور پر مشتعل ہوا تھا؟'' ویلس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس طرح سے اس معصوم لڑکی کو کاٹ ڈالنا۔ کیا اس سے مسٹر کرسچین میں ابال پیدا ہوتا تھا؟ تم وہاں بیٹھے تھے۔۔۔ اسے ٹھنڈا کر رہے تھے۔'' ویلس، دانت پیس کر چیخا۔ ''جب میری این میتھیوز مر رہی تھی۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' لانگ ڈیل نے اس پر ریوالور تانتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہ سمجھنا چاہ رہا ہوں۔'' ویلس حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''کہ وہ اس طرح کی فلم سے کیا چاہتا تھا؟''

''تم پوچھ رہے ہو، کیوں؟''

''ہاں، کیوں؟ کیوں؟'' وہ دھاڑا۔ ''وہ کیوں ایسی فلم چاہتا تھا جس میں ایک معصوم لڑکی کو ذبح کیا جائے؟''

''اس لیے کہ وہ ایسا کرسکتا تھا۔'' لانگ ڈیل نے جواب دیا۔ ''اس نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ ایسا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔''

''تیری ایسی کی۔۔۔'' ویلس نے یکبارگی اس پر جھپٹنا چاہا۔

''خبردار۔۔۔ خبردار۔۔۔!'' لانگ ڈیل اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''اب فلم لاؤ۔'' اس نے گن لہرا کر کہا۔

ویلس نے اپنی کار کا ٹرنک کھول کر وہ فلم ریل نکالی اور اس کی طرف بڑھادی۔ ''یہ رہی۔۔۔ مجھے گولی مار دو۔'' وہ غصے سے بولا۔

لانگ ڈیل نے فلم لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ویلس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا اور

طیش کے عالم میں تیز تیز چلتا ہوا واپس وہاں پہنچ گیا۔ لانگ ڈیل اس کے پیچھے ہال میں داخل ہوا۔ ’’مسٹر ویلس۔۔۔ برائے مہربانی فلم۔‘‘ ویلوٹ چھوٹتے ہی بولا۔

’’تم میرے ساتھ جو چاہو کرنا مگر اسے جانے دو۔‘‘ ویلس نے کھمبے سے بندھے ہوئے میکس کی طرف اشارہ کیا جو قریب المرگ تھا۔

’’اچھا، اسے آزاد کردو، مشین۔‘‘ ویلوٹ نے پلٹ کر مشین کو اشارہ کیا۔

ویلس، میکس کو سہارا دینے کے خیال سے اس کی طرف بھاگا لیکن مشین نے اسے اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ اور پھر ایڈی نے تیزی سے بڑھ کر اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا اور لاتیں مار مار کر اسے پلنگ کے پاس پہنچا دیا۔ مشین نے اس کی کلائی میں زنجیر پہنچائی اور زنجیر کا دوسرا سرا پلنگ کے سرہانے کے پائپ کے گرد لپیٹ دیا۔ پھر ایڈی نے بڑھ کر فرش پر پڑی ہوئی وہ فلم اٹھالی اور ویلوٹ کی طرف بڑھا دی۔ ویلوٹ نے ریل اس سے لے کر پوری فلم کھول دی اور ویلس سے مخاطب ہوا۔ ’’میں نہیں سمجھتا کہ تم اس منظر کو نظر انداز کرنا پسند کرو گے۔‘‘ اس نے فرش پر پڑی ہوئی فلم کی ریل پر پیٹرول کے چند قطرے ٹپکائے اور ماچس کی ایک تیلی سلگا کر ریل پھینک دی۔ فلم نے ایک دم سے آگ پکڑ لی اور شعلے بلند ہونے لگے۔

’’تو یہ ختم۔‘‘ ویلوٹ بولا۔ ’’جیسے کہ اس کا وجود ہی نہ تھا۔ جانے دو۔۔۔ تم ایسی صورت حال میں تھے، جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’تم، ماں کی خصم۔‘‘ ویلس حلق پھاڑ کر چیخا۔ ’’تم چھوٹی سی کامیابی پر خوش ہونے والے۔۔۔ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ ایک ملین ڈالر بانٹنے کے باوجود تم لوگ ابھی تک چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہو۔‘‘

’’ملین ڈالر؟‘‘ ویلوٹ نے حیرت سے دہرایا۔

لانگ ڈیل کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ اس کا پول کھل گیا تھا۔ ایڈی بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

’’ہاں، جو کرسچین نے لانگ ڈیل کو دیئے تھے۔‘‘ ویلس چیخ کر بولا۔ ’’وہ اس نے تمہیں دیئے؟‘‘

’’ایک ملین ڈالر اور نقد؟‘‘ ویلوٹ نے مزید حیرت سے دہرایا۔

’’تم احمق، گھٹیا لوگ۔۔۔‘‘ ویلس پھر چیخا۔

’’یہ کیا بات کر رہا ہے؟‘‘ ویلوٹ حیرت کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ ’’کیا یہ ڈالر کی بات کر رہا ہے؟‘‘ اس نے لانگ ڈیل کی طرف دیکھا۔

’’نہیں، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔‘‘ لانگ ڈیل نے چیخ کر تردید کی۔

’’کیا تم نے مجھے دھوکا دیا؟ اس کا لہجہ سفاک تھا۔

’’کیا تم نے مجھ سے اس معاملے میں دھوکا کیا؟‘‘ ایڈی نے چیخ کر ویلوٹ سے پوچھا۔

’’بالکل نہیں، ایڈی۔۔۔!‘‘ ویلوٹ بولا۔ ’’لانگ ڈیل نے ہمیں دھوکا دیا۔ جو کہ بذات خود مکمل طور پر جھوٹ ہے۔‘‘

اچانک لانگ ڈیل نے اپنا ریوالور نکال کر ان سب پر تان لیا۔ ’’پیچھے ہٹو۔۔۔ مجھ سے دور رہو۔۔۔ کمان نیچے پھینک دو۔‘‘ وہ خود پیچھے ہٹتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

’’کم بخت، امیر آدمی کا وکیل۔‘‘ ویلوٹ کسی سانپ کی مانند پھنکارا۔ ’’میں نے کہا تھا کہ اس کمینے پر اعتماد مت کرو۔‘‘ وہ ایڈی سے بولا اور آہستہ آہستہ لانگ ڈیل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل کی کمان بدستور موجود تھی جس پر تیر چڑھا ہوا تھا۔ ’’مسٹر لانگ ڈیل، اگر کوئی اعتماد نہ ہو تو بے راہ رو عریاں فلمیں بنانے والوں کے درمیان تو یہ سارا کاروبار تباہ ہو جائے۔۔۔ ہے نا؟ کیونکہ اس میں کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا، کوئی معاہدہ نہیں ہوتا، کوئی قانونی تحفظ نہیں ہوتا لہٰذا اگر کوئی ہمیں دھوکا دے تو اس شخص پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شخص ہمیں اندر کروا سکتا ہے، ہمیں مروا سکتا ہے۔۔۔ تو ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔۔۔ ہے نا، مسٹر لانگ ڈیل؟‘‘

’’میں اس سلسلے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ لانگ

ایل اپنی گن لہراتا ہوا بولا۔ ''کسی اور کو نقصان نہ پہنچے۔ اب ایڈی، میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس پستول ہے۔ فوراً اسے باہر نکالو اور فرش پر پھینک دو ورنہ میں گولی ماردوں گا۔'' یکبارگی وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔

ایڈی نے اپنا پستول جیب سے نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ ''اب اسے زور سے لات مار کر میری طرف پھینک دو۔'' لانگ ڈیل نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اب ڈینو، تم کمان پھینک دو۔'' ایڈی نے پستول لات مار کر اس کی طرف پھینک دیا جو باہر لانگ ڈیل کی کار کے نیچے چلا گیا۔

ویلوٹ نے اپنی کمان نیچے کرتے ہوئے تیر چلادیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیر لانگ ڈیل کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ لانگ ڈیل کا منہ کھل گیا اور آنکھیں پھٹ گئیں پھر بھی اس نے ویلوٹ پر گولی چلادی۔ گولی سیدھے ویلوٹ کی گردن میں جا دھنسی۔ وہ فرش پر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ ''یہ غلط ہے، کچھ گڑبڑ ہے۔'' وہ جان کنی کے عالم میں بڑبڑایا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا اور وہ جھوم رہا تھا۔ ''مجھے تو بہت فلمی انداز میں مرنا چاہیے تھا۔۔۔!'' وہ بڑبڑایا۔ ''مشین، ان سب کو ماردو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اس دوران ویلس نے اپنی زنجیر کھول لی تھی۔ ایڈی اور مشین اس کی طرف لپکے۔ ویلس نے نہایت پھرتی سے میز پر سے ایک چاقو اٹھا کر مشین کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ مشین ایک کربناک چیخ کے ساتھ الٹ کر فرش پر ڈھیر ہوگیا اور پیٹ میں سے چاقو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ویلس جلدی جلدی میز پر پڑے ہوئے اپنے پستول میں کارتوس بھرنے لگا۔ اس اثناء میں ایڈی باہر کی طرف بھاگا اور لانگ ڈیل کی کار کے نیچے پڑا ہوا اپنا پستول اٹھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن پستول اس کی پہنچ سے دور تھا۔ وہ اتنا لحیم شحیم تھا کہ کار کے نیچے رینگنے سے قاصر تھا۔ اچانک ویلس نے اس پر اپنا پستول تان لیا۔

''ایڈی، رک جاؤ ورنہ خدا کی قسم میں تمہیں گولی ماردوں گا۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ کر بولا۔

ایڈی رک گیا، اب ویلس نے اسے پستول کا رخ فرش پر پڑے ہوئے مشین کی طرف کردیا۔ ''نقاب اتارو۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''یہ لعنتی نقاب اتاردو۔''

''اس کے پستول میں صرف ایک گولی ہے۔'' زخمی مشین نے چیخ کر ایڈی کو آگاہ کیا اور چاقو اپنے پیٹ میں سے کھینچ کر نکال لیا۔

اب اتنا موقع نہیں تھا کہ ویلس اپنے پستول میں بقیہ پانچ کارتوس بھرتا۔ اس کی ایک کلائی اب بھی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور زنجیر پلنگ کے سرہانے کے پائپ میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایڈی، پھر اپنا پستول حاصل کرنے کے لیے کار کی طرف بھاگا۔ ویلس نے ایک گولی زنجیر پر خالی کردی۔ زنجیر ٹوٹ گئی۔ ایڈی نے کار کے نیچے رینگ کر اپنا پستول اٹھالیا۔ ویلس باہر کی طرف بھاگا اور سرپٹ اپنی کار کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ ایڈی ریوالور اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑا۔ ویلس جلدی سے اپنی کار میں بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کردی۔ ایڈی پیچھے سے اس پر گولیاں برسانے لگا۔ ویلس، تیزی سے اپنی کار نکال لے گیا۔ ایڈی کی گولیوں نے اس کی کار کے عقبی شیشے میں کئی سوراخ کردیے تھے۔ ویلس کی بھاگتی ہوئی کار کئی بار لہرائی اور اس کے پہیے چیخ اٹھے۔ اس نے رفتار بڑھادی اور کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اگلے چند ہی سیکنڈ میں وہ ایڈی کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکال لیا اور اپنی بیوی سے رابطہ کرلیا۔ ''ایمی، یہ میں ہوں، غور سے سنو۔۔۔!'' وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا بولا۔

''ٹام، تم کہاں ہو؟'' ایمی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ایمی، صرف سنو۔ سنڈی کو ساتھ لو اور اسی وقت یہ جگہ چھوڑ دو۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''وہاں چلی جاؤ جہاں، ہم نے چار جولائی کو ویک اینڈ گزارا تھا۔''

''کیوں؟ کیا گڑبڑ ہے؟'' ایمی حد درجہ پریشان ہوگئی۔

’’پلیز۔۔۔اس وقت نہیں بتا سکتا۔ میں تین گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم جاؤ، میں آ رہا ہوں۔‘‘

’’ٹام، تم مجھے ڈرا رہے ہو۔‘‘

’’ایمی، بس فوراً ایسا ہی کرو۔‘‘

’’ٹھیک ہے، خدا حافظ۔ میں جا رہی ہوں۔‘‘

ایمی نے غصے سے ریسیور رکھ دیا۔

اب ویلس نے مسز کرسچین کا نمبر ملایا۔ ’’مسز کرسچین، میں ٹام ویلس ہوں۔ لانگ ڈیل مر چکا ہے۔ وہ اس فلم کے بنانے والوں کے ہاتھوں مارا گیا۔‘‘ اس نے اطلاع دی۔ ’’اس نے آپ کے شوہر کے لیے ان لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں اور پوری رقم ایک ملین اپنے پاس رکھ لی تھی۔ فلم حقیقی ہے۔ انہوں نے لڑکی کو مار ڈالا تھا۔ مسز کرسچین۔۔۔!‘‘

’’آں۔۔۔ہاں‘ مسز کرسچین ایک دم سے چونک کر بولی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سن رہی تھی۔ ’’میں سن رہی ہوں۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔ ویلس، بدستور ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھامے ہوئے کار ڈرائیو کرتا ہوا، اپنے موبائل پر کہہ رہا تھا۔ ’’مسز کرسچین، مجھے افسوس ہے کہ، میں جانتا ہوں کہ یہ ضرور۔۔۔!‘‘

’’مسٹر ویلس کیا تم خطرے میں ہو؟‘‘ مسز کرسچین نے لرزتی ہوئے آواز میں پوچھا۔

’’ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔ میں آپ کو ہر بات آج رات بتا دوں گا۔‘‘ ویلس نے کہا۔ ’’ہم صبح پولیس کو فون کر سکتے ہیں۔‘‘

’’آٹھ بجے؟‘‘

’’ہاں، آٹھ بجے ٹھیک ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس بے چاری لڑکی کا کیا نام تھا؟‘‘

’’میری این میتھوز۔‘‘ ویلس نے نام بتا دیا۔

’’شکریہ مسٹر ویلس۔۔۔ خدا حافظ۔‘‘ مسز کرسچین ریسیور رکھ کر اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اپنے شوہر کی قد آدم پینٹنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گہرے صدمے اور کرب سے اس کے چہرے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئی تھیں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی تھیں۔

☆☆☆

ویلس، کار ڈرائیو کرتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے ایمی کو پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جو اس وقت تاریکی میں ملفوف تھا۔ وہ کار سے اتر کر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اور ایمی اس سے لپٹ گئی۔ ’’کیا تم ٹھیک ہو؟ تم نے مجھے فون کیا نہیں کیا تھا؟ تم کس لیے، بالکل غائب ہو گئے تھے؟‘‘ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ’’تمہارا چہرہ لہولہان ہے، ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہیں۔۔۔!‘‘

ویلس نے کوئی جواب دیے بغیر پالنے سے اپنی شیرخوار بچی کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ ایمی روتی ہوئی، چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔ ’’تم کہاں قید تھے؟ فون بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کیا ہوا ہے؟ تم بولو تو سہی، ٹام، کیونکہ اگر تم میرے شوہر ہو تو میرے ساتھ ایسا مت کرو۔‘‘

’’تم درست کہہ رہی ہو۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، درست ہے۔‘‘

’’اس سے مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔‘‘ اس نے بچی کو ویلس سے لے لیا۔ ’’یہ کافی نہیں ہے، ٹم۔‘‘ وہ چیخی۔

’’میں نہیں چاہتا کہ ہماری فیملی کو کچھ ہو جائے۔‘‘ ویلس نے سیدھے باتھ روم کا رخ کیا۔

’’دیکھو، ہم کہاں ہیں۔‘‘ ایمی اس کے پیچھے وہاں پہنچ گئی اور اس کا چہرہ اٹھا کر آئینے میں دکھایا۔ ’’اپنے آپ کو دیکھو۔۔۔!‘‘ وہ روتی ہوئی چیخی۔ ’’اپنے آپ کو دیکھو، تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ تم نے مجھے کس کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں کیا سمجھوں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟‘‘

ویلس کے چہرے پر کئی گہرے زخم تھے جن سے اب بھی خون بہہ رہا تھا۔ ’’ہم یہاں صرف چند روز ٹھہریں گے۔۔۔!‘‘ وہ سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولا۔ ’’مجھے افسوس ہے۔۔۔!‘‘

ایمی، روتی ہوئی اس سے دور ہٹ گئی۔ ویلس اس کے قریب پہنچ کر اسے تسلی دینے لگا۔ ''اس صورت حال میں کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ٹھیک؟ میں وعدہ کرتا ہوں۔۔۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنی فیملی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں پورا خیال رکھوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''اب مجھے پھر باہر جانا ہے۔''

''کہاں؟'' ایمی نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے مسز کرسچین سے ملاقات کرنی ہے۔'' وہ اپنی خون آلود جرسی اتارتا ہوا بولا۔ ''وہ واحد گواہ ہیں۔'' وہ باتھ روم میں جا کر اپنے زخم دھونے لگا۔

''کس چیز کی؟''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔ ''ہم ٹھیک رہیں گے۔۔۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

وہ تیار ہو کر اپنی کار میں مسز کرسچین کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ کال بیل کی آواز سن کر مسز کرسچین کے سیکریٹری نے دروازہ کھولا۔ ''ٹام ویلس، مسز کرسچین میری منتظر ہیں۔'' اس نے سیکریٹری سے کہا۔

''جی، وہ ہدایات چھوڑ گئی ہیں۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔

''نہیں، میں ان سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔'' وہ بولا۔

''مسز کرسچین نے آج سہ پہر میں خودکشی کر لی ہے، مسٹر ویلس۔''

ویلس حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔

''کیا۔۔۔؟ لیکن ابھی میری۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ میری ابھی ان سے بات ہوئی تھی۔'' وہ غیر یقینی لہجے میں بولا۔

''مسز کرسچین کی ہدایات یہ تھیں کہ یہ پہلا لفافہ میری این کی فیملی کے لیے ہے۔۔۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آپ خود سمجھ جائیں گے کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے۔۔۔ اور یہ دوسرا لفافہ آپ کے لیے ہے۔'' اس نے دو لفافے ویلس کی طرف بڑھا دیے۔

ویلس ہکا بکا اب بھی اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ سیکریٹری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تدفین اگلے ہفتے ہوگی۔ اگر آپ شریک ہونا چاہیں۔''

''مجھے۔۔۔ مجھے افسوس ہے، جناب۔'' ویلس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''شب بخیر، جناب۔'' سیکریٹری نے کہا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

وہ بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر لان میں آیا اور اس نے ایک لفافے کو کھول کر دیکھا۔ اس میں صرف ایک سادہ کاغذ تھا جس پر قلم سے یہ تحریر تھا۔۔۔ مجھے بھولنے کی کوشش کرنا۔۔۔ اور وہ صدمے سے رو دیا۔

☆☆☆

خوابیدہ ایمی اس کے قدموں کی آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں جا رہا ہوں۔'' وہ ایئر بیگ میں اپنے کپڑے رکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے واپس جانا ہے۔''

ایمی، اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ ''یہ جو بھی ہے، تم جہاں بھی تھے، اسے بھول جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''تم یہیں ٹھہرو۔''

''میں نہیں ٹھہر سکتا۔''

''ہماری شادی کو خطرے میں ڈالو گے؟'' ایمی نے پوچھا۔ ''اپنی فیملی کو خطرے میں ڈالو گے، کیوں؟''

''کیونکہ اس کیس کو ختم کرنے والا اب واحد شخص میں بچا ہوں۔'' وہ بدستور سامان پیک کرتا ہوا بولا۔ ''میں تمہیں فون کر دوں گا کہ گھر واپس جانا کب ٹھیک ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے، جب تم واپس وہاں آؤ تو ہم وہاں نہ ہوں۔'' ایمی غصے سے بولی اور بیڈ کی طرف مڑ گئی۔

ولیس نے ایک دبیز لفافہ اس کی طرف بڑھادیا۔ سنڈی کے تعلیمی اخراجات اور بہت کچھ۔'' اس نے کہا اور ایئر بیگ اٹھالیا۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

ایڈی اپنے گھر سے فرار ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی فحش فلموں کے کیسٹس کے کئی کارٹن اپنی کار کے ٹرنک میں رکھے اور آخری کارٹن رکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے اس کے سر پر ایک زوردار گھونسا پڑا۔ وہ بوکھلا کر تیزی سے پلٹا اور اس کے منہ پر تابڑ توڑ کئی مکے برس گئے۔ وہ فرش پر گر پڑا۔

''اب اپنے ہاتھ سر پر لے جاؤ۔'' ولیس نے اس کی پسلی میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ ''اور گھٹنوں کے بل جھک جاؤ۔'' اس نے اس کے گھٹنے پر ایک لات رسید کردی۔ ایڈی پھر فرش پر گر پڑا۔ ولیس نے پاگلوں کی طرح اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ''تم سمجھ رہے ہو کہ میں مذاق کررہا ہوں؟''

وہ اسے بدستور لاتیں رسید کرتے ہوئے چیخا۔ ''چوٹ لگی؟ لگی کہ نہیں؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' ایڈی گھگھیایا۔

ولیس نے اس پر پستول تان لیا۔ ''مشین کون ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''مجھے اس کا نام چاہیے۔'' ولیس چیخ کر بولا۔

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔''

ولیس نے ایک بار پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ''میں تمہیں مارتے مارتے نہیں تھکوں گا۔'' وہ دانت پیس کر غرایا اور اس کے منہ پر اپنا بوٹ رکھ کر اسے فرش سے رگڑنے لگا۔

''میں اس کا نام نہیں جانتا۔'' ایڈی بلبلا اٹھا۔ ''وہ نقاب پہنے ہوئے آتا ہے اور نقاب پہنے ہوئے جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔۔۔ اس کا تعلق کہیں نیویارک وغیرہ سے ہے۔ مجھے نہیں پتا۔''

ولیس نے اس کی پسلی میں ایک اور زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ ''کار میں بیٹھو۔''

''کیوں؟''

''تم مجھے وہ جگہ دکھاؤ گے جہاں تم نے لڑکی کو قتل کیا تھا۔'' ولیس دہاڑا۔

''ٹھیک ہے، کمینے۔'' ایڈی کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مار کھا کھا کر بھوت بن گیا تھا۔

ولیس کی کار جس جگہ جا کر رکی، وہ ایک ویران کھنڈر تھا۔ ہر سو گہری تاریکی تھی اور سناٹا تھا۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ جگہ جگہ گڑھے تھے جن میں بارش کا پانی جمع تھا۔ ''یہاں لانے سے پہلے تم نے اس سے کیا کہا تھا؟'' ولیس نے کار کی ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد ایڈی سے پوچھا۔ ''یہ بتایا تھا کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔۔۔ تم اسے کیسے ایک کامیاب اداکارہ بناؤ گے۔۔۔؟''

وہ اسے ریوالور سے کور کیے ہوئے کھنڈر میں داخل ہوا۔ ''تم مجھ سے آخر کیا چاہتے ہو؟'' موٹا ایڈی، اس کے آگے آگے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں۔'' ولیس نے اس پر ریوالور تان کر کہا۔

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟'' ایڈی نے کہا۔ ''وہ کچھ نہیں تھی۔ وہ ایسی ہی گلیوں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس طرح کی لڑکیاں لاپتا ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ہاں، میں نے اس سے بات کی تھی۔ ہر وہ بات جو وہ سننا چاہتی تھی۔۔۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ ایک اسٹار بن جائے گی۔۔۔ اس کے پاس دولت ہوگی اور ہر سہولت ہوگی۔ جیسے ہی میں نے بات ختم کی، وہ اپنے اسکرین ٹیسٹ کے سلسلے میں بڑی جذباتی ہوگئی تھی۔ میں نے ڈینو کو فون کیا۔۔۔ وہ اور مشین، ہوائی سفر کے ذریعے یہاں پہنچے اور ہم نے ایک چھوٹی سی پارٹی کی۔۔۔ تو اور تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''تم نے فلم دیکھی۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ ٹھیک نے

اختتام دیکھا۔۔۔اور کسی نے تمہیں اسے یہاں لاتے نہیں دیکھا؟''

''کون دیکھے گا؟ یہ جگہ ایسی خراب ہے۔ میں اسے اندر لایا اور اس نے مشین کو کونے میں کھڑے دیکھا اور منہ بسورنا شروع کر دیا۔ لہٰذا میں نے اس کی آواز بند کرنے کے لیے کچھ چانٹے مارے۔ ڈینو نے اسے سکون آور گولیاں کھلائیں۔۔۔مشین نے اس پر پلاسٹک ڈھک دیا۔ یہ تھا، جو ہوا۔۔۔وہ مرگئی۔۔۔اسے مرے ہوئے، عرصہ ہو گیا ہے۔ کسی نے توجہ نہیں دی، سوائے تمہارے۔۔۔!''

اچانک ویلس کا زوردار مکا اس کے جبڑے پر پڑا۔ پھر اس کی بھرپور ٹھوکر اس کی پسلی میں لگی۔ وہ گر پڑا۔ ''تم جاننا چاہتے تھے، اب جان گئے۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''تم یہاں تھے۔۔۔!'' ویلس سفاک لہجے میں بولا۔ ''تم نے یہاں۔۔۔اس جگہ کھڑے ہو کر میری این کو مرتے دیکھا۔ اس کا خون بہتے ہوئے دیکھا۔۔۔کیوں، تم نے کیوں دیکھا؟''

''کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا۔'' ایڈی اپنے منہ سے خون پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں نے کبھی ہی ایسا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔''

''کیوں، کیا تم نے ایستادگی محسوس کی تھی؟''

''نہیں، مجھے قے سی آنے لگی تھی۔'' ایڈی بولا۔ ''لیکن مجھے کیا پروا اگر کوئی امیر شخص اسے دیکھ لذت حاصل کرے۔۔۔جنسی لذت۔۔۔!'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ویلس نے اس کی پسلی میں پھر وہ زبردست ٹھوکریں رسید کر دیں۔ ''نیچے پڑے رہو۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''پھر تم نے یہ سب کیوں کیا؟''

''یہ سب میں نے پیسے کی خاطر کیا۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔''

''وہ کہاں ہے؟ اس کی لاش کا تم نے کیا کیا؟''

''میں نے اس کی لاش جنگل میں دفن کر دی۔ تمہیں اس کی لاش نہیں ملے گی اور اگر مل بھی گئی تو تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ تمہیں ایک لڑکی کا ڈھانچہ ملے گا بس۔ اس فلم کے بغیر تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ لہٰذا تم صرف یہ کرو کہ مجھے چھوڑ دو کیونکہ فلم کے بغیر تمہارے پاس کچھ کچھ نہیں ہے۔'' وہ ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ویلس نے دیوار سے ایک برقی تار کا بڑا سا ٹکڑا اکھاڑا اور پیچھے سے اس کے گلے میں تار کا پھندا ڈال کر کھمبے سے جکڑ دیا۔ ''اے۔۔۔تم کیا کر رہے ہو۔۔۔تم کیا کر رہے ہو۔۔۔!'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخا۔

چٹکلے



معاشیات داں وہ شخص ہے جو جانتا ہے کہ تیراکی کا تالاب آہستہ آہستہ خالی ہو رہا ہے۔ جب آپ اس میں چھلانگ لگانے لگتے ہیں تو وہ بہت، بہت ہلکی آواز میں کہتا ہے۔

''ذرا دیکھ کر۔'' جب حادثہ رونما ہو جاتا ہے تو وہ بہت، بہت اونچی آواز میں کہتا ہے۔

''میں نے پہلے بتا دیا تھا۔''



ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی پسنجر ٹرین جب چل پڑی تو ایک دیہاتی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور اسٹیشن ماسٹر سے کہنے لگا۔ ''جناب مجھے اس گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اگر میں تیز بھاگوں تو کیا اسے پکڑ سکتا ہوں۔''

اسٹیشن ماسٹر اطمینان سے کہنے لگا۔ ''اگر تیز بھاگو گے تو گاڑی سے پہلے اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہو۔''

''اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کرلو۔۔۔ چلو، جلدی کرو۔'' ویلس دانت پیس کر بولا۔
ایڈی نے تعمیل کی۔ ویلس نے اس کے دونوں ہاتھ بھی تار سے باندھ دیے۔ وہ زور زور سے چیخنے اور تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ ''میں تمہیں قتل کردوں گا، ایڈی۔'' ویلس اس پر جھک کر بولا۔ ''میں تمہیں قتل کررہا ہوں۔ اور تمہیں یہاں اسی طرح چھوڑ جاؤں گا جس طرح تم اسے چھوڑ گئے تھے۔''
''تم مجھے قتل نہیں کرو گے۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں۔'' ایڈی پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔
ویلس نے سامنے آکر اپنے پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگادی۔ ''تم کیا کرو گے؟'' ایڈی بولا۔ ''تم اپنے پستول سے مجھے ماردو گے جو تمہارے نام سے رجسٹرڈ ہے؟ تم نے سوچ سمجھ کر منصوبہ نہیں بنایا۔ ہے نا، جینئس۔۔۔؟'' وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔
ویلس دانت پیس کر اسے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''چلاؤ، گولی چلاؤ۔'' ایڈی اسے مشتعل کررہا تھا۔ ''چلو، لبلبی دبادو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں کسی ننھی سی بچی کی طرح رونا شروع کردوں گا۔۔۔؟ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک لڑکی کو قتل کیا۔ اب تم مجھے گولی ماردو۔۔۔ چلاؤ گولی۔۔۔!''
ویلس، اسے یوں ہی بندھا ہوا چھوڑ کر کھنڈر کے باہر آگیا اور ایک سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ ایڈی مسلسل چیخ چیخ کر اسے مشتعل کررہا تھا۔ ''اب تم کیا کرتے جارہے ہو۔۔۔؟ تم پولیس کے پاس نہیں جاسکتے۔۔۔ میرے پاس اپنی بیوی اور بیٹی کو بھیجو۔ ہم ایک فلم بنائیں گے۔۔۔!''
ویلس، ایک طرف بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے موبائل نکال کر جینٹ کا نمبر ملایا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز نے جینٹ کو نیند سے جگادیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ ''مسز میتھیوز میں ویلس ہوں۔'' اسے ویلس کی آواز سنائی دی۔ ''میں چند ہفتے پہلے آپ کی بیٹی میری این کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے آپ کے گھر گیا تھا۔۔۔!''
''ہاں، تمہیں اس کی ڈائری ملی تھی۔۔۔ اس نے ایک تحریر چھوڑی تھی اور اس کے احمق بوائے فرینڈ نے اسے کیلی فورنیا لے جاکر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک ایف بی آئی کو بتادیا تھا۔''
''یاد ہے، جب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ سچ جاننا چاہیں گی۔۔۔ چاہے حقیقت کچھ بھی ہو۔۔۔!''
''کیا؟'' جینٹ گھبرا کر سیدھی بیٹھ گئی۔
''کچھ جنونی لوگوں نے اسے لے جاکر قتل کردیا اور پھر دفن کردیا۔۔۔!''
''نہیں، نہیں، نہیں، نہیں۔۔۔!'' جینٹ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''مجھے افسوس ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا، میں اس کے لیے انہیں سزا دینا چاہتا ہوں۔''
''یہ تم مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟'' جینٹ چیخ چیخ کر روتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔
''میں انہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ مجھے انہیں نقصان پہنچانے کی اجازت دیجیے۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے بتادیں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم تھی۔ فقط یہ کہہ دیں کہ آپ کو اس سے کتنی محبت تھی۔۔۔ برائے کرم۔۔۔!''
''مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔'' جینٹ دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی بولی۔ ''میں اس سے بے حد پیار کرتی ہوں۔'' ریسور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ہسٹیریائی انداز میں چیختی چلی گئی۔
ویلس، سخت طیش کے عالم میں ریوالور بدست، کھنڈر میں داخل ہوا۔ ''کون ہے؟'' ایڈی نے چیخ کر پوچھا۔
ویلس، پاگلوں کی طرح ریوالور کا دستہ اس کے سر پر برسانے لگا۔ ایڈی کی کربناک چیخوں سے پورا کھنڈر گونج رہا تھا اور وہ لہولہان ہوگیا تھا۔ لیکن ویلس اس پر ریوالور کا دستہ برساتا چلا جارہا تھا۔ یہاں

تک کہ ایڈی کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی اور اس کی چیخیں دم توڑ گئیں۔ وہ اپنے ہی خون میں نہا کر ساکت ہوگیا تھا۔ ویلس کھنڈر کے باہر آیا۔ اس کی کار کے ٹرنک سے فحش کیسٹیں کے سارے کارٹن اٹھا کر کھنڈر میں لے گیا اور کارٹن کو ایڈی کی لاش پر الٹ دیا۔ فرش پر ہزاروں کیسٹس اور لڑکیوں کی ہزاروں تصویریں بکھر گئیں۔ اس نے ایک تصویر اٹھائی اور اسے ماچس کی جلتی ہوئی تیلی دکھا کر ڈھیر پر پھینک دی۔ آن کی ان میں بھیانک شعلوں نے اس ڈھیر سمیت ایڈی کی لاش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ ویلس مڑا اور وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

''نیوریک اسپتال، کیا آپ ڈیوٹی نرس سے ملا سکتی ہیں ہیں؟''

''ایمرجنسی، میں لیفٹیننٹ اینڈرسن ہوں، تیرہویں ڈویژن سے۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے کسی شخص کو زخمی پیٹ کے ساتھ داخل کیا ہے۔۔۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں۔۔۔ یہ ایک چاقو زنی کی واردات ہے۔''

''پیٹ کے زخم؟۔۔۔ نہیں، کوئی نہیں۔''

''شکریہ۔''

''مجھے ایک چاقو سے زخمی ہونے والے کی تلاش ہے۔۔۔ مرد، قد تقریباً پانچ فٹ، اس نے جعلی رپورٹ درج کرائی ہے۔''

''ہاں، ہمارے پاس پیر کو ایک شخص آیا تھا۔'' جواب میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ پرسوں یا ترسوں کا واقعہ ہے۔''

''معذرت۔''

''کوئنز کنٹری ایمرجنسی۔۔۔ میں لیفٹیننٹ اینڈرسن ہوں، تیرہویں سب ڈویژن سے۔۔۔ چند روز قبل چاقو زنی کی ایک واردات ہوئی تھی اور زخمی ہونے والے نے اپنا غلط نام اور پتا لکھوایا تھا۔ گورا مرد، پیٹ کے زخم کے ساتھ۔۔۔!''



ایک بار سکندر اعظم کے پاس فلسفی دیو جانس کھڑا تھا۔ سامنے بہت سی انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا ڈھیر تھا اور فلسفی ان کے نظارے میں غرق تھا اس کے انہماک کو دیکھ کر سکندر اعظم نے پوچھا۔

''دیو جانس! کیا سوچ رہے ہو۔'' دیو جانس نے جواب دیا۔

''حضور! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان میں آپ کے والد کی ہڈیاں بھی ہیں لیکن ان میں آپ کے والد اور ان کے غلاموں کی ہڈیوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔''

''توقف کریں۔ میں اپنا ریکارڈ چیک کرلوں۔'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ہاں کل ایک مریض کا علاج کیا ہے۔ دائیں ہاتھ پر ستارے کا نشان۔۔۔!''

''جی، ہاں۔ بالکل یہی۔'' ویلس جلدی سے بول پڑا۔

''جارج انتھونی ہگنیز۔'' دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔

''انشورنس پالیسی اس کی ماں کے نام ہے۔۔۔ ڈورس ویرونیکا ہگنیز۔۔۔!''

''یقیناً یہ وہی ہے۔'' ویلس بول پڑا۔ ''کیا آپ مجھے اس کا پتا دے سکتی ہیں؟''

''اس نے اپنی ماں کا پتا لکھوایا ہے۔'' آواز آئی۔ ''ڈوگلاسٹن کا۔۔۔ گلی نمبر بھی چاہیے؟''

☆☆☆

وہ اس پتے پر پہنچ گیا۔ شام اتر آئی تھی۔ سائے لمبے اور گہرے ہو چلے تھے۔ وہ شہر سے دور ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ بیشتر مکانات بدنما اور خستہ حال

تھے۔ الگنی پر کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور ہوائیں خزاں رسیدہ پتوں کو اڑائے پھر رہی تھیں۔ ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر کافی دیر تک اس مکان پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔۔۔ غروب آفتاب کے بعد چرچ کی ایک بڑی سی بس آ کر اس مکان کے سامنے رک گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بوڑھی عورت مکان سے برآمد ہوئی اور بس میں سوار ہونے سے پہلے پکار کر اپنے بیٹے سے بولی۔ ''میں دس بجے تک آ جاؤں گی، خدا حافظ۔''

تاریکی میں مکان کی دہلیز پر کھڑے ہوئے بیٹے نے دروازہ بند کر دیا اور اندر کی طرف مڑ گیا۔ تاریکی کی وجہ سے ویلس اس کی شکل دیکھنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ پلٹ کر اپنی کار کی طرف چل پڑا جو اس نے وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر رکھی تھی۔

اب ہر سو گہری تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ پھر بارش کی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، اپنی کار میں بیٹھے ہوئے ویلس نے ہاتھوں میں دستانے چڑھائے، ریوالور کو چیک کیا اور کار سے اتر کر اس مکان کی سمت چل پڑا۔ گہری تاریکی، سناٹے اور تیز بارش میں اس کے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا تاریکی باہم گلے ملتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ مکان کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ چوکنا انداز میں ریوالور تانے ہوئے قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھانے لگا۔ مکان میں گہرے سناٹے کا راج تھا۔ لیکن کسی ایک کمرے میں کوئی ریکارڈ بج رہا تھا اور موسیقی اس سناٹے کو دور کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مکان میں کوئی نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی کو ضرور موجود ہونا چاہیے تھا۔ ویلس کی چھٹی حس اسے کسی کی موجودگی سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ مختلف کوریڈور اور کمروں سے ہوتا ہوا، اس کمرے میں پہنچا جہاں سے بے ہنگم موسیقی ابل رہی تھی۔ اس نے پہنچ کر دیکھا کہ ایک گراموفون ریکارڈ بج رہا تھا۔ س کا مطلب بالکل واضح تھا۔ گھر میں ضرور کوئی موجود تھا ابھی وہ شش و پنج میں مبتلا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک گوشے سے کوئی اس پر حملہ آور ہوا۔

فضا میں بیک وقت دو چیخیں بلند ہوئیں اور حملہ آور نے اسے پوری شدت سے دیوار سے ٹکرا دیا۔ حملہ آور کے ہاتھ میں چاقو اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کلائی اپنی اپنے شکنجے میں جکڑی اور زور آزمائی کرنے لگے۔ اچانک نقاب پوش نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ ریوالور ویلس کی گرفت سے آزاد ہو کر دور فرش پر جا گرا۔ اس نے اپنا گھٹنا حملہ آور کے پیٹ میں مارا۔ حملہ آور دہرا ہو کر گر پڑا۔ ویلس نے لپک کر اپنا ریوالور اٹھا لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، نقاب پوش نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ویلس اپنا توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔ حملہ آور نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوا باہر ٹن کی چھت پر اور اگلے ہی لمحے چھت سمیت نیچے زمین پر آ گرا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آہنی پھاٹک کی سلاخوں کے پیچھے جا گرا۔ مشین نے ٹن کی باقی ماندہ چھت پر چھلانگ لگائی اور گیلی چھت پر سے پھسلتا ہوا ویلس کے پاس ہی زمین پر دھپ سے آ گرا۔ ویلس اٹھ کر اپنا پستول اٹھانے کو بھاگا لیکن پستول اس کی پہنچ سے دور تھا۔ مشین اٹھ کر چنگھاڑتا ہوا اس کی طرف دوڑا اور پیچھے سے اسے دبوچ کر اس نے اسے زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اچانک ویلس نے اسے زور سے دھکا دیا۔ مشین الٹ کر گرا۔ ویلس نے بھاگ کر سلاخوں کے پیچھے سے اپنا پستول اٹھا لیا اور پلٹ کر مشین پر تان لیا۔

''نقاب اتار دو، مشین۔'' وہ دانت پیس کر پھنکارا۔

تیز بارش میں گیلی زمین پر پڑے ہوئے نقاب پوش نے آہستہ سے اپنی نقاب اتار دی۔ دھواں دھار

بارش اور نیم تاریک لان میں ویلس اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

”تمہیں کیا توقع تھی۔۔۔؟ کوئی عفریت۔۔؟“

اس نے اپنی جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگالی۔”میرا نام جارج ہے۔ شاید تم جانتے ہو۔۔۔ کیا سمجھ میں نہیں آرہا؟ مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے اچھی کوئی شے نہیں جس کے ذریعے رات کو پرسکون نیند آسکے۔۔۔ بچپن میں کبھی میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ میں وہی ہوں جو کہ میں ہوں۔ یہی وضاحت اپنے بارے میں پیش کرسکتا ہوں۔۔۔!“

اچانک اس نے زمین پر پڑھا ہوا خنجر اٹھا کر ویلس پر کھینچ مارا۔ خنجر ویلس کے پیٹ میں جا دھنسا۔ اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکل گئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھاڑیوں میں گر گیا۔ مشین یا جارج چنگھاڑتا ہوا اٹھا اور اس نے اسے گلے سے دبوچ لیا۔” اس میں کوئی پراسراریت نہیں ہے۔“ وہ ویلس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہوا دانت پیس کر بولا۔”جو کام کرتا ہوں، اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے پسند ہے۔۔۔ اس لیے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔۔۔!“

ویلس نے سخت جدوجہد کر کے خنجر اپنے پیٹ سے نکالا اور اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے مشین کے پیٹ میں دستے تک گھونپ دیا۔ مشین ایک بھیانک چیخ کے ساتھ الٹ کر زمین پر گرا اور ساکت ہوگیا۔ خنجر اب بھی دستے تک اس کے پیٹ میں پیوست تھا۔ ویلس اپنا پیٹ پکڑے ہوئے بڑی مشکل سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

وہ مشین یا جارج کو پہچان گیا تھا۔ وہ ریسورس سینٹر کلیولینڈ کا سربراہ تھا جس سے وہ اس کے دفتر میں ملا تھا۔

☆☆☆

وہ کسی نہ کسی طرح کار ڈرائیو کرتا ہوا راستے میں پڑنے والے پہلے اسپتال پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے فرش پر لڑھک گیا۔ ایک نرس نے اسے پارکنگ لاٹ میں چت پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اس پر جھک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسپتال کا عملہ اسے فوراً اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے گیا۔

چند دنوں کے بعد وہ صحت یاب ہو کر گھر پہنچا اور سیدھا اپنی شیر خوار بچی کے پالنے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ بچی نے اسے دیکھا اور مسکرانے لگی۔ ویلس کے چہرے پر کرب پھیل گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔۔۔ کیا اس بچی کا مستقبل محفوظ تھا؟ یہ سوچ کر اس کا دل پھٹنے لگا۔ کیا اس کا معاشرہ اس بچی کو تحفظ دے سکتا تھا؟

یکا یک وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور اپنی بیوی کی گود میں منہ چھپا کر سسک پڑا۔” مجھے بچالو۔۔۔ مجھے بچالو۔۔۔!“

☆☆☆

اگلی صبح وہ اپنے مکان کے باہر لان میں کھڑے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں کو اکٹھا کر رہا تھا کہ ڈاکیا ایک خط ڈال گیا۔ اس نے خط کھول لیا۔ یہ جینیٹ کا خط تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔۔۔”پیارے مسٹر ویلس، مجھے خط لکھنے، اپنا اصلی نام بتانے اور اپنی اصلیت سے آگاہ کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ کیا ہوا، بہت شکریہ۔۔۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ لوگ مر چکے ہیں لیکن میرے دل میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اسے کبھی کوئی چیز پر نہیں کرسکے گی۔ آپ نے جو رقم بھیجی ہے، میری کوشش ہوگی کہ کسی اچھے اور نیک کام میں استعمال ہو۔ اس سے قبل میں خود بھی کچھ علاج کرالوں، آپ کے سچ بولنے کی وجہ سے مجھے آپ سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر اب میں سمجھی ہوں کہ میں اور آپ شاید وہ دو افراد ہیں جنہیں ہمیشہ میری این کی حقیقی پروا تھی۔۔۔ آپ کی مخلص۔۔۔ جینیٹ میتھیوز۔“

اس نے خط تہ کر کے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو دہلیز پر اپنی بچی کو گود میں اٹھائے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لو دینے لگی اور ویلس بھی طمانیت سے مسکرانے لگا۔

☆☆

نئی زندگی

محمد ابراھیم جمالی

محبوب، محبت، محب، رفاقت اور فرقت کے بعد کی یک جائی۔
طویل ہجر کے بعد تجدید محبت کی داستان، وہ تجدید جو اداس زندگی میں نیا رنگ بھر دیتی ہے پھر رنگ تو بھرے مگر یہ رنگینی کسی اور کا مقدر تھی

ان کرب ناک لمحوں کا احوال جن کا مال زندگی کو روشن اور خوشگوار بنا گیا

وہ اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا تھا۔ فرزانہ کو یقین تھا کہ اس کی دلی کیفیت بھی بالکل وہی ہوگی جو وہ خود محسوس کر رہی تھی۔ فرزانہ بڑے خوش گوار موڈ میں فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ گفٹ سینٹر سے شاپنگ کر کے وہ چند ہی قدم چلی تھی' تب اس کی نظر ریحان پر پڑی۔ وہ بھی فرزانہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ اچانک فرزانہ کے دل میں آیا کہ وہ پلٹ کر چل دے' اسے نظر انداز کر دے۔ یہ سوچ کر وہ مڑی ہی تھی کہ عقب میں اس کی آواز نے اس کے قدموں کو گویا پتھر کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

''فری!'' اس کے لہجے میں واقعی حیرت تھی۔

وہ مڑی اور یوں ظاہر کیا' جیسے اب پہلی بار اسے دیکھا ہو۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''اوہ ریحان!'' وہ بولی۔ ''کیسے ہو؟''

''فری... کمال ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ خریدا؟''

''ہاں... اختر کے لیے ایک تحفہ خریدا ہے۔ کل اس کی سالگرہ ہے نا۔''

''اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟''

''بس... گھر جانے کے لیے ٹیکسی دیکھ رہی تھی۔''

''میرے ساتھ ایک کپ تو پی سکتی ہو۔''

''نہیں...'' اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ ''فوزیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''فوزیہ؟'' اس نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھرے۔

''اوہ... اچھا فوزیہ تمہاری بیٹی کا نام ہے نا؟''

''ہاں...''

''تم کیسی ہو... سب لوگ کیسے ہیں' اور اختر؟''

''سب ٹھیک ہیں' شکریہ۔''

''فری! تھوڑی دیر تو رک جاؤ' کافی پی لو میرے ساتھ۔ تمہیں دیکھے گویا صدیاں بیت گئی ہیں۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''اوہ!'' اس نے بے بسی سے ہاتھ مسلتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

وہ اس مسکراہٹ سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے سوچا۔ ''آخر میں اس سے اتنی خوف زدہ کیوں ہو رہی ہوں؟ کچھ باتیں میں بھی جاننا چاہتی ہوں' اس سے



اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے.... لیکن میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔"

"اب شاید میں اس کا حق بھی نہیں رکھتا، بہرحال آؤ۔" ریحان نے اس کے سرد ہوتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ فرزانہ نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کی انگلیوں کے لمس سے اس کا بدن حیرت انگیز طور پر جاگ اٹھا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ریحان کو اس کی آنکھیں ایک دم سرخ نظر آئیں، فرزانہ خود بھی آنکھوں میں جلن سی محسوس کر رہی تھی۔

"تم کیسے ہو ریحان! اور ستارہ؟" فرزانہ نے غیر ارادی طور پر اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہارے سامنے ہوں اور ستارہ بھی ٹھیک ہے۔" ریحان نے جواب دیا۔ "فرزانہ! تمہیں اچانک دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے، میں بیان نہیں کر سکتا۔" اس نے اپنے جملے کے اختتام پر فرزانہ کی پیشانی شکن آلود ہوتے دیکھی تو پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کک.... کچھ نہیں، کیوں؟" وہ الجھ کر بولی۔

"تمہارے چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں.... جب تم سوچنے لگتی ہو تو تمہارے چہرے پر اسی طرح شکنیں نمودار ہو جاتی ہیں، تمہیں معلوم ہے؟"

"میں نے بھی غور نہیں کیا۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ دفعتاً" اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ فوراً" یہاں سے چلی جائے۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ سخت خطرے میں ہے۔ اس نے سوچا کہ کافی پی کر وہ جلد سے گھر روانہ ہو جائے گی۔ وہ گھر جو اس کے لیے ارضی جنت کا نمونہ تھا۔ جہاں اس کے سارے رشتے موجود تھے۔ محبت کرنے والا شوہر' فرشتوں سی معصوم بیٹی۔

"تمہیں غور کرنا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔ "تم آئینے میں اپنا جائزہ لیا کرو۔ تم پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔"

"شکریہ۔"

"تم نے بال بھی کٹوا لیے ہیں' بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہے۔ فرزانہ! تم دو آتشہ ہو گئی ہو۔"

"تم بھی پہلے سے بہتر لگ رہے ہو ریحان!" وہ بولی۔

"واقعی؟ مگر مجھے تو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اتنی ذمے داریاں سر پر پڑ گئی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ گھر چلانے کے لیے ستارہ کو بھی ملازمت کرنا پڑتی ہے۔"

فرزانہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں امنڈتے چلے آئے۔

"تمہیں تو ملازمت نہیں کرنی پڑتی نا؟" ریحان نے پوچھا۔

"نہیں۔ اختر ایک فرم میں اعلا عہدے پر فائز ہے اور کئی افراد پر مشتمل عملہ اس کے ماتحت ہے اور فرم کی جانب سے رہائش کے لیے کوٹھی بھی ملی ہوئی ہے۔" فرزانہ کے لہجے میں ہلکا سا تفاخر جھلک آیا۔

"بہت خوب۔۔۔ تو گویا زندگی بڑی فراغت سے گزر رہی ہے۔" ریحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کبھی میری یاد بھی آئی؟"

فرزانہ کو محسوس ہوا کہ گویا کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ وہ رک گئی۔ "یہ۔۔۔ یہ جگہ کیسی رہے گی؟" اس نے دائیں طرف واقع ریستوران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس کے سامنے چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا۔ لان پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر رنگ برنگی چھتریاں سایہ فگن تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ گفتگو کے انتہائی نازک موڑ پر وہ ریحان کو جواب دینے سے بچ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" ریحان نے ریستوران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم اندر فیملی کیبن میں بیٹھیں گے۔"

"ریحان!" دفعتاً" وہ ایک خیال کے تحت چونک کر بولی۔ پھر اس نے گویا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دو پرانے دوستوں کی طرح صرف ایک کپ کافی پئیں گے اور اور بس۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ پہلے تو حیران ہوا' پھر کچھ خفیف سا ہو کر بولا۔ "ظاہر ہے۔۔۔ لیکن فرزانہ! اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ۔۔۔"

"میں صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے کہ اب میں ماضی کی فرزانہ نہیں رہی اور ماضی کو دہرانا بھی نہیں چاہتی۔"

"میں نے ماضی کے حوالے سے تو کوئی بات نہیں کی۔" ریحان بولا۔ اس کے لہجے میں اچانک اجنبیت سی آ گئی۔

"مم۔۔۔ میں صرف وضاحت کرنا چاہتی تھی۔" وہ ہکلاتے ہوئے کمزور سے لہجے میں بولی اور دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگی کہ یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے سوچا کہ وہ اندر ہی اندر بہت گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ ہے۔

"چلو چھوڑو ان باتوں کو' آؤ میں کافی منگواتا ہوں' میں نہیں چاہتا کہ تمہیں دیر ہو جائے۔ اختر بے چارہ تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔" ریحان کے لہجے میں بے رحمی سی در آئی تھی۔ یہ ہی بے رحمی ماضی کی یاد دلاتی تھی۔ لڑکپن کی ایک خاصیت جو اس کے کردار کا حصہ رہی تھی۔ اسی خصوصیت نے فرزانہ کو اس کی طرف

متوجہ کیا تھا۔
"اختر اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔" فرزانہ نے جواب دیا۔ "ورنہ میں اکیلی شاپنگ کرنے نہ آتی۔"
ریحان نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ دونوں خاموشی سے ریستوران میں داخل ہو گئے۔ فرزانہ کا جی چاہا کہ وہ اس سے معذرت کرلے۔ ریحان نے یقیناً اس کی بات کا برا منایا تھا۔ لیکن وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کہہ سکی۔ فیملی کیبن میں داخل ہو کر بیٹھتے ہوئے فرزانہ نے کہا۔ "تم جب ناراض ہوتے ہو تو بالکل بھوت لگتے ہو۔"
"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے جیسے ابھی تم ہوا بن کر غائب ہو جاؤ گے' بالکل کسی بھوت کی طرح۔"
ریحان کو ہنسی آگئی۔ "میں تم سے زیادہ دیر تک ناراض بھی نہیں رہ سکتا۔"
وہ بھی ہنس دی اور ریحان نے فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ فرزانہ نے نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ہم یہاں کافی پینے آئے ہیں۔" اس نے گویا اسے یاد دلایا۔
ریحان اچانک سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "تمہیں پتا ہے اس وقت میرا دل کیا چاہ رہا ہے۔"
"کیا؟" فرزانہ کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
"تمہیں پیار کرنے کو۔"
"نہیں ریحان۔"
"کیوں؟ کیا تمہارے دل میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں؟"
"لیکن ریحان اب میں..." فرزانہ کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ ریحان کی ضدی اور بے رحم طبیعت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ دے گا اور اس کے خوابیدہ ماضی کو جھنجھوڑ کر جگا دے گا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا جب وہ اسے ساحل پر لے گیا تھا۔ وہ احتجاج ہی کرتی رہ گئی تھی مگر وہ نہ مانا۔
"آخر کار فرزانہ ہی کو اس کی ضد کے سامنے ہار ماننا پڑی اور اس نے برقع اتار کر پرس میں ڈال دیا تھا۔ ریحان نے کہا تھا۔ میں تمہارے بالوں کو سمندر کی ہوا سے بکھرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔" ساحل پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ خوف سے کانپ رہی تھی کہ کوئی جاننے والا' رشتے دار یا پڑوسی اسے وہاں نہ دیکھ لے۔
اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کا دل کسی نادیدہ لے پر گویا تھرک رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی ان کیف آگیں دھڑکنوں سے گویا ایک عرصے بعد آشنا ہو رہی تھی۔ ویٹر کیبن میں داخل ہوا اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔
"دو کریم کافی لاؤ۔" ریحان نے بلا جھجک کہا۔ "لیکن جلدی' میری بیوی کو ایک جگہ پہنچنا ہے۔"
فرزانہ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ویٹر معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے واپس چلا گیا۔ "معاف کرنا فری! ایسے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔"
"ہاں۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور تھوڑا سا کھسک کر ریحان سے چند انچ کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا کہ پرس سے مرر نکال کر لپ اسٹک درست کرلے' لیکن اسے اپنے ہاتھ گویا بے جان سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ اپنی نظریں ریحان کے چہرے سے ہٹالے' مگر وہ ایسا نہ کرسکی۔
"تم موجودہ زندگی سے خوش ہو فرزانہ؟" ریحان نے پوچھا۔
"ہاں' میں بہت خوش ہوں۔" فرزانہ بلا جھجک بولی۔ اس نے گود میں رکھے اپنے ہاتھ پر نظر ڈالی' جس کی ایک انگلی میں شادی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔
"تم سناؤ... ستارہ کے ساتھ تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"
"بس... گزر رہی ہے۔" ریحان نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کیسی گزر رہی ہے' یہ مت پوچھو۔"
"کیوں؟" فرزانہ کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔
"ہم دونوں زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے اس کا ایندھن بنے ہوئے ہیں۔" ریحان نے کہا۔ "ستارہ ایک فرم میں جنرل منیجر کی سیکریٹری ہے۔ میں ایک الیکٹرونک اسٹور میں سیلز مین ہوں۔

ساجدہ اور ریحانہ کی شادی کروا چکا ہوں۔ اب اسی سال کے آخر میں نیلما کو بھی بیاہ دوں گا۔" آج کے دور میں تین بہنوں کا بوجھ کچھ کم نہیں ہوتا اوپر سے ماں سدا کی روگی۔ مستقل اس کا علاج جاری رہتا ہے۔ بہر حال' مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم واقعی اپنی موجودہ زندگی سے خوش ہو۔

ریحان نے آخری جملہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ادا کیا۔ فرزانہ نے فوراً" نگاہیں جھکا لیں۔

"ہاں۔" فرزانہ نے سوچا۔ وہ خود کو واقعی خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اس کے والدین نے جب ریحان کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا تو وہ اپنے گھر والوں سے کئی دنوں تک ناراض رہی تھی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ کافی عرصے تک وہ بے چین رہی' لیکن جلد ہی اس کے ماں' باپ نے اس کی شادی اختر سے کرادی۔ ابتدا میں تو اسے بہت مشکل پیش آئی' پھر آخر کار معمولات میں کھو گئی اور پر سکون زندگی کی قدر کرنے لگی۔ اب اسے ہوائی قلعے نہیں تعمیر کرنے پڑتے تھے اور جھوٹے منصوبے نہیں بنانا پڑتے تھے جو ریحان کی رفاقت میں بناتی تھی' اس کی زندگی میں حقیقی سکون اور گرم جوشی کی ایک سبک خرام ندی سی بہنے لگی تھی۔ زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی اس سے وہ بے حد مطمئن' شکر گزار اور خوش تھی۔ اپنے گھر کے لان میں پھولوں کے درمیان بیٹھ کر گنگنا سکتی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی کہ جو خواب اسے ریحان نے دکھائے تھے ان کی تعبیر اختر نے اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ اختر کے لیے شاپنگ کر سکتی تھی۔ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر ریحان کی طرف دیکھا اور پھر سوچنے لگی کہ یہ شخص پھر اس کی زندگی میں آدھمکا تھا۔

"اختر ایک بہت بڑی فرم میں اعلا عہدے پر ملازم ہیں۔" فرزانہ نے دہرایا' پھر بولی۔ "فوزیہ سات برس کی ہو گئی ہے اور میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ فوزیہ بہت ذہین بچی ہے' بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ ریحان گویا اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تو فرزانہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ غلطی فرزانہ کی تھی' وہ جس زندگی کی باتیں کر رہی تھی' اپنے گھر' اپنی بچی کی باتیں۔ ریحان کو ان میں ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لمحے بھر کے لیے وہ مایوس ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اب ایسا کون سا موضوع ہو سکتا ہے' جس پر وہ دونوں بات کر سکیں' کیونکہ اب ان کے درمیان محبت کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

"اختر کیسا ہے؟" ریحان نے پوچھا۔

"وہ بہت اچھے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"میں بھی تمہیں بہت چاہتا ہوں فرزانہ' ابھی بھی۔"

"واقعی!" فرزانہ نے گویا حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔"

"مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں ہے۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔

"نہ ہو۔" وہ بولا۔ "مگر یہ سچ ہے۔"

ویٹر کافی لے آیا۔ دونوں خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ دفعتاً" فرزانہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ "میں سمجھ نہیں پائی کہ میری کون سی زندگی حقیقی تھی' وہ جو تمہارے ساتھ گزری یا یہ۔۔۔ جو اختر کے ساتھ گزر رہی ہے۔"

"جو میرے ساتھ گزری۔" ریحان نے بڑے وثوق سے کہا۔

"ہاں شاید۔۔۔"

"تمہیں واقعی جانے کی جلدی ہے؟"

"ہاں۔۔۔"

"میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کم سے کم آج کا دن تو میرے ساتھ گزار دو۔" ریحان کے لہجے میں التجا تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں' ہرگز نہیں۔" فرزانہ نے تیزی سے کہا۔

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟"
"نہیں ریحان..... لیکن....."
"پہلے جب میں تمہیں پیار کرتا تھا' تمہاری رفاقت کا طلب گار ہوتا تھا' تب تو تم برا نہیں مناتی تھیں۔ یا مناتی تھیں؟"
"نہیں.... میں بہت خوش ہوتی تھی۔"
"مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے میں تمہیں بلاوجہ تنگ کر رہا ہوں۔ شاید تمہاری کشش کا سبب یہ ہی تھا۔" ریحان نے کہا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔"
کیبن میں خاموشی چھا گئی۔ ریحان اس کی طرف دیکھتا رہا۔ فرزانہ نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ "کچھ بولو فرزانہ!" اس نے کہا۔
"کیا؟"
"کچھ بھی....."
"تمہیں معلوم ہے' میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی ہے۔" فرزانہ نے کہا۔
"اچھا.... بہت خوب۔" ریحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گویا اب ہمیں ملنے میں آسانی رہے گی۔"
یہ کہہ کر فرزانہ کے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا' لیکن اس نے جلدی سے چہرا جھکا لیا' پھر اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔"
ریحان کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ اس نے کہا۔ "ایک کاپی کافی کا اور ہو جائے؟"
"نہیں اب میں جانا چاہوں گی۔"
"تم مجھ سے خوف زدہ ہو کیا؟" ریحان نے خیالی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں....."
"واقعی!" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "مگر کیوں؟"
"تمہیں بھلانے میں مجھے ایک طویل عرصہ سخت کشمکش میں گزارنا پڑا تھا۔ اور وہ تمام عرصہ میرے لیے بڑا جاں گسل تھا۔ مگر اب میں نہیں چاہتی کہ دوبارہ....."

فرزانہ بولتے بولتے دفعتاً خاموش ہو گئی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی کہ اب ریحان سے یہ باتیں کرنے سے کیا حاصل؟ اس طرح تو گویا وہ اپنی کمزوری ظاہر کر رہی ہے' لیکن نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کے ہونٹوں سے پھسلتے جا رہے تھے' پھر اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔"
"میں نے۔" ریحان حیرت سے بولا۔ "میں نے تم سے زیادتی کی تھی فرزانہ؟"
"ہاں۔" فرزانہ نے دھیرے سے کہا۔ "میں سمجھنے لگی تھی کہ تم انتقاماً ایسا کرنے لگے ہو۔ میری شادی کے بعد جب بھی تم مجھے فون کرتے تھے۔ میں گھنٹوں روتی رہتی تھی۔ خیر' وہ وقت بھی آخر کار گزر ہی گیا' پھر تم نے شادی کر لی۔"
"مجھے تم ہر وقت یاد آنے لگی تھیں۔" ریحان نے کہا۔ "مگر میں یہ سب کچھ انتقاماً تمہیں دکھ پہنچانے کے لیے ہرگز نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت تمہارا تصور میرے ذہن میں رہتا تھا' تمہاری باتیں' ساتھ گزارے ہوئے لمحات۔ میرا کوئی لمحہ تمہارے تصور کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ تمہاری جدائی نے مجھے مار دیا تھا فرزانہ! پھر مجھے دوبارہ زندہ ہونے میں بہت وقت لگ گیا۔"
فرزانہ اس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر گویا پگھلنے لگی۔ اس کے بدن پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ دفعتاً اس پر خوف نے یلغار کر دی۔ اس نے جھرجھری سی لے کر کہا۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔"
"فرزانہ!" ریحان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ فرزانہ کو گویا بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔ "میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ مجھے اپنی چاہت کا اندازہ آج تم سے دوبارہ مل کر ہوا ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میرے دل سے تمہاری محبت کم نہیں ہوئی۔"
فرزانہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
"سچ سچ بتانا فرزانہ!" ریحان نے اس کی طرف

قدرے جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے اچانک اپنے روبرو دیکھ کر تم نے کیا محسوس کیا تھا؟“

”مم.... میں تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر گویا دوبارہ زندہ ہوگئی تھی۔“ فرزانہ کو خود اپنی آواز کوسوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”مجھ میں جیسے زندگی کی حرارت ختم ہوگئی تھی، لیکن تمہیں دیکھنے اور تم سے دوبارہ ملنے کے بعد گویا میری تشنہ روح کو قرار سا آگیا ہے۔“

”اب ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ ریحان نے قدرے جوش سے کہا۔ فرزانہ کی زبانی اپنے لیے محبت اور چاہت کے اعترافی جملے سن کر اس کے چہرے پر چمک سی آگئی تھی۔ ”اب ہم دوبارہ ساتھ ہیں فری، چلو اٹھو کہیں چلتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”کہیں بھی۔“ ریحان نے کہا اور فرزانہ اس کے چہرے پر پھوٹتے جوش کو دیکھتی رہی۔ ”میری کار قریب ہی موجود ہے۔ میں ابھی لے آتا ہوں۔“

”اب ان ملاقاتوں کا انجام کیا ہوگا؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ضروری تو نہیں کہ ہر بار کوئی نہ کوئی انجام ہو۔ ہم جہاں چاہیں گے، جس طرح چاہیں گے ساتھ رہیں گے۔ گھر میں تم اختر کی بیوی اور میں ستارہ کا شوہر رہوں گا۔ باہر ہم اسی طرح ملتے رہیں گے جیسے ماضی میں ملتے تھے۔ تم دفتر فون کرکے اختر سے کہہ دو کہ تمہیں دیر ہوجائے گی۔ کوئی بھی بہانہ کردینا۔ میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ تم فون کرسکتی ہونا؟“

”ہاں۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

”تم اس سے کیا کہو گی؟“

”میں ان سے کچھ بھی کہہ سکتی ہوں۔“ فرزانہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ”بلکہ مجھے کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ مجھے کچھ دیر ہوجائے گی۔ وہ مجھ سے سوال نہیں کریں گے کہ میں کہاں چلی گئی تھی۔ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ ریحان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

فرزانہ غور سے ریحان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹوں کی دل نشین مسکراہٹ، چمکتی ہوئی آنکھیں، اشتیاق سے آگے جھکا ہوا جسم۔ وہ ان تمام چیزوں کو غور سے دیکھتی رہی، جن سے وہ محبت کرتی تھی، جنہیں وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی۔ اس شام سے اپنے اندر دفن کیے ہوئے تھے۔ اس نے فون پر ریحان کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ سچ کہہ رہا تھا اس کے دل میں اب بھی فرزانہ کی محبت موجزن تھی اور وہ خود آج اس سے مل کر دوبارہ زندہ ہوئی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ ملاقات بہت ضروری تھی۔ اب اس کی تشنہ روح کو قرار سا آگیا تھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور اٹھ کر میز پر رکھا ہوا پرس اٹھالیا۔

”کاؤنٹر پر فون موجود ہے۔“ ریحان نے مسکرا کر کہا۔

”میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

”تو پھر جلدی سے فون کرکے آؤ۔“ ریحان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

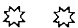
”نہیں۔“

”کیا؟“

”مجھے گھر جانا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”کک.... کیا؟“ ریحان بھونچکا رہ گیا۔ ”تم.... تم تو کہہ رہی تھیں کہ.... تم دوبارہ زندہ ہوگئی ہو؟“

”ہاں.... میں نے سچ کہا تھا۔“ وہ بولی، پھر ریحان کو حیران دیکھ کر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے دوبارہ زندہ کرنے کا بہت شکریہ۔“ وہ مڑی اور اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر چل دی۔ باہر نکل کر اس نے آنکھوں میں آنے والے دو آنسوؤں کو ٹشو پیپر میں جذب کیا اور ٹیکسی کے لیے نظریں دوڑانے لگی۔



ضمیر کی خلش

کامل ظہیر

مثبت رویے اور اچھے کام کرنے سے انسان ہمیشہ مطمئن رہتا ہے اور غلط کام کے نتیجے میں زندگی کے کسی بھی موڑ پر کوئی کسک بیدار ہو کر زندگی کو ناشاد اور غیر مطمئن کردیتی ہے۔ ایسی ہی دل گداز تحریر جس میں مختلف لوگوں کے رویے تضادات کا شکار تھے۔

ایک عادی مجرم کے جیل سے رہا ہونے کا قصہ، جو اپنی سابقہ روش اپنائے ہوئے تھا



مین کی بندرگاہ کا وہ علاقہ بڑا حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ دور دور تک بحری جہاز، لانچیں، موٹر بوٹس اور کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ ان پر لگے ہوئے رنگ برنگے پرچم لہرا رہے تھے۔ سمندر کا نیلگوں پانی دھوپ کی آمیزش سے سونے میں گھلا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس ساحلی ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سیلی میری منتظر تھی۔ اس نے مجھے اسی ریسٹورنٹ میں بلایا تھا اور کہا تھا کہ لنچ اس کے ساتھ کروں۔

سیلی میرے کالج کے زمانے کی ساتھی تھی۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر مخلص تھے کہ لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی ضرور بنیں گے مگر وہ کہتے ہیں نا کہ اس طرح کے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں۔ شاید ہمارے مقدر میں یہ نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو شدت سے چاہنے کے باوجود ایک نہ ہو سکے۔

سیلی مقررہ ریسٹورنٹ میں میری منتظر تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری زلفیں اور بھی گھنی اور چمک دار لگ رہی تھیں۔ آنکھوں میں وہی پہلے والا سحر تھا جس نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ آج کئی سال بعد اسے سامنے دیکھ کر میرے دل کی دنیا میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی تھی۔ ہم دونوں نے گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ اس کی آنکھوں میں ماضی کا پیار اُمڈ آیا تھا۔ پھر بھی میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سوگواری بھی تھی۔ اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نرسنگ کا پیشہ اپنایا تھا۔ نرس بننے کے بعد وہ خاصی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح بات بات پر قہقہے لگانے والی سیلی نہیں رہی تھی۔

''کیسی ہو؟ تم پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی ہو سیلی! ہے نا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟'' اس نے کہا ''لوگ کہتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے ایک نظر سیلی کی طرف دیکھا۔ وہ شاید میری نظروں کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ میں اس سے شادی کے موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر تک کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے رہے۔ اسی دوران ہنسی مذاق بھی چلتا رہا۔ پھر سیلی نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ میں آج اس ریسٹورنٹ میں لنچ پر اس کا مہمان تھا لہٰذا میری میزبانی کے فرائض اسی کو ادا کرنے تھے۔

''سیلی! تم نے مجھے اتنے عرصے بعد کیسے یاد کر لیا؟'' آخر میں نے سوال کیا۔

''تانیا نام کی ایک بیس اکیس سالہ لڑکی میرے ساتھ میرے اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہے۔'' سیلی نے کہنا شروع کیا ''وہ بے چاری اپنی زندگی اور حالات سے بہت پریشان ہے۔ تم نے شاید رسل کورڈ کا نام سنا ہو؟'' یہ کہہ کر اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ وہ شخص تو نہیں جو حال ہی میں پیرول پر رہا ہوا ہے؟ اس نے چند سال پہلے ایک عورت کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر ہلاک کر دیا تھا جس کی وجہ سے اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی؟'' میں نے سیلی سے کہا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''ہاں یہ واقعہ چار سال پہلے کا ہے۔'' سیلی نے کہا ''اور وہ عورت جسے سیڑھیوں سے دھکا دیا گیا تھا' اسی لڑکی تانیا کی ماں تھی۔''

''اوہ! تو یہ بات ہے!''

''ہاں' تانیا ہی اس کیس کی ابتدائی گواہ تھی۔''

''گویا وہ اس شخص' رسل کورڈ سے خوف زدہ ہے؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''ڈف!'' سیلی نے نظریں جھکا کر مجھے مخاطب کیا ''اصل بات یہ تھی کہ رسل کورڈ نے تانیا کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تانیا اس شیطان کے ارادوں کو پہلے ہی سمجھ چکی تھی..... بہرحال چونکہ رسل

کے دھکا دینے سے تانیا کی ماں کی موت واقع ہوئی تھی اس لیے عدالت نے رسل کورڈ کے چھوٹے سے کاروبار کو فروخت کرنے کا حکم دیا اور اس سے ملنے والی رقم تانیا کے حوالے کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ پیرول پر رہا ہو گیا ہے اور تانیا کو خطرہ ہے کہ وہ اس سے انتقام لینے ضرور آئے گا۔ اسی لیے اس نے خود کو اپارٹمنٹ تک محدود کرلیا ہے۔'' سیلی نے پوری بات تفصیل کے ساتھ مجھے بتادی۔

''جس وقت رسل کورڈ نے تانیا پر بری نظر ڈالنے کی کوشش کی تھی اس وقت تانیا کی عمر کیا تھی؟'' میں نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

''سترہ سال۔'' سیلی نے جواب دیا ''المیہ یہ ہے کہ تانیا کی ماں نے تانیا سے درخواست کی تھی کہ وہ عدالت میں یہ بیان نہ دے کہ رسل نے اس کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ اس پر تانیا کو اور بھی دکھ ہوا اور اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا ساری دنیا پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اس کی ماں نے جو بات کہی تھی اس پر تانیا کا دل چاہا تھا کہ وہ خود کو ہلاک کرلے مگر....''

''پھر اس نے عدالت میں کیا بیان دیا تھا؟'' میں نے سیلی سے سوال کیا۔

''اس نے عدالت میں صرف اپنی ماں کے ساتھ رسل کی بدسلوکی کا ذکر کیا تھا اور رسل کی اس گھناؤنی حرکت کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا جو اس نے تانیا کے ساتھ کی تھی۔''

''یہ تو تانیا کی غلطی تھی۔'' میں نے ناگواری سے کہا ''جب اس کی ماں مرچکی تھی تو وہ کیوں خاموش رہی؟ اسے رسل کورڈ کو بے نقاب کردینا چاہیے تھا۔''

''اس کی بھی کئی وجوہ ہیں۔'' سیلی نے کہا ''میرا خیال ہے کہ تانیا جیسی کمزور اور ڈرپوک لڑکی عدالت میں ایسا بیان نہیں دے سکتی تھی۔''

''کیا تانیا نے اپنی آنکھوں سے رسل کو دیکھا تھا.... میرا مطلب ہے کہ اس نے رسل کو اپنی ماں کو سیڑھیوں سے دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں.... وہ گھر چھوڑ چکی تھی۔ اس کے بعد یہ ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا۔'' سیلی نے بتایا۔

''اس کے بعد وہ کیا کرتی رہی؟ کہاں رہی؟'' میں نے سیلی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ میکڈونلڈ میں کام کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے گریجویشن کرلیا۔ اس مقدمے نے اسے اس حد تک مایوس و دل گرفتہ کردیا تھا کہ وہ دیوانی سی ہوگئی تھی۔ وہ دنیا کے سامنے جانے اور لوگوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسی عالم میں اس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور ایک ایسے گروپ میں شامل ہوگئی جو گلیوں میں آوارہ گھومتا تھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں کے وکیل کی نظر اس پر پڑگئی تو وکیل نے تانیا کو آوارہ گردوں کے گروپ سے نجات دلائی۔ کچھ عرصہ وکیل نے اس کی دیکھ بھال کی پھر وہ میرے پاس آگئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ جوان لڑکی تھی اسے پناہ کی ضرورت تھی۔''

''سیلی! یہ تو بتاؤ کہ تانیا کا اصل باپ کون ہے اور کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تانیا کی ماں کی زندگی میں نہ جانے کتنے مرد آئے تھے' تانیا کس کی اولاد ہے' اس کا فیصلہ کون اور کیسے کرسکتا ہے؟'' سیلی نے نظریں جھکا کر کہا ''دوسرے یہ کہ وہ سب اجنبی تھے۔''

سیلی کی اس بات سے میرے لیے تانیا کی ماں کے کردار کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہاری کیسے مدد کروں؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''اگر اس شخص رسل کورڈ نے تانیا کا پیچھا کرنے یا اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی تو پولیس ہی کچھ کرسکتی ہے۔''

''تم اسے ہلاک کرسکتے ہو۔''

''ہاں.... وہ ابھی رہا ہوا ہے' اس نے لڑکی کے گھر کا رخ بھی نہیں کیا ہے۔ اور میں اسے ہلاک کردوں؟ اگر اس نے پیرول کے قواعد کے مطابق وقت گزارا تو کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے ناگواری سے کہا ''اور تم یکدم ہی اسے میرے ہاتھوں قتل کرانے پر تل گئی ہو!''

"ڈف! کیا ہم اس پر زیادتی کا مقدمہ دائر نہیں کرسکتے؟" سیلی نے مجھے پرامید نظروں سے دیکھا۔
"اتنا وقت گزرنے کے بعد؟" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"یہ چیز رسل کورڈ کو اور بھی زیادہ مشتعل کردے گی۔"
"ویسے میں نے اس کی پیرول افسر وائنا سے بات کی تھی۔" سیلی نے کہا "مگر اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"
کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں ریسٹورنٹ سے چل دیے۔ اپنی کار کے پاس پہنچ کر سیلی نے مجھ سے کہا "ڈف! تم اس کام کی کتنی فیس لوگے؟"
"نہ تو کم فیس لوں گا اور نہ لینے سے انکار کروں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "کیونکہ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا؟ بہرحال پہلے میں اس کیس کو سمجھ لوں کہ آیا میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس کے بعد ہی کچھ بتا سکوں گا۔"



آدھے گھنٹے بعد رسل کورڈ کی پیرول افسر وائنا کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میں نے جب اس کے سامنے رسل کورڈ کا نام لیا تو وہ چونکی اور ہنستے ہوئے بولی "اچھا! تو تمہیں اس عورت نے بھیجا ہے جسے میں نے رسل کورڈ کے پیرول کے بارے میں بتانے سے انکار کردیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب قواعد کے خلاف ہے، مگر میں تمہارے سامنے انکار نہیں کرسکتی۔"
وائنا سے میرے پرانے مراسم تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور حسین عورت تھی، مگر نہ جانے اس نے یہ مشکل اور مجرموں سے تعلق رکھنے والا عہدہ کیوں اپنایا تھا۔
"رسل کورڈ غائب ہے۔" میں نے وائنا سے کہا۔
"ہاں.... مگر کب تک غائب رہے گا؟" وائنا نے کہا۔
"وہ میرے پاس آیا تھا، اس نے میرے سامنے قسمیں کھائی تھیں، وعدے کیے تھے، مگر پھر وہ غائب ہوگیا۔ یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔"
"اس نے اپنا پتا لکھوایا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں، وہ پتا ایک گیس اسٹیشن کا ہے۔ کسی زمانے میں وہ اس کا مالک تھا۔ یہ گیس اسٹیشن پرائیڈ کارنر پر واقع ہے۔" وائنا نے جواب دیا۔ "مگر وہ وہاں نہیں رہتا۔ جن لوگوں نے وہ گیس اسٹیشن خریدا تھا ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے تو رسل کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا ایک اور پتا ہے جہاں تم کوشش کرسکتے ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے اسے گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ پتا اس کی ایک پرانی محبوبہ میوریل کا ہے۔ میوریل کا کہنا ہے کہ اس نے کافی عرصے سے رسل کو نہیں دیکھا، مگر میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔" یہ کہہ کر وائنا خاموش ہوگئی پھر مسکرا کر بولی "مگر ڈف! تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"
"اس کے خلاف گواہی دینے والی لڑکی نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اسے ڈر ہے کہ رسل اس سے بدلہ لینے ضرور آئے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔"
وائنا نے رسل کی فائل میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اس کے دونوں پتوں پر خاص طور سے نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر میں اچھل پڑا کہ اس کیس کی تفتیش سارجنٹ برک نے کی تھی۔ سارجنٹ برک کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کبھی میرے والد کے گہرے دوست اور ساتھی تھے۔
"سارجنٹ برک تو اب تک ریٹائر ہوچکے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں، یہ سارجنٹ کا آخری کیس تھا۔" وائنا نے کہا "میرا خیال ہے انہوں نے رضا کارانہ طور پر اس کیس کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ تم سارجنٹ برک سے مل لو۔ شاید وہ تمہیں اس حوالے سے کوئی اہم بات بتا سکیں۔"
میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ وائنا نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "ڈف اگر تمہیں کہیں رسل کورڈ نظر آجائے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔ میں

تمہارا نام آئے بغیر اسے گرفتار کرا دوں گی۔“



میری جیپ ناہموار راستے پر اچھلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک پرانا سا دو منزلہ مکان تھا جس کی دو کھڑکیاں روشن تھیں۔ مکان کے احاطے کے سامنے میں نے جیپ روک دی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ جیپ کی ہیڈلائٹس میں پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ اب اندھیرے اور سناٹے میں کھڑا تھا۔ اس مکان کے سامنے واقع گیراج میں لائٹیں روشن تھیں۔

پھر میں نے سارجنٹ برک کو دروازے سے باہر آتے دیکھا۔ شاید اس نے میری جیپ کی آواز سن لی تھی۔ اس کے جسم پر پولیس کی پرانی اور شکستہ وردی تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا ”ڈف! تم؟ خیریت تو ہے؟“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کچھ کہے بغیر گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرے میں سگریٹ اور وہسکی کی بو رچی ہوئی تھی۔ فرش پر بچھا ہوا قالین چیتھڑے ہو رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب سارجنٹ برک کا بیٹا کیون اور میری بہن کیٹی اسی جگہ کھیلا کرتے تھے۔ ایسے میں جب برک کی بیوی ہنستی ہوئی کچن میں سے نکلتی اور کہتی ”بچو! میں نے تمہارے لیے شہد کیک تیار کیا ہے“ تو ہم سب خوش ہو جاتے تھے۔ مسز برک ایک گول مٹول اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت دل آویز مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔ میں نے الماری کی طرف نظر ڈالی تو میرا دل ہل کر رہ گیا۔ اس میں مسٹر اور مسز برک کی تین سالہ بیٹی کیرولین کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کے کھلونے بھی اور ننھے منے جوتے بھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے اپنی اس آنجہانی بچی کی ہر چیز سنبھال کر رکھی تھی۔ مجھے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب ہم سب لوگ مسٹر اور مسز برک سے کیرولین کی موت پر اظہار تعزیت کے لیے آئے تھے۔ اس وقت میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مسٹر اور مسز برک سے کیرولین کے بارے میں نہ کچھ پوچھوں اور نہ کوئی سوال کروں کہ وہ کہاں ہے۔

دراصل مسز برک اپنی معصوم بچی کی موت کا ذمے دار خود کو سمجھتی تھی جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا یہ احساس شدید ہوتا گیا۔ وہ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس وقت میرے آنے پر وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔

میں کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ برک نے فریج میں سے ٹھنڈا مشروب نکال کر مجھے دیا۔ میرا دل چاہا کہ مسز برک کے بارے میں پوچھوں مگر پھر خاموش ہو گیا۔

”کہو ڈف! کیسے ہو؟“ سارجنٹ برک نے بھاری آواز میں کہا۔

”رسل کورڈ....“ میری بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ برک کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر احاطے میں بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔

”تمہارا رسل سے کیا تعلق ہے؟ تم اس کو کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟“

”وہ پیرول پر رہا ہوا تھا اور اب غائب ہے۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ شاید تم اس کے بارے میں میری رہنمائی کر سکو۔“ میں نے کہا۔

”وہ.... رہا ہو گیا ہے؟“ برک کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں.... اور غائب بھی ہو گیا ہے۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی ہے!“ میں نے کہا۔

”مگر اس کی ذات میں تمہاری دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟“

”میری کلائنٹ نے مجھ سے کہا ہے کہ اسے تلاش کروں۔“

”میرے پاس آ کر تم نے اپنا وقت ہی خراب کیا

ہے۔" سارجنٹ برک نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔"

چند لمحے میں خاموش رہا۔ وہ بڑی رکھائی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جس پر مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی۔

"کوئی جگہ ہی بتا دو جہاں اس کے ملنے کا امکان ہو....." میں نے کہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔

"میں اب دوبارہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ بڑی مشکل سے تو اس دماغ سوزی کے کام سے جان چھوٹی ہے اور اب تم....." کہتے کہتے وہ رکا اور پھر بولا "رسل کورڈ ایک بدمعاش اور آوارہ گرد تھا۔ وہ قتل کے کیس میں مطلوب تھا جبکہ اس کے وکیل کا دعوا تھا کہ اس نے وہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا بلکہ غیر ارادی طور پر ہو گیا۔ بس یہی معلوم ہے مجھے اس کے بارے میں!"

"مقتولہ کی بیٹی نے اس کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے کیا ہو..... مگر مجھے یاد نہیں۔"

"وہ کہاں مل سکتا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور گیراج کی طرف چل دیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے یکایک مڑ کر کہا "ڈف! تم ہمیشہ کے ڈفر ہو۔ اگر یہ سب باتیں فون پر مجھ سے پوچھ لیتے تو تمہارا وقت برباد نہ ہوتا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں کرے گا چنانچہ میں نے اپنی جیپ کا رخ کیا۔

جس وقت میری جیپ واپس جا رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں برک کے پاس کیوں گیا۔ مجھے وہاں جا کر کیرولین کی یاد آ گئی تھی۔ شاید اسی چیز نے مجھے زیادہ افسردہ کیا تھا اور نہ برک کے رویے کا تو مجھے یہ خوبی اندازہ تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک اداس زندگی گزار رہے تھے۔



رات کو اپنے بستر پر جانے سے پہلے میں نے سیلی کو فون کیا اور کہا "شہر بھر کی پولیس رسل کورڈ کی تلاش میں ہے۔ جیسے ہی وہ ملا اسے جیل بھیج دیا جائے گا۔"

"مگر تم اس کی تلاش جاری رکھو۔ میں تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ دوں گی۔" سیلی نے کہا۔

"یہ بات ہے؟" میں نے کہا۔

"بالکل' یہی بات ہے۔" اس نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ تانیا بے فکر ہو کر سوئے اور اسے یہ احساس رہے کہ اس کی حفاظت کی جا رہی ہے۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر سو گیا۔



دوسرے روز صبح میں نے پرائیڈ کارنز کا رخ کیا۔ وہاں وہ گیس اسٹیشن تھا جو کبھی رسل کورڈ کی ملکیت تھا۔ وائنا نے مجھے اس کا ایڈریس دے دیا تھا۔ پرائیڈ کارنز میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ترچھی چھت والے مکان کے آگے وہ گیس اسٹیشن واقع تھا۔ عمارت کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ اسے رنگ و روغن کے ساتھ مرمت کی بھی ضرورت تھی۔ ایک کونے میں پرانے ٹائروں اور دوسرے کاٹھ کباڑ کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف الگنی بندھی ہوئی تھی جس پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ ایک پک اپ بھی موجود تھی مگر اس کے پہیے غائب تھے۔ وہ بلاکس پر کھڑی تھی۔ پک اپ کے پاس ایک پستہ قد اور نہایت دھان پان سی عورت کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے چیخ کر کہا۔ "کیا پمپ پر کوئی نہیں ہے؟"

"یہاں کوئی نہیں ہے۔" میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

"کیا تمہیں گیس ڈلوانی ہے؟" اس نے پوچھا۔

جواب میں' میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سنجیدگی سے کارڈ کو دیکھنے لگی..... کارڈ پڑھنے کے بعد گھوم کر ایک نظر آفس کی طرف دیکھا پھر مجھ سے بولی "کیا تم رسل کورڈ کے سلسلے میں آئے ہو؟" یہ کہہ کر اس نے خوف زدہ نظروں سے دوبارہ آفس کی طرف دیکھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی "ہاں..... وہ یہاں

آیا تھا۔‘‘

اچانک ایک آدمی کی کرخت آواز سنائی دی ’’بیولا!‘‘ میں نے اور اس نے ایک ساتھ گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

’’وہاں کھڑی گپیں کیوں ہار رہی ہو؟‘‘ اس آدمی نے کہا۔ ’’اس کی گاڑی میں گیس ڈالو اور رقم وصول کرو۔‘‘

بیولا نے مدد طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں گیس ڈلوالوں۔ میں نے اس سے ٹینکی فل کرنے کو کہا تو وہ خوش ہوگئی۔ میں اس شخص کے قریب چلا گیا۔

وہ خاصا سخت گیر قسم کا آدمی تھا۔ اس کے جسم پر کسانوں والا لباس تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے رحمی تھی اور چہرے پر درشتی! وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے اس کی نیلی اور سرد آنکھیں اپنے جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا کارڈ اس کے سامنے لہرایا۔

’’تم... تم رسل کورڈ کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہو؟‘‘ وہ اچانک ہی سرد مہر انسان کے بجائے خوش مزاج انسان میں بدل گیا۔

’’تم ونکول ہو نا؟‘‘ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

’’ہاں، میں ونکول ہوں۔ میں نے یہ جگہ ایک وکیل سے خریدی تھی۔ اس کے اصل مالک سے میں واقف نہیں ہوں۔ یہ بات میں پہلے بھی پولیس کو بتا چکا ہوں۔‘‘

اس نے کہتے کہتے مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اس سے چیخ کر بولا ’’بیولا! ذرا بیٹری کا پانی بھی چیک کر لینا اور ریڈی ایٹر کو بھی دیکھ لینا۔‘‘

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ’’مجھے معلوم ہے کہ رسل کورڈ یہاں آیا تھا۔‘‘

’’ضرور اس عورت نے تم سے کچھ بکواس کر دی ہے۔‘‘ ونکول نے غصے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں ونکول کو نظر انداز کر کے اپنی جیپ کی طرف بڑھا اور سرگوشی میں بیولا سے کہا ’’رسل کورڈ یہاں کیوں آیا تھا؟‘‘ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ ونکول میرے پیچھے آگیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو آفس میں جانے کا حکم دیا تو وہ اڑ گئی۔

’’ونکول! سچ بولنے میں کیا برائی ہے؟‘‘ ونکول نے اس سے بحث کرنے کے بجائے اسے دھکا دیا اور مجھ سے بولا۔

’’جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔‘‘

’’ونکول! میں کہہ رہی ہوں.....‘‘

’’بکواس بند کرو.....‘‘ وہ چلایا اور بے چاری عورت کے زور دار ہاتھ رسید کیا جس سے وہ اچھل کر دور جا گری۔ اب میری بات برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ میں میاں بیوی کے درمیان دخل نہیں دینا چاہتا تھا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے ونکول کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے زور سے دھکیلا تو وہ پشت کے بل زمین پر گر گیا۔

’’اگر تم نے بیولا پر ہاتھ بھی اٹھایا تو میں تمہیں جیل میں سڑوا دوں گا۔‘‘ میں نے غراتے ہوئے کہا ’’اب بتاؤ کہ رسل کورڈ یہاں آیا تھا یا نہیں؟‘‘

’’وہ... وہ.....‘‘ اس کی آنکھوں میں اپنی بے عزتی کا شدید احساس تھا۔

’’میں نے پوچھا ہے کہ کیا رسل کورڈ یہاں آیا تھا؟‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

’’میں بتاتی ہوں۔‘‘ بیولا نے کہا ’’وہ ایک کتاب کی تلاش میں آیا تھا۔ اس نے ائر کمپریسر کے نیچے سے ایک اینٹ اٹھائی تھی جہاں سے اسے وہ کتاب مل گئی تھی اور وہ کتاب لے کر چلا گیا تھا۔‘‘

’’کتاب؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں..... وہ براؤن جلد کی کتاب تھی۔‘‘ بیولا نے کہا۔

’’کتاب لے کر وہ اپنی سبز میاٹا کار میں بیٹھا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔‘‘

’’تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ رسل کورڈ ہی

تھا؟" میں نے سوال کیا۔
"ہم نے اس کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ وہ خاصا لحیم شحیم تھا۔ سبز میاٹا میں وہ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس کے وجود کے حساب سے کار چھوٹی تھی۔" بیولا نے جواب دیا۔
"یہ بات تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟" میں نے سوال کیا تو نکول پھنکارنے لگا۔
"یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ پولیس کو ہر بات کی اطلاع دیں۔ تم گیس کی قیمت ادا کرو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔" وہ ایک بار زمین پر گرنے کے بعد بھی خواہ مخواہ کی اکڑ دکھا رہا تھا۔
"تمہارا شوہر پاگل تو نہیں ہے؟" میں نے بیولا سے کہا "میں اس کا لحاظ کر رہا ہوں اور یہ....."
"یہ بات نہیں ہے۔" بیولا نے جلدی سے کہا "دراصل یہ پولیس سے بھی خوف زدہ ہے اور رسل سے بھی۔"
میں نے گیس کی ادائیگی کرنے کے بعد بیولا سے کہا "اگر آئندہ کبھی یہ تم پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرے تو تم مجھے فون کر دینا۔"
"ارے، ایسا آئندہ کبھی نہیں ہوگا۔" بیولا نے بے پروائی سے کہا اور مسکرا کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔



میری نظریں اس تین منزلہ عمارت پر جمی ہوئی تھیں جس کے مین گیٹ پر اطلاعی گھنٹی کے کئی بٹن لگے ہوئے تھے مگر ان کے تار نکلے ہوئے تھے۔ میں عمارت کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کون سی منزل پر کس فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا ہے۔ میں نے اپنی منزل پر پہنچ کر مطلوبہ فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک عورت کی آواز آئی۔
"کون ہے؟"
"مجھے رسل کورڈ سے ملنا ہے۔" میں نے کہا تو اندر سناٹا چھا گیا۔ طویل خاموشی کے بعد دروازہ کھلا اور جھری میں ایک عورت کی صورت نظر آئی۔
"وہ یہاں نہیں رہتا۔" عورت نے کہا۔
"تمہارا نام میوریل ہے؟" میں نے سوال کیا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔
"رسل کورڈ نے پولیس کو یہی پتا لکھوایا تھا۔"
"وہ برسوں پرانی بات ہے مگر اب رسل یہاں نہیں رہتا۔" میوریل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"اس کا کوئی اتا پتا بتا سکتی ہو؟"
"میں نے اس پولیس افسر کو بتایا تھا کہ....."
ابھی وہ بات پوری نہیں کر سکی تھی کہ نیچے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہی رسل کورڈ ہے مگر اس کا حلیہ رسل سے مختلف تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر میوریل سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ میوریل نے جھٹ سے دروازہ کھولا تو وہ اندر گھستا چلا گیا۔
"مجھے نہیں پتا کہ یہ کون ہے۔" میوریل نے آنے والے سے میرے بارے میں کہا "یہ بھی اس پولیس افسر کی طرح رسل کورڈ کا معلوم کرنے آیا ہے۔"
"تمہاری کار نیچے نہیں ہے۔ کہاں ہے وہ؟" اس شخص نے پوچھا۔
"رسل کورڈ لے گیا ہے۔ وہ سیدھا میرے فلیٹ میں آیا، مجھ سے زبردستی گاڑی کی چابیاں لیں اور چلا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے تو مجھ پر نظر تک نہیں ڈالی تھی۔ میری بات پر یقین کرو ڈیل!" میوریل نے سمجھانے والے انداز میں ڈیل سے کہا۔
"وہ اندر کیسے آیا؟ تمہارے ڈریسر تک کیسے پہنچا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارے بیڈ روم میں بھی گیا تھا۔" ڈیل نے ناگواری سے کہا۔
"ایسا نہیں ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ اب میرا اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"
"کب آیا تھا وہ؟"
"پرسوں آیا تھا۔ وہ یہاں بالکل نہیں ٹھہرا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔ ویسے بھی اسے مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی،

صرف کار سے غرض تھی۔" میوریل بولی۔
"وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟" ڈیل نے پوچھا۔
"مجھے کیا معلوم.... ممکن ہے وہ اسی کاٹیج پر گیا ہو جس کے بارے میں سبھی پولیس افسران پوچھ رہے تھے۔"
"رسل نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں.... پولیس افسران کا کہنا تھا کہ وہ اس جگہ کسی سے ملنے جاسکتا ہے۔" میوریل نے کہا۔
ڈیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تمہارا تعلق بھی پولیس سے ہے؟"
"نہیں، میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔" میں نے کہا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔
"یہ خیال تمہیں کیسے آیا کہ رسل کورڈ یہاں ہوسکتا ہے؟" ڈیل نے پوچھا۔
"پولیس کا ریکارڈ بتا رہا ہے کہ چار سال پہلے رسل اسی جگہ رہتا تھا۔"
"یہ محض بکواس ہے۔" ڈیل نے کہا پھر وہ میوریل سے مخاطب ہوا "وہ پولیس افسران یہاں کیوں آئے تھے؟ انہیں یہ خیال کیوں آیا تھا کہ رسل تمہارے فلیٹ پر مل سکتا ہے؟" پھر وہ خود ہی بڑبڑایا "تم سب ایک طرح سوچتے ہو.... کیا وہ نامعقول انسان، سارجنٹ برک آیا تھا یہاں؟"
سارجنٹ برک کا ذکر آتے ہی میں اچھل پڑا۔
"برک کل آیا تھا۔" میوریل نے مجھے اور ڈیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یکایک ڈیل اندر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر برہمی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ میوریل نے بتایا کہ وہ رسل کا بیگ تھا۔ اس نے میرے سامنے بیگ کھولا اور اس کی اشیا نکال نکال کر باہر فرش پر ڈالنے لگا۔ اس بیگ میں پتلونیں قمیص اور موزے وغیرہ تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید براؤن جلد والی کتاب بھی اس میں سے نکل آئے مگر وہ نہیں نکلی۔
"رسل یہاں براؤن جلد والی کوئی کتاب تو نہیں لایا تھا؟" میں نے میوریل سے پوچھا۔
"نہیں، میں نے صرف یہ بیگ ہی دیکھا تھا۔" میوریل، ڈیل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ڈیل نے سارا سامان واپس بیگ میں بھرا اور اس بیگ کو فلیٹ سے باہر لے جاکر سیڑھیوں کے نیچے والے حصے میں ڈال دیا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ اس دوران میں نے میوریل کی آواز سنی۔ وہ ڈیل سے کہہ رہی تھی "اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ رسل زبردستی اندر گھس آیا تھا۔ بہرحال میں نے اسے اندر ٹھہرنے نہیں دیا۔ تمہیں میری بات کا یقین کرنا ہوگا۔ اتنی بے اعتباری کا مظاہرہ نہیں کرو ڈیل!"



اسی رات میں سیدھا سیلی کے گھر پہنچا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں آرہا ہوں۔ رات ساڑھے آٹھ بجے جب میں چوتھی منزل پر واقع سیلی کے فلیٹ میں پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے بڑی خوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اندر لے گئی۔ جہاں بڑے کمرے میں سیاہ بالوں والی بیس بائیس سال کی لڑکی کوئی پزل کھیل رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر اس پزل کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔
"تانیا! یہ ہیں مسٹر ڈف!" سیلی نے میرا تعارف کرایا تو اس لڑکی تانیا نے میری طرف نظر اٹھائی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ وہ چہرہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔
"میرا خیال ہے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" میں نے تانیا کو مخاطب کیا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔
"ڈف! تم نے کھانا نہیں کھایا۔ ہے نا؟" سیلی نے کہا۔
"نہیں۔ میں نے ابھی کھایا ہے۔ تمہارا شکریہ!" میں نے کہا "ہاں کافی ضرور چلے گی۔"
"میں ابھی آئی۔ تم بیٹھو!" سیلی نے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔
میں نے تانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہ جانے

کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

"ممکن ہے تم نے مجھے میکڈونلڈ میں دیکھا ہو۔" تانیا نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "میں ویٹرس تھی وہاں۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بات نہیں ہے، میں واقعی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں.... مگر کہاں؟ یاد نہیں آرہا تھا۔

تانیا مجھ پر توجہ دیے بغیر پزل سے کھیلتی رہی۔ وہ ایسا ظاہر کررہی تھی جیسے میری موجودگی سے ہی بے خبر ہو۔ وہ کوئی شرمیلی لڑکی نہیں تھی البتہ اپنے کام سے کام رکھنے والی تھی۔ بلاضرورت کسی سے بات کرنا شاید اس کی عادت نہیں تھی۔

"تمہیں ویٹرس کا کام پسند تھا؟" میں نے پوچھا تو وہ تنک کر بولی۔

"کوئی بے وقوف ہی ایسا کام پسند کر سکتا ہے۔"

"اگلے تعلیمی سال سے یہ کالج جائے گی۔" سیلی نے آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں میں کافی کی ٹرے تھی۔

"یہ کمپیوٹر کے کام میں خاصی ماہر ہے۔"

کافی پینے کے دوران جب سیلی نے مجھ سے رسل کورڈ کے بارے میں پوچھا تو تانیا ایک دم پریشان ہو گئی۔

"تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ رسل کورڈ جیل سے رہا ہو رہا ہے؟" میں نے سوال کیا تو تانیا نے جواب دیا۔

"ایک پولیس افسر نے بتایا تھا۔"

"سارجنٹ برک نے بتایا تھا۔" سیلی نے وضاحت کی۔

"اس سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی؟" میں نے تانیا سے سوال کیا تو وہ بولی۔

"وہ میکڈونلڈ میں کبھی کبھار آتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ رسل رہا ہونے والا ہے، میں محتاط رہوں۔ اگر وہ فون پر بھی بات کرنے کی کوشش کرے تو منع کر دوں۔"

"رسل نے تم سے رابطے کی کوشش کی تھی؟" میں نے تانیا سے پوچھا۔

"نہیں، میرا خیال ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ میں کہاں رہ رہی ہوں۔"

"مگر تمہیں اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا پتا معلوم کر سکتا ہے؟"

اچانک خوف کی لہر تانیا کے چہرے پر آگئی اور اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"تانیا! تم کسی کاٹیج کے بارے میں جانتی ہو؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ...."

"مجھے اس کاٹیج کا خیال نہیں آیا۔" تانیا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مسٹرڈیونڈ پونڈ پر میری ماں کی کاٹیج ہے۔ وہ اکثر وہاں جاتا تھا۔ کیا وہ اب وہیں ہے؟"

"میرا اندازہ ہے.... یقین نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر تانیا اور سیلی سے گپ شپ کرنے کے بعد میں واپس چل دیا۔



دوسرے روز صبح میں نے دو ایک ضروری کام نمٹائے۔ پھر وہاں سے مسٹرڈیونڈ روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں، میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں تک جانے والا راستہ بہت تنگ اور گندہ تھا۔ یہ راستہ پہاڑی سے نیچے تک آنے والے جنگل کے درمیان سے گزرتا تھا اور مسٹرڈیونڈ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔

تالاب سے لگ بھگ سو فٹ دور ایک چھوٹی سی سنگل اسٹوری کاٹیج بنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک سبز میاٹا تھی اور دوسری ٹویوٹا۔ اس کے قریب میز کرسیاں بھی تھیں جن کے پائے زمین پر دھنسے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہراتے ہوئے پتے، درخت اور شاخیں تھیں۔ سامنے تالاب کا ساکت پانی تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور کاٹیج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک فائر کی آواز سنائی دی جس کو

سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے اپنی جیب سے اپنا پستول نکالا اور بھاگتا ہوا آواز کی سمت بڑھا۔ درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک صاف سی جگہ نظر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا کہ سبز پتوں کے درمیان مجھے سارجنٹ برک کا غصے سے بھرا چہرہ نظر آیا۔ پھر میں نے برک کی آواز سنی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا ”میں تجھے مار کر تالاب میں پھینک دوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

میں نے برک کے مخاطب کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں دائیں طرف بڑھا اور درختوں کی شاخوں کو بے آواز طریقے سے ہٹایا تو سیاہ بالوں والے ایک شخص کی صورت نظر آئی جس کے جسم پر گرے پتلون تھی۔ وہ شاید رسل کورڈ تھا۔

”مجھے شوٹ کر کے تم بھی بچ نہیں سکو گے۔“ برک کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے میرے قدم لڑکھڑائے تو وہ شاخ بھی ٹوٹ گئی جسے میں نے پکڑ رکھا تھا۔ برک کے مخاطب نے میری طرف دیکھا۔ وہ واقعی رسل کورڈ تھا۔

وہ برک سے کہہ رہا تھا ”تو کیا تم اس کو بھی شوٹ کر دو گے؟“ یہ کہتے ہوئے رسل مڑا اور بھاگنے لگا۔

برک بھی اول فول بکتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور رسل پر دو فائر جھونک مارے مگر رسل بچ کر نکل گیا۔ میں آگے بڑھ کر برک کے پاس پہنچا۔ وہ ایک درخت کے تنے کو پکڑے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر اشتعال تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ہم دونوں کے دیکھتے ہی دیکھتے رسل کورڈ سبز میاٹا میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ برک نے گھور کر میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ میری وجہ سے رسل اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تھا۔

”میں نے کچھ پتوں پر خون دیکھا ہے۔“ میں نے برک کو مخاطب کیا ”تم نے دیکھا تھا؟“

”تم اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے؟“ برک نے میری طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ زخمی ہے اس کے جسم میں گولی لگی ہے۔ اگر اسے ہنگامی طور پر کسی اسپتال لے جایا جاتا ہے تو کچھ بھی راز نہیں رہے گا لہٰذا تم مجھے خود ہی بتا دو کہ مسئلہ کیا ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے برک سے کہا۔

برک نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی گاڑی میں سوار ہوا اس کا انجن اسٹارٹ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔



میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہوا شہر روانہ ہو گیا۔ میرا رخ میوریل کے گھر کی طرف تھا۔ جب میں نے اس کے اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے سبز میاٹا اور ٹویوٹا کھڑی دیکھیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میرے سارے اندازے درست نکل رہے تھے۔ مجھے اس عمارت کے اندر سے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور آگے بڑھا ہی تھا کہ اوپر سے سیڑھیوں کی ریلنگ کا ایک حصہ ٹوٹ کر نیچے آن گرا۔

میں بوکھلا کر پیچھے ہٹا اور اوپر نظر اٹھائی تو ایک آدمی ریلنگ کے سرے پر نظر آیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم لہراتا ہوا نیچے آیا اور پوری قوت سے فرش سے ٹکرایا۔ ذرا سی دیر میں اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کی گردن عجیب سے زاویے پر مڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف کے عالم میں پھیل گئی تھیں جو اس کی موت کے بعد بھی بند نہیں ہوئیں۔ میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ تین چہرے نیچے جھانک رہے تھے۔ پھر میں نے میوریل کی چیخ سنی۔

”اوہ! میرے خدا!“ اس نے کہا اور زور زور سے رونے لگی۔ مرنے والا کوئی اور نہیں رسل کورڈ ہی تھا۔ وہ جنگل سے تو زندہ بچ کر نکل آیا تھا مگر یہاں اس کی موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

میڈیکل ایگزامنر نے رسل کورڈ کی لاش اور گردن کا معائنہ کرنے کے بعد کہا ”ممکن ہے یہ سب حادثاتی

طور پر ہو گیا ہو مگر اس کے کندھے میں گولی کا سوراخ بھی موجود ہے جو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ اس کے بارے میں فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔" اس نے افسوس سے سرہلایا۔

وہاں پولیس سراغ رساں کومب بھی موجود تھا۔ وہ برک کو جانتا تھا اور اس کے ساتھ کام بھی کر چکا تھا۔ اس نے مجھے، برک، میوریل اور ڈیل کو اندر چلنے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھ اس کا معاون وینس بھی تھا۔

"اب مجھے بتاؤ کہ آخر یہ جھگڑا کس بات پر تھا؟" کومب نے کہا تو میوریل اندر گئی اور ڈیل کی تیز نظروں کی پروانہ کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب لے آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کتاب کو کومب کے حوالے کرتی، برک نے وہ کتاب میوریل کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

"یہ میری کتاب ہے۔" برک نے غصے سے کہا۔

"یہ کتاب میرے حوالے کردو، یہ ایک اہم ثبوت ہے۔" کومب نے برک سے نرمی سے کہا۔

"یہ میری کتاب ہے، جو رسل کورڈ نے چوری کرلی تھی۔" برک نے مشتعل لہجے میں کہا۔ اس موقع پر ڈیل نے اچانک ہی وہ کتاب برک سے چھین لی اور کومب کی طرف بڑھادی۔ برک آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے چیخنا شروع کردیا "یہ کتاب میری ہے، اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" یہ کہتا ہوا وہ کومب کی طرف بڑھا تو ڈیل نے اسے روک دیا۔ برک خونی نظروں سے ڈیل کی طرف دیکھنے لگا۔ کومب نے وہ کتاب اپنے معاون وینس کی طرف بڑھادی۔

"اسے حفاظت سے رکھ لو۔"

"یہ میری ہے۔" برک نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا۔

میں کافی دیر تک میوریل کے اپارٹمنٹ میں رہا۔ سب لوگوں نے رسل کورڈ کے اوپر سے گرنے کی وجہ تفصیل سے بیان کی۔ ہر ایک نے اس کا سبب کتاب کو قرار دیا۔

"آخر اس کتاب میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" ان سب کی باتیں سننے کے بعد کومب نے کہا تو برک کے سوا سبھی نے انکار میں سرہلا دیا کہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے البتہ برک یہی کہتا رہا کہ یہ کتاب اس کی ہے اور رسل اسے چرا کر لے گیا تھا۔

ان سب باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ رسل اور برک ایک ساتھ میوریل کے اپارٹمنٹ پر پہنچے تھے۔ دونوں دروازے کے باہر بھی لڑ رہے تھے کہ ڈیل نے انہیں دیکھ لیا۔ جب انہوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو ڈیل ان کی راہ میں مزاحم ہو گیا۔ برک، میوریل سے وہ کتاب لینے آیا تھا۔ رسل کورڈ بھی اس کے پیچھے تھا مگر اس موقع پر میوریل نے صاف انکار کردیا کہ اس کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی ڈیل کا پارا چڑھ گیا۔

"تم نے تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ رسل کورڈ کوئی کتاب بھی چھوڑ گیا ہے! تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟"

"ہاں.... میں ڈر گئی تھی....." میوریل نے کہا اور اس کتاب میں کچھ بھی تو نہیں ہے، صرف کچھ اعداد لکھے ہوئے ہیں۔"

"تم دونوں آپس میں لڑنے لگے۔ یہ بتاؤ کہ حادثہ کیسے پیش آیا؟" کومب نے سوال کیا۔

"بس یہ دونوں لڑ رہے تھے۔" میوریل نے کہا "ڈیل انہیں اندر نہیں آنے دے رہا تھا۔ لڑتے لڑتے یہ ریلنگ تک پہنچ گئے اور ان کے وزن سے ریلنگ ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے رسل کورڈ نیچے جاگرا۔"

"تو گویا یہ ایک حادثہ تھا؟" کومب نے کہا۔

"ہاں، یہ سو فیصد حادثہ تھا۔" برک نے کہا۔

"میں نے ان دونوں کو صرف اندر داخل ہونے سے روکا تھا۔" ڈیل نے کہا۔

"ڈف! تم نے کیا دیکھا؟" کومب نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں نے رسل کو اوپر سے نیچے گرتے دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟" کومب نے پوچھا۔

"میں بھی کتاب کے چکر میں آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کتاب میں کیا ہے۔ ہے نا؟" کومب نے خشک لہجے میں کہا۔

میں نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ رسل کورڈ کو پہلے گولی ماری گئی تھی مگر اس سے وہ صرف زخمی ہوا تھا اس کی موت اوپر سے گرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

میری بات سے مطمئن ہونے کے بعد کومب نے برک کو اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت کی اور باقی لوگوں سے کہا کہ وہ صبح پولیس اسٹیشن آکر اپنے بیان لکھوادیں۔



میں نے سیلی کو فون کیا تو وہ گھر پر نہیں تھی۔ تانیا نے فون ریسیور کیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس کی آواز میں خوف نمایاں ہوگیا۔

"تانیا! اب رسل کورڈ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مرچکا ہے۔" میں نے کہا اور اس کے شکریے کے الفاظ کا انتظار کرنے لگا مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ وہ یہ خبر سن چکی ہے۔ برک نے اسے فون پر سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ برک اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ یہ بات قابل غور تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے.... وہ کیا تھا؟ مجھے اس کی تلاش تھی۔



میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کتاب کے بارے میں سب کچھ جان کر رہوں گا۔ اس کتاب میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ برک اس کے لیے باربار جذباتی ہورہا تھا۔ اسی کتاب کی وجہ سے رسل کورڈ کی جان بھی گئی تھی۔ میں پولیس اسٹیشن پہنچا اور اپنے دوست سارجنٹ مائیک سے علیحدگی میں آدھے گھنٹے تک گفتگو کی مگر اس نے نہ تو کتاب مجھے دکھائی اور نہ اس کے بارے میں کچھ بتایا۔

"اچھا چلو صرف یہ بتادو کہ تم نے وہ کتاب کھول کر دیکھی تھی؟" میں نے کہا تو مائیک نرم پڑ گیا۔

"ہاں' دیکھی تھی۔ وہ ایک طرح کا لیجر ہے۔ اس میں صرف ایک وکیل کا نام لکھا ہے' باقی پوری کتاب میں تاریخیں درج ہیں جن کے سامنے رقمیں لکھی ہوئی ہیں۔ مجھے تو یہ کتاب ادائیگیوں کا ایک ریکارڈ لگتی ہے۔" مائیک کی بات سن کر میں بھی الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ ایسی کتاب کے لیے اتنا لڑائی جھگڑا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"ہینڈ رائٹنگ کے بارے میں کوئی اندازہ؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اس کا تعین نہیں ہوا ہے۔" مائیک نے کہا۔

"تاریخیں کون سی ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہر ماہ کی پہلے ہفتے کی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میرا اندازہ ہے کہ یہ سب تاریخیں پچیس سال پرانی ہوں گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو سارجنٹ مائیک حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔



سارجنٹ برک اپنے گھر کے گیراج میں کوئی کام کررہا تھا۔ میری جیپ کی آواز سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

"اب کیوں آئے ہو؟" اس نے ناگوری سے سوال کیا۔

"مجھے پولیس اسٹیشن میں اپنا بیان ریکارڈ کرنا ہے۔" میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ہر طرح سے باخبر ہو جاؤں۔"

"مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"تم نے میرے سامنے رسل کورڈ پر فائر کیا تھا۔ اگر اس حوالے سے کسی نے کوئی سوال کیا تو....؟"

"کیا میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"تم اتنے ناسمجھ نہیں ہو.... اس فائر نے رسل کو معمولی زخمی کیا تھا۔" میں نے کہا "صرف اتنا بتادو کہ تمہیں اس کتاب کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ یاد رکھنا کہ میں تانیا کے لیے کام کررہا ہوں۔"

قابلِ غور

- بہت سے نقصانات اس لیے بھی ہوتے ہیں کہ ہم دوسروں سے مشورہ لینا گوارا نہیں کرتے۔
- زیادہ مشاغل ہوں تو آدمی بیمار رہتا ہے۔ کبھی خالی بیٹھ کر اپنے ساتھ وقت گزارا کرو۔ کافی دھند چھٹ جاتی ہے اور دور تک نظر آنے لگتا ہے۔ پھر فیصلے اپنے ہی ہوتے ہیں اور آسان بھی۔

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس کا جسم لرز رہا ہے۔

"تانیا کی شکل تمہاری بیٹی کیرولین سے کتنی ملتی ہے۔" میں نے کہا "وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی ناک اور وہی بال... میں جانتا ہوں کہ تم کسی دوسری عورت کے پاس بھی جاتے تھے اور اسی نے تانیا کو جنم دیا تھا۔ اگر یہ بات تمہاری بیوی کو معلوم ہوجائے تو....."

برک نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا "تو تمہیں سب کچھ پتا چل گیا ہے؟ ہاں.... وہ میری بیٹی ہے مگر میں نے یہ بات اپنی بیوی سے چھپائی ہے۔ اگر اسے اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ یا تو مر جائے گی یا پاگل ہوجائے گی۔"

"رسل مرچکا ہے۔ اس کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس پر تمہیں پریشانی ہو۔" میں نے کہا "تم نے رسل پر فائر کیا تھا، اس کا گواہ صرف میں ہوں اور میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ تم نے رسل کو ہلاک نہیں کیا، وہ سیڑھیوں سے خود ہی گر کر مرا ہے۔"

"اس کتاب میں کیا ہے؟" اس نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

"ایک وکیل کا نام اور چند تاریخوں کے ساتھ رقوم کا اندراج! یہ ادائیگیاں بیس سال پہلے کی گئی تھیں۔" میں نے کہا "وہ درحقیقت کوئی کتاب نہیں.... بلکہ ایک ڈائری ہے۔"

"تو اس کی خاطر اتنا ہنگامہ کیوں ہوا؟" برک کی آنکھوں میں معصومیت تھی۔ حالانکہ وہ خود اس ہنگامے کا ایک حصہ تھا۔

"رسل نے اپنے مقدمے سے پہلے وہ ڈائری گیس اسٹیشن میں چھپائی تھی۔ رہا ہوتے ہی وہ سیدھا وہاں گیا اور ڈائری نکال کر اس نے تم سے رابطہ کیا۔ وہ یہ ڈائری دکھا کر تمہیں خواہ مخواہ پریشان کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے تمہارے ماضی پر روشنی پڑے یا تمہارے لیے کوئی خطرہ کھڑا ہو۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد برک نے مجھ سے اس ڈائری کے اور رسل کورڈ کے حوالے سے کئی سوال کیے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیے۔

"تم فکر مت کرو۔" میں نے برک سے کہا "میں اپنے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا جس سے پولیس کا رخ تانیا کی طرف مڑ سکے۔"

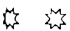
یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔

"اب تانیا اس دنیا میں اکیلی ہے۔ اس کی ماں مرچکی ہے۔ باپ کا اسے پہلے ہی پتا نہیں تھا، اوپر سے ماں سے بھی محروم ہوگئی۔ اسے ایک شفیق باپ کی ضرورت ہے۔ وہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس حقیقت کو جان لے.... کہ وہ بھی ایک باپ رکھتی ہے.... وہ لاوارث نہیں ہے۔" میں نے برک سے کہا "میری بات پر غور کرنا۔" یہ کہہ کر میں واپس چلا آیا۔



کئی ماہ بعد میں سیلی کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ تانیا کا یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا ہے اور سارجنٹ برک نے اس کے تعلیمی اخراجات ادا کرنے کی ذمے داری قبول کی ہے۔ سیلی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برک اکثر تانیا سے ملنے آتا ہے اور دونوں میں باپ بیٹی کی سی اپنائیت نظر آتی ہے۔

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ میری بھاگ دوڑ اکارت نہیں گئی تھی۔



غلام

سیرینا راض

جرم سنگین ہو یا معمولی نوعیت کا، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ یا بات پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس معمولی آدمی نے بھی اپنی زندگی بدلنے کے لیے ایک منصوبہ تشکیل دیا تھا اور نہایت کامیابی سے اپنے مقرر کردہ منزلوں کی جانب گامزن تھا۔

قتل کی ایک واردات کا قصہ، جس کے پس منظر میں کئی راز تھے



”میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ مارلن نے اپنے شوہر ڈان سے کہا مگر ڈان نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ مدھم سروں میں اپنے ہونٹوں سے سیٹی بجاتا ہوا آئینے میں دیکھ کر اپنی ٹائی درست کرتا رہا۔ وہ بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی یہی خوشی مارلن سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”ڈارلنگ!“ ڈان نے مسکراتے ہوئے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور مارلن سے مخاطب ہوا۔ ”تم اس قسم کی عورت نہیں ہو۔ ایسی عورتیں اور ہی ہوا کرتی ہیں۔“

بظاہر تو ڈان نے یہ بات بڑے پرسکون انداز میں کہی تھی مگر اندر سے وہ بل کر رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس دیوانی عورت کا کیا بھروسا؟ نہ جانے کب اپنی دھمکی پر عمل کر ڈالے۔

”میں مذاق نہیں کر رہی۔“ مارلن نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں.... واقعی.... تم بہت اچھی اداکاری کر لیتی ہو۔“ ڈان نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔“ یہ کہہ کر ڈان نے اپنی چاکلیٹی کلر کی جیکٹ پہنی اور کنگھا لے کر اپنے بال سنوارنے لگا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون لگ رہا تھا جبکہ بستر پر لیٹی ہوئی مارلن اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ڈان! خدا کے لیے اس وقت مت جاؤ۔“ یکایک مارلن کے لہجے میں دنیا بھر کا درد سمٹ آیا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو....“ ڈان نے درست لہجے میں کہا ”مجھے گھر پر روکنے کے لیے تم یہ ڈراما کر رہی ہو۔“

”یہ بات نہیں ہے ڈان....!“

”بکواس!“ ڈان نے مارلن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اس پارٹی میں کیٹی نے تمہیں بھی بلایا ہے مگر تم نہ خود جانا چاہتی ہو اور نہ مجھے جانے دے رہی ہو۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری ناز برداریاں کرتا رہوں اور آج کی یہ حسین شام برباد کر دوں۔ ہمیں کہیں دور تو نہیں جانا۔ اسی بلڈنگ کی چوتھی منزل پر کیٹی کا اپارٹمنٹ ہے۔ تمہیں وہاں جاتے ہوئے کیا مشکل پیش آرہی ہے؟“

ڈان کی بات سن کر مارلن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ بات بے بات رونے لگتی تھی، ہر وقت ڈان سے لڑتی رہتی تھی، اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی حالانکہ وہ بہت حسین عورت تھی مگر ہر وقت کے رونے دھونے نے اس کے حسن کو ماند کر دیا تھا، اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ڈان اس کے سوا کسی دوسری عورت کی طرف نہ دیکھے، نہ کسی سے بولے نہ بات کرے۔

وہ اپنی اس خواہش میں حق بجانب بھی تھی، ہر بیوی یہی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کا وفادار بن کر رہے مگر ڈان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دل پھینک اور رنگین مزاج تھا۔ عورتیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شادی شدہ ہے، اس کے گرد تتلیوں کی طرح منڈلاتی تھیں اور اس کی توجہ حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ مارلن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کی فطرت سے بھی واقف تھی اس لیے وہ پارٹیوں میں جانے سے کتراتی تھی۔

جب عورتیں اس کے شوہر کے گرد گھیرا ڈال لیتیں تو مارلن الگ تھلگ ہو کر رہ جاتی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پیتی رہتی اور ڈان کو دوسری عورتوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے دیکھتی رہتی۔ ہر بار پارٹی سے آنے کے بعد مارلن کی ڈان کے ساتھ لڑائی ہوتی تھی مگر ڈان اس کی ایک نہیں سنتا تھا۔ نہ وہ پارٹیوں میں جانا ترک کرنے کو تیار تھا اور نہ عورتوں کو نظر انداز کرنے پر آمادہ تھا۔ لہٰذا مارلن نے طے کیا تھا کہ آئندہ وہ ڈان کے ساتھ کسی پارٹی میں نہیں جائے گی بلکہ اسے بھی نہیں جانے دے گی۔ اس لیے اس نے آج اپنی بیماری کا ڈراما

گیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بیمار نہیں تھی۔۔۔ ڈان اس کے کھیل کو سمجھ گیا تھا اور تنہا کیٹی کی پارٹی میں جا رہا تھا۔ یہ بات مارلن کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

"ڈان! میں تمہیں گدھوں اور چیلوں کی اس پارٹی میں نہیں جانے دوں گی۔ وہ سب عورتیں تمہیں مجھ سے چھین لیں گی۔" مارلن نے روتے ہوئے کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" ڈان نے استہزائیہ لہجے میں کہا "یہ خادم تمہاری جائیداد ہے۔۔۔ صرف تمہارا شوہر ہے۔۔۔ تم اس کی قانونی اور جائز مالک ہو۔ کسی کی مجال ہے کہ تم سے تمہاری ملکیت کو چھین سکے؟" یہ کہہ کر ڈان نے اپنے جوتے کے تسمے باندھے' ایک بار پھر آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ پھر اس نے مارلن سے کہا "دیکھو ڈارلنگ! عورتیں میری طرف راغب ضرور ہوتی ہیں مگر وہ مجھے کھا نہیں جائیں گی اور نہ تمہارا شوہر اتنا کمزور ہے کہ وہ کسی کے دام میں آجائے۔ جس دن ایسا ہوا' وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

"خیر۔۔۔ تمہیں ایک نہ ایک دن مرنا تو ہے۔" مارلن نے ڈان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ ہر انسان کو ہی ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" ڈان نے اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"کسی دن تم میرے ہاتھوں مروگے۔ یہ لکھ لو!" مارلن کی آواز میں دیوانگی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی جس نے ایک لمحے کو ڈان کو بھی اندر سے ہلا دیا تھا۔

وہ سوجی ہوئی سرخ آنکھوں سے ڈان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ وہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے الفاظ بہرحال کسی ڈرامے کا حصہ نہیں تھے بلکہ یہ اس کے اندر کی آواز تھی' اس کا احساس تھا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو مارلن!" ڈان نے جھرجھری لیتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"میں نے آج ہی تمہارا پستول الماری سے نکال لیا ہے جس کا تمہیں پتا بھی نہیں ہے۔" مارلن نے لرزتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں وحشت تھی۔

یہ سنتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس نے ایک پستول خریدا تھا مگر وہ لائسنس والا نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ دیکھنے میں کھلونا پستول لگتا تھا۔

"اس کے ساتھ گولیاں بھی ہیں۔" مارلن نے کہا "میں نے انہیں پستول میں ڈال لیا ہے۔ پستول ہاتھ میں لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اسے چلانا تو بہت ہی آسان ہے۔"

"تو پھر۔۔۔؟" ڈان نے تلخی سے کہا۔

"تو پھر میں تمہیں کسی بھی وقت آسانی سے قتل کرسکتی ہوں۔" مارلن نے کہا "میرے پاس تمہیں روکنے کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر ڈان زور سے ہنسا اور بولا "ہاں۔۔۔ واقعی۔۔۔ دنیا میں ایسی جذباتی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو قتل جیسی حرکت کرسکتی ہیں۔ میں ایسی عورتوں سے مل چکا ہوں مگر تم میں وہ ہمت نہیں ہے کہ کسی کو قتل کرسکو۔ تم تو صرف ایک مغرور' بدماغ' سرپھری اور ہٹ دھرم عورت ہو جسے اپنے فائدے یا نقصان میں تمیز کرنا بھی نہیں آتا۔۔۔ مگر یہ طے ہے کہ تم اندر سے بالکل نرم ہو۔۔۔ جیلی کی طرح۔۔۔ یہ بھی تمہارا ڈراما ہے جس سے میں بالکل متاثر نہیں ہوا۔"

یہ کہہ کر ڈان نے مارلن کی پیشانی چومی اور آگے بڑھ گیا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا "جب تک اس منحوس عورت کی پیشانی نہ چوموں' یہ جان ہی نہیں چھوڑتی۔ جونک بن گئی ہے میرے لیے!

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب وہ مارلن کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا تھا مگر اب اس کی قربت کسی طرح بھی ڈان کو متاثر نہیں کرتی تھی۔ جاتے جاتے وہ رکا اور مارلن کی طرف گھوم کر بولا "میں اوپر کیٹی کے فلیٹ پر جا رہا ہوں جہاں زندہ لوگ ہیں۔ اگر چاہو تو اوپر آجانا اور اگر دل نہ چاہے تو یہیں میرا انتظار کرنا۔ میں نصف شب تک لوٹوں گا۔"

یہ کہہ کر ڈان باہر آگیا۔ اسے دیر ہوگئی تھی اس

لیے اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کردیے۔ پہلے وہ لفٹ کی طرف بڑھا' پھر اس نے ارادہ ملتوی کیا اور سیڑھیوں کا رخ کیا۔ چوتھی منزل پر ہی تو جانا تھا۔ پیدل چلنے سے تھوڑی بہت ورزش ہو جاتی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جب کیٹی کے فلیٹ کا دروازہ کھلا تو اسے تھوڑی بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اندر سے نہ لوگوں کے شور کی آواز آ رہی تھی اور نہ میوزک کی.... مگر اس کے تمام دوست وہاں موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی دو چار دوستوں نے اسے آوازیں دیں۔ ''ڈان!'' چند لمحوں میں وہ ان کے نرغے میں تھا۔ ان میں ہمیشہ کی طرح خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔

پارٹی کی میزبان کیٹی لپکتی ہوئی آئی اور اس نے ڈان کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اسے اس انداز سے گھسیٹنے لگی جیسے اس نے پارٹی کے لیے کوئی کھلونا خریدا ہو اور وہ اس کی نمائش کرنے لگی ہو۔ وہ خاصی پرجوش لگ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کیٹی بے حد حسین تھی۔ اس کا جسم متناسب اور سڈول تھا۔ اس کا انداز شاہانہ تھا۔ اس نے اپنے بالوں کا جوڑا بڑے سلیقے سے باندھ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کوئی ملکہ لگ رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھوں میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ اس کا سیاہ ریشمی لباس اسے چھپا کم' اور دکھا زیادہ رہا تھا۔

''مارلن کہاں ہے؟'' کیٹی کی آواز میں تجسس تھا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد آ جائے۔'' ڈان نے جواب دیا۔

''وہ نہیں آئے گی' میں جانتی تھی۔'' کیٹی بولی ''مگر مجھے اس پر حیرت ہے کہ اس نے تمہیں اکیلے کیسے آنے دیا؟'' اس کی آواز میں طنز بھی تھا۔

''میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔'' ڈان نے کیٹی کا طنز محسوس کر لیا تھا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر کیٹی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

''اچھا چھوڑو.... ناراض مت ہو....'' کیٹی نے کہا ''ہم سب جانتے ہیں کہ مارلن کس قدر بد مزاج ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ تم نہ جانے اس کے ساتھ کیسے نباہ کر رہے ہو!''

''مجبوری ہے میری....'' ڈان نے سرد آہ بھری۔

''تم چاہو تو مارلن کی جگہ مجھے دے سکتے ہو!'' کیٹی نے معنی خیز نظروں سے ڈان کی طرف دیکھا۔

''میرے خیال میں تو تم بھی مارلن سے زیادہ مختلف نہیں ہو۔'' ڈان نے کہا ''میں یہ جوا نہیں کھیل سکتا۔''

''ورائٹی زندگی کا حسن ہے۔ اس سے زندگی میں لطف اور مزا پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان زندگی میں تبدیلی نہ لائے اور لگی بندھی چیزوں پر اکتفا کرے تو اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔'' کیٹی نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

''مگر میں ایک مالکن کی جگہ دوسری مالکن کو نہیں دے سکتا۔ اس سے میرے لیے کیا فرق پڑے گا؟ میں تو وہی کا وہی رہوں گا.... محکوم اور غلام!'' ڈان نے کہا تو کیٹی زور سے ہنس پڑی اور اونچی آواز میں بولی۔

''تم بہت سنگ دل ہو!''

''میں مارلن کو طلاق دے کر تم سے شادی کر سکتا ہوں۔'' ڈان نے سنجیدگی سے کہا ''بشرطیکہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''کہو....'' کیٹی نے اشتیاق سے اچھل کر کہا۔

''شادی کی رات تمہیں نیند کی گولیاں اتنی مقدار میں لینی ہوں گی کہ اگلی صبح زندہ نہ اٹھ سکو۔'' ڈان نے مسکراتے ہوئے کہا ''بس تم مجھے رنڈوا بنا دو۔ یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ دوسرے یہ کہ تم اپنی جائیداد اور دولت سب میرے نام کر دوگی تاکہ میں تمہاری موت کے بعد آزاد پنچھی کی طرح رہ سکوں اور ساری زندگی تمہیں دعائیں دے سکوں۔''

''تم پکے شیطان ہو!'' یہ کہتے ہوئے کیٹی نے ڈان کے سینے پر گھونسا مارا۔ ''اچھا' میں دوسرے مہمانوں کو دیکھ لوں.... تم کوئی مشروب وغیرہ لو۔'' یہ کہہ کر کیٹی آگے بڑھ گئی۔

ڈان اس کی مستانہ چال اور جذبات خیز اداؤں کو دیکھتا رہا۔ اس دوران میں اس کے کئی دوست اس کے

پاس آئے۔ انہوں نے اس سے گپ شپ کی اور آگے بڑھ گئے۔ ڈان بغیر گلاس کے خود کو ادھورا سا محسوس کررہا تھا۔ وہ بار کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر ہیگی پر پڑی۔ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کا انداز بڑا باوقار تھا۔ وہ دوسری خواتین کی طرح ڈان کے آگے پیچھے نہیں گھومتی تھی شاید اس لیے ڈان ہر پارٹی میں خود بہ خود اس کی طرف کھنچتا تھا۔

وہ اس وقت سفید لباس میں کوئی پری لگ رہی تھی۔ اس پر اس کے کھلے ہوئے سیاہ گھنیرے بال غضب ڈھا رہے تھے۔ اس کی سفید جلد قدرے سنولائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کسی ریگستان میں بہت دن گزار کر آئی ہو!" ڈان نے ہیگی سے کہا۔ وہ بے ساختہ مسکرادی۔

"میں فلوریڈا سے آرہی ہوں..... کسی ریگستان سے نہیں۔" ہیگی نے کہا "وہ بھی پارٹی میں شرکت کے لیے..... کیٹی کا بہت اصرار تھا نا..... اسی لیے مجھے آنا پڑا ورنہ میں کچھ اور دن فلوریڈا میں گزارتی۔"

"میں سمجھا نہیں....." ڈان نے کہا۔

"تمہاری یاد بھی تو آرہی تھی نا....." ہیگی نے کہا تو ڈان حیران رہ گیا۔

"کیوں مذاق کررہی ہو!" ڈان نے کہا۔

"تمہارا میرا مذاق ہے کیا؟" ہیگی نے اسے لاجواب کردیا۔

"دشمنی بھی نہیں ہے۔" ڈان بولا۔

"چلو دوستی کرلیتے ہیں۔" ہیگی نے عجیب انداز سے کہا تو ڈان کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ہیگی کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ غالباً وہ ڈان کے ساتھ کھیل رہی تھی اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"دوستی..... میرا مطلب ہے....." ڈان نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔

"اگر یہاں سب کے سامنے دوستی کا اقرار کرنے سے ڈر رہے ہو تو کہیں اور چلتے ہیں۔ تم ہمت تو کرو۔" ہیگی نے کہا تو ڈان کو بہت برا محسوس ہوا۔ یہ لڑکی مسلسل اس کی بے عزتی کررہی تھی۔ اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے ڈان نے ڈرنک لی اور آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ ہیگی خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر ڈان کو خیال آیا کہ اسے غصہ کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ صرف اتنی سی بات تھی نا کہ وہ لڑکی دوسروں سے مختلف تھی اور اس کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح نہیں گری تھی۔

"ہیگی! تم سڑک کے دوسری طرف ٹاورز میں رہتی ہونا؟" ڈان نے اچانک کہا مگر ہیگی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔

"جناب! آپ کی کال ہے!" بارمین نے ڈان کے پاس آکر کہا تو ڈان نے اپنا گلاس بار کاؤنٹر پر رکھا اور فون سننے چلا گیا۔ کیٹی کے فلیٹ میں فون کی دو ایکسٹینشنز تھیں۔ ایک کچن میں اور دوسری ہال میں..... مگر ڈان نے کچن میں جانا مناسب سمجھا۔ ویسے بھی کچن خالی تھا۔

اس نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا تو دوسری طرف مارلن کی چنگھاڑتی آواز سنائی دی۔ "ڈان! کیا کررہے ہو؟"

"وہی جو پارٹی میں کیا جارہا ہے۔" ڈان نے بے زاری سے کہا "تم نے فون کیوں کیا ہے؟"

"وہاں کون کون ہے؟" مارلن نے پوچھا۔

"بہت سے لوگ ہیں۔" ڈان نے جواب دیا۔

"ڈان پلیز گھر آجاؤ..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔" دوسری طرف سے مارلن کی آواز آئی تو ڈان کا منہ بن گیا۔

"آجاؤں گا..... آجاؤں گا۔ یہاں سے فارغ تو ہو جاؤں۔" ڈان نے بے زاری سے کہا۔

"نہیں..... بس ابھی آجاؤ..... فوراً"

"سنو! مجھ پر حکم چلانے کی کوشش نہ کرو۔"

"اگر تم نہیں آئے تو میں آجاؤں گی۔"

مارلن کی دھمکی سنتے ہی ڈان کو غصہ آگیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا "مارلن! میں تمہیں خبردار کررہا ہوں

کہ کوئی حماقت کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ۔۔۔۔“

”ورنہ۔۔۔ کیا کرلوگے تم؟“ مارلن نے بھی غصے سے کہا ”میرے پاس پستول ہے۔۔۔ اس وقت یہ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اسے لے کر اوپر آؤں گی اور تمہیں سب کے سامنے شوٹ کردوں گی۔ سمجھ گئے؟ میری بات کو مذاق مت سمجھنا۔۔۔ تم میرے شوہر ہو، تم پر صرف میرا حق ہے۔ کسی بھی عورت کا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ میں تمہیں لینے آرہی ہوں۔“

مارلن کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے ڈان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جو وہ کہہ رہی ہے، وہ کرکے رہے گی۔ وہ گھبرا کر بولا ”اچھا میری بات سنو۔۔۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ صرف ایک منٹ میں۔۔۔ میرا انتظار کرو۔۔۔ سمجھ گئیں؟ بس، میں ابھی آیا۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے پر ڈان نے بھی فون بند کردیا۔ اس نے پلٹ کر محفل کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ بارمین جس نے اسے فون آنے کی اطلاع دی تھی، وہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس بلڈنگ کے تمام فلیٹ ایک جیسے تھے۔ سب فلیٹوں کے کچن میں عقبی راستہ تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اس راستے کی طرف بڑھ گیا اور ایک ساتھ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اترنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی غیر موجودگی کو کسی نے محسوس نہیں کیا ہوگا۔

بہ مشکل ڈیڑھ منٹ گزرا ہوگا کہ ڈان اپنے فلیٹ کے دروازے پر تھا۔ اس نے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

آہٹ سن کر مارلن اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور ہاتھوں میں پستول!

”لو بھئی، میں نے تمہاری ضد پوری کردی۔“ ڈان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب بولو، کیا بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ بس تم یہیں رہو۔۔۔ اپنے گھر میں!“

”کیا مطلب؟ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا ہے؟“ ڈان نے چڑ کر سوال کیا۔ اسے غصہ آگیا تھا۔

”میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے تمہاری یہاں ضرورت ہے۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ مارلن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ ڈان نے پوچھا۔

”تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ مارلن نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا تم نے مجھے بالکل بچہ سمجھ رکھا ہے جو ایسی حرکتیں کررہی ہو؟“ ڈان نے سلگتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہیں اب اپنی مرضی کے مطابق چلاؤں گی۔“ مارلن نے کہا ”ماضی کی باتوں کو بھول جاؤ۔“

”تم خواہ مخواہ ضد کررہی ہو۔“ ڈان نے کہا ”جانتی ہو کہ میں ایسی دھمکیوں میں نہیں آؤں گا۔“

”سوچ لو۔۔۔“ مارلن نے کہا ”اگر جینا ہے تو میری مرضی کے مطابق جینا ہوگا۔ دوسری صورت میں مجھے تمہیں مارتے ہوئے ذرا بھی دکھ نہیں ہوگا۔“

ڈان کے سامنے آج مارلن کا ایک نیا روپ تھا۔ وہ حیرت اور خوف کے عالم میں اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ آج تو مارلن نے حد کردی تھی۔ اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں اور وہ کینہ توز نظروں سے ڈان کو دیکھ رہی تھی۔

مارلن پستول تانے ہوئے ڈان کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ڈان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے سرد مہری نظر آئی۔

”اس سے پہلے بھی تم مجھے اس طرح کی دھمکیاں دیتی رہی ہو جو محض گیدڑ بھبکیاں تھیں۔ اسی طرح یہ قتل کرنے والی دھمکی بھی ہوائی ہے۔“ ڈان نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”مجھے تاؤ مت دلاؤ ڈان!“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں جارہا ہوں۔ اگر روک سکتی ہو تو روک لو۔“ ڈان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ رفتہ رفتہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ہی ڈان نے

نیچے بیٹھتے ہوئے اپنے سر کی زوردار ٹکر مارلن کے پیٹ میں ماری۔ وہ چیخ مار کر قالین پر ڈھیر ہوگئی۔ اسے پستول کا ٹریگر دبانے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ ڈان نے مارلن کے اوپر چھلانگ لگائی اور اس سے پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ مارلن کے لیے بھی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ بھی پوری طاقت سے ڈان کا مقابلہ کر رہی تھی لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا۔

آخر کار ڈان نے پستول مارلن کے ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مارلن نے چیخنے کی کوشش کی تو ڈان نے بغیر کی ہچکچاہٹ کے فائر کر دیا۔ اس کا جسم پہلے اکڑا پھر ساکت ہوگیا۔ اس کے سینے میں سوراخ ہوگیا تھا جس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

مارلن کی موت کے بعد ڈان کو اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھوں ایک قتل ہوگیا ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو اسے آگے کی فکر کرنی تھی۔ وہ نہ تو الیکٹرک چیئر پر بیٹھنا چاہتا تھا اور نہ ہی جیل جانا چاہتا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اسے اس مصیبت سے بچنے کی ”فوراً“ ہی کوئی تدبیر کرنی تھی۔

پھر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ وہ اسے ڈکیتی اور قتل کی واردات کا روپ دے سکتا تھا۔ وہ تو اوپر کیٹی کی پارٹی میں گیا ہوا تھا جہاں اس کی موجودگی کی گواہی بہت سے مہمان دے سکتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے پارٹی سے ضرور غائب ہوا تھا مگر اس کا دوسروں کو اندازہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ وہ کچن کے راستے سے آیا تھا اور اسی راستے سے واپس چلا جائے گا۔

مارلن کی لاش دریافت ہونے کے بعد ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں کوئی مسلح لٹیرا اس کے گھر میں گھسا، اس نے اس کی بیمار بیوی کو ڈرا دھمکا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر ناکام ہونے پر گولی مار دی۔ کہانی اچھی تھی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ آلہ قتل کو کہیں غائب کر دے۔ چنانچہ اس نے پستول اپنی جیب میں رکھا اور اپنے گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر کیٹی کے فلیٹ میں چلا گیا۔ کچن کے راستے سے کسی نے بھی اسے آتے نہیں دیکھا۔

سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پیگی ابھی تک باہر کاؤنٹر کے پاس کھڑی تھی۔ ڈان کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی ”تم فون سننے گئے تھے یا.... کہاں غائب تھے؟“

”بس.... ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ کچن میں بیٹھ کر پانی پیا پھر آ گیا۔“ ڈان نے بات بنائی تو پیگی مطمئن ہوگئی۔

”کس کا فون تھا؟ تمہاری بیوی کا؟“ پیگی نے پوچھا۔

یہ سنتے ہی ڈان کی گدی کے بال کھڑے ہوگئے۔

”نہیں.... میری کسی گمنام پرستار کا تھا۔“ ڈان نے سنبھل کر کہا ”اپنا نام تک نہیں بتایا.... بس میرے ساتھ محبت کے مکالمے بولتی رہی۔“ اس نے کہہ تو دیا مگر اس کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت پیگی کے ساتھ سڑک پر واقع ٹاورز میں اس کے گھر چلا جاتا تو اس اعصابی تناؤ سے وقتی طور پر نجات حاصل کر سکتا تھا۔ وہاں اسے اس پستول سے جان چھڑانے کا موقع بھی مل جاتا۔

”کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟“ پیگی نے پوچھا۔

”وہ....“ ڈان نے کہا ”سوچ رہا تھا کیوں نہ کچھ وقت تمہارے ساتھ تمہارے فلیٹ پر گزارا جائے۔“

”ضرور.... ضرور....“ پیگی نے خوش دلی سے کہا۔

وہ دونوں خاموشی کے ساتھ پارٹی میں سے نکلے اور پیگی کے فلیٹ پر پہنچے۔

”آج قسمت مجھ پر مہربان ہے۔“ پیگی نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ڈان سے کہا۔

ڈان نے اس کی طرف دل آویز مسکراہٹ اچھالی اور اس کے پیچھے پیچھے فلیٹ میں داخل ہوگیا۔ فلیٹ میں پہنچتے ہی پیگی ڈرنک تیار کرنے لگی جبکہ ڈان پستول کو کہیں چھپانے کے لیے نظریں دوڑانے لگا۔ اسی دوران پیگی ڈرنک لے آئی تو وہ خاموشی سے پینے لگا۔

”کیا ہم یہاں خاموش بیٹھنے کے لیے آئے ہیں؟“

پیگی نے ڈان سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ایک بار پھر مارلن کے بارے میں باتیں کرنے لگے جبکہ ڈان کی خواہش تھی کہ پیگی اس کے سامنے مارلن کا کوئی ذکر نہ کرے۔ پھر کافی دیر کمرے میں محبت کا کھیل جاری رہا۔ آخر انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو پیگی اپنا ڈریس بدلنے اندر چلی گئی۔ اس دوران ڈان نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔

ایک شیلف میں رکھی ہوئی ڈھیر ساری کتابوں نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ اس نے ان کتابوں کو دیکھا۔ ان ہی میں شیکسپیئر کی سات کتابوں پر مشتمل سیٹ رکھا تھا۔ سرخ جلد والے اس سیٹ کو دیکھ کر ڈان نے سوچا کہ پیگی ان کتابوں کو نہیں پڑھتی ہوگی۔ یہ محض ڈیکوریشن پیس کے طور پر رکھی ہوئی ہیں لہٰذا اس نے وہ کتابیں اٹھائیں اور ان کے عقب میں موجود خالی جگہ میں اپنی جیب سے پستول نکال کر رکھ دیا۔ پھر وہ جلدی سے واپس صوفے پر آن بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد پیگی آگئی اور وہ دونوں واپس کیٹی کی پارٹی میں پہنچ گئے۔

☼ ☼ ☼

پیگی اور ڈان کو آتے دیکھ کر مہمانوں نے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا۔ خواتین ناراض نظر آرہی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں پیگی نے ڈان کو اس طرح پارٹی سے لے جا کر سب کے حق پر ڈاکا ڈالا تھا۔

کسی نے زور سے کہا ''ایسا کرتے ہیں کہ ڈان کو پکڑ کر اس کی بیوی مارلن کے پاس لے جاتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ اسے کیا سزا دیتی ہے۔''

''ہاں' ہاں.... یہ ٹھیک ہے۔'' کسی عورت کی آواز آئی۔ ''ڈان کو اس حرکت کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔''

''ویسے بھی ہم پارٹی کے بعد والی چائے ڈان اور مارلن کے ساتھ پئیں گے۔'' کسی مہمان نے تجویز پیش کی۔ ''مارلن بیمار ہے' پارٹی میں نہیں آسکی۔ اس طرح ہم اس کی مزاج پرسی بھی کرلیں گے۔''

لہٰذا وہ سب مہمان کیٹی کے فلیٹ سے نکلے اور نیچے ڈان اور مارلن کے فلیٹ میں پہنچے۔ ڈان بھی ان کے ساتھ تھا۔ مائیکل' ایلکس' فرینک' جارڈن' براؤن اور ان کی بیویاں یا گرل فرینڈز سبھی نیچے آئی تھیں۔ پیگی اور کیٹی بھی پیچھے نہیں رہی تھیں۔ مائیکل نے ڈان کے گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا پھر وہ اندر چلا گیا۔ دوسرے مہمان بھی آہستہ آہستہ اندر جارہے تھے۔

مارلن کی لاش کس نے پہلے دیکھی' یہ پتا نہیں چل سکا کیونکہ ان سب نے ایک ساتھ خوف زدہ آوازیں نکالی تھیں۔ تھوڑی دیر تک وہ حیران پریشان مارلن کی لاش کو دیکھتے رہے۔

آخر کیٹی نے اعلان کیا ''آپ سب اوپر میرے اپارٹمنٹ پر چلیں۔'' پھر وہ ڈان کی طرف مڑ کر بولی۔ ''تم بھی آؤ۔ تمہیں اس وقت اخلاقی سہارے کی ضرورت ہے۔''

اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک وہ ڈان کے پیگی کے ساتھ جانے پر سخت ناراض تھی مگر اب اس کے لہجے میں دنیا بھر کی ہمدردی سمٹ آئی تھی۔ ان سب نے کیٹی کے گھر میں جا کر مشروب پیا۔ ماحول ایک دم سوگوار ہوگیا تھا۔ وہ سبھی غمگین نظر آنے لگے تھے۔ بات ہی ایسی تھی۔ مائیکل نے پولیس کو فون کیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی دو گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ پولیس سراغ رساں شان بھی تھا۔ وہ لوگ آتے ہی اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ کیٹی کی پارٹی کے تمام مہمان صبح تک وہیں رہے۔ ان سب سے شان نے فرداً فرداً سوال کیے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ صورت حال پوری طرح واضح تھی۔ مارلن کو رات گیارہ بجے کے لگ بھگ گولی ماری گئی تھی۔ اس کے فلیٹ کے آس پاس رہنے والوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے رات گیارہ بجے فائر کی آواز سنی تھی مگر کسی کو نہ اس کے گھر میں جاتے اور نہ نکلتے دیکھا۔

سراغ رساں شان' ڈان کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا مگر اس کے لیے متعدد مہمان گواہی دے چکے تھے کہ وہ اس وقت کیٹی کی پارٹی میں تھا اور تھوڑی دیر کے

لیے ایک مہمان‘ پیگی کے ساتھ سڑک پار ٹاور میں اس کے گھر گیا تھا۔ اس کی گواہی پیگی نے بھی دی تھی اور ٹاورز کے گیٹ کیپر نے بھی۔ دوسرے یہ کہ آلہ قتل نہیں ملا تھا جبکہ ڈان کے پاس کبھی کوئی پستول وغیرہ نہیں رہا تھا۔

دو روز بعد شان نے ڈان کو اپنے آفس میں بلایا اور اسے اپنی تفتیش کے نتیجے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ”یہ کام کسی انجان اور نامعلوم لٹیرے کا ہے۔ تمہارا دروازہ نہ جانے کس طرح کھلا رہ گیا۔ وہ لٹیرا اندر گھس گیا اور۔۔۔۔“

”شان!“ ڈان نے درمیان میں اسے ٹوکا۔ ”ساری دنیا جانتی ہے کہ میرے اور میری بیوی مارلن کے درمیان خوش گوار تعلقات نہیں تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اسے قتل کر دیتا۔ میں دوسری عورتوں کے آگے پیچھے ضرور گھومتا ہوں مگر اپنی بیوی سے بھی پیار کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میرے پیار کو سمجھتی نہیں تھی۔“ ڈان ایک لمحے کو رکا اور بولا ”مگر میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی کا قاتل پکڑا جائے۔“

”وہ ضرور پکڑا جائے گا۔“ شان نے کہا ”مارلن کا قاتل بچ نہیں سکے گا۔“



دو روز بعد ڈان‘ پیگی کے فلیٹ پر پہنچا تو اسے چشم براہ پایا۔ پیگی کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی تھی مگر ڈان نے اس کے حسن بے مثال پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ بے زاری سے کہا ”میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تمہارے ساتھ باہر کہیں جاؤں گا مگر تم نے غالباً گھر پر ہی جشن منانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔ میں تو شاید کئی جنم سے تمہاری منتظر تھی۔“ پیگی نے خواب ناک لہجے میں کہا ”اب تم مل گئے ہو تو ایک ایک لمحہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔“

”مگر میں باہر جاؤں گا۔۔۔۔“ ڈان نے ضدی لہجے میں

ادب سے۔۔۔۔!

توبہ شکن تواضع

اُڑنے سے پیشتر ایک رس بھری آواز نے براہ مائیکروفون ”ہمیں خوشامد کی حد تک خوش آمدید کہا اور خوشامد کا مزا ابھی منہ ہی میں تھا کہ بوئنگ فضا میں بلند ہوا۔ جب ذرا بہار آفریں بلندی پر پہنچا تو تواضع کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے سگار آئے، پھر ناشتہ آیا، پھر سگار آئے اور آخر سوال آئے، ”کچھ پیجیے گا؟ کچھ پڑھیے گا؟ سر کے نیچے تکیہ رکھ دوں؟ پاؤں کے نیچے دل رکھ دوں؟ اپنی جاں نظر کروں؟ اپنی وفا پیش کروں؟“ خدا جانے اس توبہ شکن تواضع نے کتنے شوہروں کے مزاج بگاڑے اور گھر اجاڑے ہوں گے! (کرنل محمد خان)

کیسی کیسی ترقیاں!

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شورکوٹ نے خوب ترقی کی۔ سینما پکی چار دیواری والے احاطے میں منتقل ہوا۔ سبزی فروشوں نے سبزیوں کے اُردو نام سیکھے۔ پہلے ”بینگن“ کو ”بتوؤں“ کہتے تھے، پھر ”وینگن“ کہنے لگے۔ ”شلجم“ پہلے ”گونگلو“ ہوتے تھے، بعد میں ”شلغم“ ہوئے۔ ”پیاز“، ”گنڈھوں“ سے ”وصل“ بنے۔ کیسی کیسی ترقیاں ہوئیں:

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (اختر حسین شیخ)

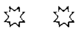
کہا۔

”اچھا نہیں لگے گا مجھے۔۔۔۔“ پیگی نے لگاوٹ سے کہا۔ ”تمہاری بیوی مارلن کی موت کو ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس طرح کھلم کھلا گھومنے پھرنے لگے تو لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ دوسروں کا بھی تو خیال کرو۔“

”میں یہاں تمہارا لیکچر سننے نہیں آیا۔“ ڈان کا لہجہ یکدم خاصا تلخ ہو گیا۔

”ڈان! تم جانتے ہو کہ اب ہم دونوں ایک ایسی پارٹنر شپ قائم کر چکے ہیں جس میں تم مجھے آنکھیں

نہیں دکھا سکتے۔" پیگی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"کیسی پارٹنرشپ؟ کھل کر کہو، پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟" ڈان کو غصہ آگیا۔ اس پر سے پیگی کی معنی خیز مسکراہٹ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
"اب تم پورے کے پورے میرے ہو۔ تمہاری ہر چیز میری ملکیت ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں نے تمہیں خرید لیا ہے۔ اگر تم چاہو بھی تو اس غلامی سے نجات حاصل نہیں کرسکتے.... سمجھے کچھ؟" پیگی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو پہلی بار ڈان کو اس لڑکی سے خوف محسوس ہوا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیگی کی طرف دیکھے جارہا تھا جس کے ہونٹوں پر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔
آخر اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بات بگڑ رہی ہے۔ ایسے میں اگر پیگی کو غصہ آجاتا تو اسے پولیس سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسے پیار محبت سے کام لے کر پیگی کے بک شیلف سے وہ پستول نکالنا تھا۔
"تم خواہ مخواہ پریشان ہوگئے۔" پیگی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "میں تو مذاق کررہی تھی۔ بہرحال یہ طے ہے کہ اب تم صرف میرے ہو.... بلا شرکت غیرے.... دوسرے یہ کہ مجھ سے بے وفائی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں کیونکہ...."
"مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش مت کرو۔" ڈان نے ناگواری سے کہا "ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جس وقت مارلن قتل ہوئی ہے، اس وقت میں یہاں.... اس فلیٹ میں تھا.... تمہارے بستر پر.... تمہارے ساتھ.... پھر تم کیوں اکڑ رہی ہو؟"
"میں نے تم سے مارلن کے قتل کے حوالے سے کچھ کہا؟" پیگی نے کہا "یہ تمہارے اندر کی آواز تھی جو بے ساختہ لبوں پر آگئی؟"
پیگی کا انداز ایسا تھا کہ ڈان اندر ہی اندر کانپ گیا۔
وہ پہلے اس لڑکی سے دور رہتا تھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اس کے چنگل میں پھنس گیا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پیگی کو منہ لگا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس عورت کے لہجے میں مارلن بول رہی تھی.... بلکہ مارلن تو پھر بھی نرمی سے کام لے لیا کرتی تھی مگر یہ.... اس کا لہجہ اس قدر کاٹ دار تھا کہ ڈان کی روح تک زخمی ہوگئی تھی۔
"سنو ڈان! تم شاید نہیں جانتے کہ میں شیکسپیئر کو کس قدر شوق سے پڑھتی ہوں۔" پیگی نے کہا تو ڈان کی تھرتھری چھوٹ گئی۔
"شاید ہی کوئی دن ہوتا ہو جب میں اسے نہ پڑھتی ہوں۔ اب تو مجھے اس کی عادت سی ہوگئی ہے۔" پیگی نے کہا اور مسکراتی نظروں سے ڈان کو دیکھنے لگی۔
"تو یہ بات ہے؟" ڈان نے کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ پیگی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا، اس کے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور پولیس ہیڈ کوارٹرز کا نمبر ڈائل کر کے سراغ رساں شان سے بات کرانے کو کہا۔
دوسری طرف شان کی آواز سنائی دی تو ڈان نے کہا "مسٹر شان! میرے پاس مارلن کے قتل کے بارے میں اہم معلومات ہے۔ میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔" دوسری طرف سے شان نے جو کچھ کہا، وہ سننے کے بعد ڈان نے سلسلہ منقطع کردیا۔
"تو گویا تم خود کو پولیس کے حوالے کررہے ہو؟" پیگی نے سکون سے کہا۔
"ہاں! میں ایک مارلن کے بعد دوسری مارلن کو برداشت نہیں کرسکتا۔" ڈان نے کہا۔ "اس سے میری حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں وہی غلام کا غلام رہوں گا.... مگر مجھے آزادی چاہیے اور یہ آزادی صرف جیل میں مل سکتی ہے۔"



ناسور

جاوید راہی

یہ ایک ایسی لڑکی کی کتھا جو خواہشات کے پیچھے بھاگتے بھاگتے موت کے منہ میں چلی گئی۔ یہ کہانی ایک ایسے باپ کی ہے جو انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ ان زر پرستوں کا احوال جنھیں سونے چاندی کی خیرہ کن چمک نے بینائی سے محروم کردیا تھا۔ موت کے ان سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے زہر پلا رہے تھے۔

نیکی اور بدی کی قوتوں کی ازلی پیکار کے ایک محاذ کا احوال



سپاہی فتح خان لال پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ تاحد نظر بکھری ہوئی ویرانی پل کے نیچے بہتے ہوئے دریا کا شور۔ دور دور تک کسی ذی روح کا وجود ناپید۔ اسے پل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گشت کرنا ہوتا تھا۔ پل اچھا خاصا لمبا اور چوڑا تھا اتنا کہ اس سے بھاری ٹریفک آسانی سے گزر جاتا تھا۔ لیکن یہ علاقہ سنسان تھا اور خاص طور سے یہاں رات کے وقت بالکل ٹریفک نہیں ہوتا تھا کیونکہ اکثر یہاں لوٹ مار کی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔

فتح خان واحد سپاہی تھا جس نے کبھی یہاں کی ڈیوٹی پر ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی اور خوشی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا ورنہ دوسرے سپاہی کبھی خوشی سے یہاں نہیں آتے تھے۔ فتح محمد کا مزاج الگ تھا' وہ نوکری کو نوکری سمجھتا تھا۔ ساری زندگی سر جھکا کر ہر طرح کی ڈیوٹی سرانجام دی تھی اب تو ریٹائر ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا مگر اسے اس کا بھی انتظار نہیں تھا۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

اب تو اسے اس پل سے بھی انسیت ہو گئی تھی کیونکہ یہاں ڈیوٹی ہوئے طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ پل کی ریلنگ سے کمر ٹکا کر جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا۔ ابھی اس نے سگریٹ سلگائی بھی نہیں تھی کہ پل کے دوسرے سرے پر کسی کار کی روشنیاں چمکیں اور وہ رک کر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر رات کے سناٹے میں ایک چیخ ابھری اور سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر نیچے گر گئی چیخ اسی کار میں ابھری تھی آواز نسوانی تھی۔ چیخ دوبارہ سنائی دی اور فتح محمد نے جلدی سے گن سنبھالی اور۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کو دیکھنے لگا جس کی رفتار ست تھی اور وہ ٹیڑھی میڑھی چل رہی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کار کے اندر جدوجہد ہو رہی ہے۔

کار قریب آ گئی۔ اس کی رفتار اور ست ہو گئی۔ فتح خان سے تھوڑے ہی فاصلے پر اچانک کار کر دروازہ کھلا اور کسی نے چلتی کار سے چھلانگ لگا دی۔

"فتح خان بری طرح اچھل پڑا تھا۔ چھلانگ لگانے والا بری طرح لڑھکتا چلا گیا تھا کار فوراً" ہی نہیں رکی بلکہ تھوڑی سے آگے جا کر اس کے بریک چرچرائے۔" پھر وہ ریورس ہونے لگی۔

"فتح خان اپنا فرض سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کوئی خطرناک کام ہونے والا ہے۔ پھر اس نے کار سے چار افراد کو نیچے اترتے دیکھا۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں سے چند گز کے فاصلے پر الیکٹرک پول تھا جس پر مرکری لائٹ روشن تھی اور ماحول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے ان چاروں کو دیکھا جو تیزی سے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں کار سے کودنے والا گرا تھا۔ پھر ان میں سے دو نے جھک کر اس جسم کو اٹھایا تب ہی فتح خان کے کانوں میں ایک دلخراش چیخ ابھری۔"

"آہ۔ چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔"

"فتح خان کے لیے اب برداشت کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھتا ہوا آیا۔" چھوڑو اوئے۔ چھوڑ دو اسے پیچھے ہٹ جاؤ۔ ورنہ ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ اس نے گن سیدھی کر کے کہا۔

وہ چاروں چونک پڑے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فتح خان کو دیکھا۔ اپنے چہروں سے وہ چاروں چھٹے ہوئے غنڈے لگ رہے تھے۔ ایک دونوں قامت تو بے ور خوفناک چہرے کا مالک تھا۔ انہیں کسی سپاہی کی یہاں موجودگی کا پتا نہیں تھا۔ فتح خان کی گن کی نال اپنی طرف اٹھی دیکھ کر وہ سنبھل گئے۔ لمبے قد والے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہماری بات سن لو حوالدار صاحب۔ قریب آ کر دیکھو تو معاملہ کیا ہے۔ ہماری پوری بات سن لو۔"

"اوئے تم لڑکی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔ اس معاملہ میں بعد میں دیکھوں گا چلو ہٹو پیچھے نہیں تو میں فائر کھولتا ہوں۔"

"لیجئے ہم نے چھوڑ دیا۔" ان دونوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اور وہ زمین پر گر پڑی۔ فتح خان گن سیدھی کیے ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھا جس کا

چہرہ خون میں لت پت تھا۔ جسم کے دوسرے حصے بھی کار سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہوئے تھے۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

”حوالدار جی۔ یہ ایک خطرناک لڑکی ہے۔ دو بندوں کو قتل کر کے بھاگی ہے ہم اسے علاقے کے تھانے لے جا رہے تھے کہ اس نے کار سے چھلانگ لگا دی۔“

”ایں۔ فتح خان نے دوبارہ لڑکی کو دیکھا۔“

”ہاں حوالدار جی۔ آپ بھی ہماری مدد کریں۔ یہ تو اچھا ہوا آپ کی گواہی بھی لگ جائے گی۔ فتح خان نے کچھ سوچا پھر بولا۔“

”یہ قاتل ہے؟“

”ہاں حوالدار جی۔ آپ قانون والے ہو جی۔ آپ بھی ہماری مدد کریں ایک قاتلہ کو پولیس کے حوالے کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر یہ زخمی ہے۔ پہلے اسے پولیس اسپتال لے چلو۔ فتح محمد نے گن نیچے کر لی۔ لیکن یہی غضب ہو گیا۔ اچانک لمبے قد والے نے پوری مہارت سے ایک لات فتح خان کے ہاتھ پر رسید کی اس نے اچھل کر فتح کے پیٹ پر دوسری لات ماری اور فتح خان اچھل کر دور جا گرا۔ لمبے قد والے نے کہا۔“

”مار دو اسے چھٹی کرو۔ تین آدمی فتح خان کی طرف بڑھے لیکن شدید تکلیف کے باوجود فتح خان پھرتی سے اٹھا۔ ان تینوں نے اس پر جھپٹا مارا تھا لیکن فتح خان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ سیدھے بھاگنے کے بجائے اس نے پل کے کنارے کو پکڑا اور نیچے کود گیا۔ وہ دریا میں جا گرا اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔“

تینوں افراد نیچے جھانکنے لگے تو لمبے قد آور نے کہا۔

”خاک ڈالو جلدی کرو۔“

اور فتح خان نے دریا میں گر کر خود کو سنبھالا وہ بہترین تیراک تھا چنانچہ اس نے دریا کے بہاؤ پر تیرنا شروع کر دیا اور تھوڑی دور جا کر کنارے کی طرف بڑھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ کنارے پر تھا۔ زندگی تو بچ گئی تھی لیکن اسے افسوس تھا کہ وہ اپنا فرض پورا نہیں کر سکا۔ جان جاتی تو جاتی۔ لیکن فرض تو پورا ہو جاتا۔

کنارے پر نکل کر اس نے سانس ٹھیک کر کے اوپر دیکھا۔ لیکن اوپر خاموشی طاری تھی۔ وردی پانی سے شرابور تھی۔ جوتوں میں بھی پانی بھرا ہوا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس جگہ کے چپے چپے سے واقف تھا چنانچہ ایک جگہ سے اس نے ڈھلان عبور کیے اور آخر کار سڑک پر پہنچ گیا۔ لیکن سڑک سنسان پڑی تھی۔ کار کا بھی پتا نہیں تھا۔ فتح خان دوڑتا ہوا اس جگہ تک پہنچا جہاں لڑکی گری تھی لیکن اب وہاں خون کے کچھ دھبوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ اس کی گن اسی جگہ پڑی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر افسوس بھرے انداز میں گردن جھٹک کر سڑک پر آگے بڑھ گیا۔



”سر میں زمان شاہ بول رہا ہوں۔“

”ہاں زمان شاہ خیریت بتاؤ۔“

”خیریت ہی ہے شاہ جی۔ میں لال پل پر کھڑا ہوں۔ یہاں سپاہی فتح خان کی ڈیوٹی تھی۔ اس جگہ واردات ہوئی ہے۔ واردات کی خبر لے کر فتح خان پیدل چل کر تھانے پہنچا۔ لمبا راستہ تھا موبائل رحیم علی کی۔ مگر تھی بھی گشت پر تھی۔ رحیم علی پہلے تھانے آیا پھر فتح خان کو لے کر موقع پر گیا۔ اس طرح پوری رات گزر گئی۔ مجھے صبح کو خبر ہوئی میں یہاں آ گیا ہوں۔“

”واردات کیا ہے؟ شاہ میر نے پوچھا۔ اور زمان شاہ نے مختصراً“ الفاظ میں اسے فتح خان کی کہانی بتائی۔“

”میں آ رہا ہوں۔ !شاہ میر نے کہا۔“

لال پل پر دور ہی سے پولیس موبائل نظر آ گئی تھی۔ زمان شاہ اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ کہانی شاہ میر کے علم میں آ گئی تھی۔ خون کے دھبوں کے ساتھ انسانی بدن کو گھسیٹنے کے نشانات بھی نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے انہیں دیکھا پھر سیدھا ہوا تھا کہ زمان شاہ بول پڑا۔

”رحمت خاں اور جمال الدین کو میں نے کال کر لیا

ہے سر دونوں راستے میں ہیں۔ بائیک پر آرہے ہیں۔ فوٹوگرافرز آچکے ہیں۔"
رحمت خان اور جمال الدین پولیس کے غوطہ خور تھے۔ اور اندازہ ہی تھا کہ لڑکی کو ہلاک کر کے اس کی لاش پل سے نیچے پھینک دی گئی ہوگی۔ چنانچہ غوطہ خوروں کو لاش کی تلاش کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ ضروری کارروائیاں ہوتی رہیں۔ غوطہ خوروں نے تھوڑے فاصلے پر دریا میں ابھری چٹانوں کے درمیان پھنسی ہوئی لڑکی کی لاش برآمد کرلی۔ کافی خوش شکل اور نوجوان لڑکی تھی۔ اسے پولیس اسپتال منتقل کیا گیا اس کے پاس سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جو لڑکی کے بارے میں کوئی نشاندہی کرتی۔ لاش کی تصویریں بنائی گئیں اور اخبارات کو دے دی گئیں۔ لیکن دو دن تک لڑکی کے ورثاء کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ تیسرے دن پولیس اسٹیشن کو ایک فون موصول ہوا۔
"آپ تھانے سے بول رہے ہیں۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔"
"جی فرمایئے۔" شاہ میر نے کہا۔
"انچارج صاحب سے بات کرنی ہے۔"
"میں ہی بول رہا ہوں۔"
"آپ کو ایک انفارمیشن دینا چاہتا ہوں۔"
"اخباروں میں ایک لڑکی کی لاش کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔"
"ہاں۔ شاہ میر چونک پڑا۔"
"اس کے بارے میں کچھ بتانا ہے۔"
"اوہو۔ بتایئے۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔"
"مجھے چھوڑیے۔ اس کے بارے میں جو کہہ رہا ہوں اسے سنئے۔ اس کا نام وردانہ ہے۔"
"اور کیا بتا سکتے ہو اس کے بارے میں؟"
"اس کا پتا لکھئے۔ ماں باپ بھی ہیں اس کے۔ بس جی اپنے کیے کا پھل سب کو ضرور ملتا ہے۔ آپ پتا لکھئے۔" شاہ میر نے جلدی سے کاغذ قلم لے کر اس کا بتایا ہوا پتا لکھا پھر بولا۔
"آپ نے پولیس کی مدد کی ہے۔ ایک اچھے شہری کے لیے پولیس ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ اب ہمیں اپنے بارے میں بتایئے۔"
"پورے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتے ہیں سر۔ خدا حافظ۔" فون بند ہوگیا اور شاہ میر اس کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہ نمبر بھی کاغذ پر لکھا اور اس کے بعد پتے پر نظر دوڑانے لگا۔ اس وقت صفورا اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیاں بجائیں اور شاہ میر مسکرانے لگا۔ صفورا اسے غور سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔
"کیسے ہیں سر۔"
"ٹھیک ہوں۔ آپ نے مجھے بہت غور سے دیکھا ہے مس صفورا۔"
"جی سر۔۔۔ میں آپ کو خصوصی مسکراہٹ کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہی تھی۔"
"اچھا۔۔۔ مسکراہٹوں میں بھی خصوصیت ہوتی ہے۔"
"بے شمار اقسام ہوتی ہیں مسکراہٹوں کی سر۔۔۔ پیار بھری مسکراہٹ' سیاسی مسکراہٹ' سماجی مسکراہٹ' ڈپلومیٹک مسکراہٹ' شاطرانہ مسکراہٹ' شیطانی مسکراہٹ وغیرہ۔"
"گڈ۔۔۔ میں اس وقت ایک اور خیال سے مسکرایا تھا۔"
"بتایئے۔۔۔ صفورا اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بولی۔"
"میں سوچ رہا تھا کہ اگر شوہر انسپکٹر ہو اور بیوی سب انسپکٹر۔ دونوں گھر پر ہوں۔ بیوی' شوہر کے لیے صبح کی چائے لائے تو کیا اندر داخل ہو کر وہ شوہر کو سلوٹ کرے گی' کیونکہ اس کی اسے عادت ہوگی۔ یہ کام اس کے لیے کتنا مشکل ہوگا' کیونکہ اس کے ہاتھوں میں تو چائے کی ٹرے ہوگی۔"
"وہ انسپکٹر شوہر کس کام کا جو ایک عدد نوکرانی کا بندوبست بھی نہ کرسکے' جو اس کے لیے چائے اور کھانا وغیرہ لایا کرے۔"
"گویا سب انسپکٹر بیوی اسے سلوٹ کیے بغیر باز نہیں آئے گی۔ یعنی شوہر رومانٹک موڈ میں ہو

اور۔۔۔۔" شاہ میر نے اتنا ہی کہا تھا کہ زمان شاہ نے اندر آکر ایڑیاں بجائیں۔
"ہاں زمان شاہ خیریت۔"
"جی سر۔۔۔ گشت پر نکل رہا ہوں۔ کوئی حکم تو نہیں ہے۔"
"ہم دونوں بھی چل رہے ہیں۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ انفارمیشن ملی ہے۔ ہوسکتا ہے ٹھیک ہو۔"
"لاش کے بارے میں سر۔"
"ہاں ایک پتا ملا ہے۔ دیکھ لیتے ہیں۔" شاہ میر نے کہا۔
"ٹھیک ہے سر۔۔۔" زمان شاہ نے کہا اور باہر نکل گیا۔ شاہ میر اب سنجیدہ ہو کر صفورا کو اس فون کال کی تفصیل بتانے لگا۔



پولیس موبائل اس پتے پر پہنچ گئی۔ درمیانے درجے کا علاقہ تھا۔ پولیس موبائل کو سنسنی خیز نظروں سے دیکھا گیا تھا۔ مطلوبہ گھر کے سامنے موبائل رک گئی۔ ایک کانسٹیبل نے دروازے کی بیل بجائی تو ایک اٹھارہ' انیس سال کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے حیرت سے پولیس کو دیکھا۔
"ریاض احمد یہیں رہتے ہیں۔" کانسٹیبل نے پوچھا۔
"جی۔۔۔ یہ ان ہی کا گھر ہے۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میرا نام ایاز احمد ہے۔"
"انسپکٹر صاحب' ریاض احمد سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں خبر کرو۔" لڑکا اندر چلا گیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ شخص ایک اور نوجوان لڑکے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جس کی عمر پچیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ پریشان نظر آرہے تھے۔ شاہ میر نے صفورا کو اشارہ کیا اور دونوں موبائل سے نیچے اتر آئے۔ شاہ میر نے پر رعب لہجے میں کہا۔

"اندر چلو۔۔۔ تم سے بات کرنی ہے۔"
ریاض احمد سامنے سے ہٹ گیا اور شاہ میر صفورا کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر باہر سے بوسیدہ سا تھا' لیکن اندر سے کافی بہتر نظر آرہا تھا۔ ہر چیز موجود تھی۔ فریج' ڈیپ فریزر' ٹیلی ویژن' کمپیوٹر' تمام چیزیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ گھر والے باہر سے بوسیدہ' اندر سے مضبوط ہیں۔ ہر چیز نئی لگ رہی تھی' جیسے خوش حالی نئی نئی آئی ہے۔
شاہ میر نے ان تمام چیزوں کو جائزہ لیا۔ پھر ان لوگوں کا۔ ان کے چہروں پر پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ شاہ میر نے نرم لہجے میں کہا۔
"یہ دونوں بچے آپ کے ہیں۔"
"جی ہاں۔۔۔ یہ ایاز احمد ہے اور یہ سجاد احمد۔"
"کتنے بچے ہیں آپ کے۔"
ریاض احمد نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔ دو۔۔۔ دو۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔
"صرف دو۔۔۔" شاہ میر نے پوچھا۔
"جی۔۔۔" ریاض احمد صاحب۔ آپ جانتے ہیں پولیس سے جھوٹ بولنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔
"ن۔۔۔ نہیں' جھوٹ نہیں بول رہا۔ میرے تین بچے ہیں۔"
"دو یہ اور ایک؟"
"ایک لڑکی ہے۔"
"کہاں ہے وہ۔" شاہ میر نے کہا۔ "ریاض کچھ لمحے خاموش رہا' پھر اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی اور شاہ میر نے افسردگی سے گردن ہلائی۔" ریاض صاحب حقیقت کبھی چھپتی نہیں۔ آپ جانتے ہیں۔
"خدا مجھے غارت کردے۔ خدا مجھے فنا کردے۔ بہت موت مانگی ہے اپنے لیے۔ مجھے تو موت بھی قبول نہیں کرتی' کیا کروں؟" ریاض احمد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

''اپنے آپ کو سنبھالیے۔ یہ بتایے بات آپ کے علم میں آچکی ہے۔ لڑکے تم بتاؤ۔'' شاہ میر نے بڑے لڑکے سے پوچھا۔

''جی افسر صاحب.... ہم اخباروں میں دردانہ باجی کی لاش کی تصویریں دیکھ چکے ہیں۔''

''اس کے باوجود تم نے پولیس کو خبر نہیں کی۔ جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ بتاؤ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کی تم نے۔'' شاہ میر کا لہجہ سرد ہوگیا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شاہ میر بھڑک اٹھا۔ ''مذاق سمجھ رہے ہو تم لوگ، میں تم تینوں کو تھانے لے جاؤں گا۔ الٹا لٹکا کر ماروں گا اور تمہاری زبانیں کھل جائیں گی۔'' سمجھ رہے ہو تم۔

وہ تینوں سہم گئے۔ ریاض احمد نے سر اٹھا کر کہا۔ ''میں بتاتا ہوں افسر صاحب، میں بتاتا ہوں سب کچھ۔ آپ سن لیجیے۔ پھر جو آپ کا دل کہے ہمارے ساتھ کیجیے۔ ہم تو ویسے ہی زندہ درگور ہیں۔''

''بتایے....'' شاہ میر بولا۔

''وہ میری بیٹی تھی۔ دردانہ تھا اس کا نام۔ افسر صاحب ہمارا گھر اس بدنما معاشرے کی برائیوں کا شکار ہوگیا۔ میں ایک دفتر میں نوکری کرتا تھا۔ معمولی سی زندگی گزر رہی تھی ہماری۔ کچھ نہیں تھا ہمارے پاس، بس ایک تیر مارا تھا میں نے۔ بچوں کو تھوڑا بہت پڑھا لیا۔ دردانہ نے بھی انٹر کرلیا تھا۔ بڑے لڑکے نے بی اے کرلیا۔ چھوٹے نے میٹرک کیا ہے۔ دردانہ بڑے بیٹے سے چھوٹی تھی۔ گھر کے حالات برے سے برے ہوگئے تو دردانہ نوکری تلاش کرنے لگی۔ اسی دوران میری نوکری بھی چھوٹ گئی۔ افسر جی میرے بچے نکمے نہیں ہیں، مگر انہیں بھی کوئی نوکری نہیں ملی۔ ہمارے گھر فاقے ہونے لگے۔ ہم سخت پریشان تھے۔ دردانہ جنونی فطرت کی تھی، جب کچھ کرنے کا فیصلہ کرتی تو اندھی ہوجاتی تھی۔ تھوڑے دن تک وہ ماری ماری پھرتی رہی۔ ہم نہیں چاہتے تھے، ہمیں فاقے گوارہ تھے۔ اپنی آبرو کو گھر سے نکالنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے اسے بہت منع کیا، مگر وہ گھر کی حالات خراب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے خوش خبری سنائی کہ اسے نوکری مل گئی۔ اس نے اپنی نوکری کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ وہ صبح سے شام تک مصروف رہتی تھی۔ وہ تھوڑے ہی دن کے بعد بیس ہزار روپے لے کر آئی اور ہم دنگ رہ گئے۔ میری بیوی نے اس سے سوال کیا کہ وہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائی، تو وہ آگ بگولا ہوگئی اور غرا کر بولی کہ کسی کو اس سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔ کسی نے زیادہ گڑبڑ کی تو وہ یہ گھر چھوڑ دے گی۔ بس افسر صاحب ہم خاموش ہوگئے۔ آپ کچھ بھی کہہ لیں افسر صاحب۔ انسان کب بے غیرت ہوجاتا ہے، خود اسے بھی پتا نہیں چلتا۔ اس کے بعد اس نے گھر کا حلیہ بدل دیا۔ اس گھر میں سب کچھ اسی کا لایا ہوا ہے۔ ہم میں سے کسی کو یہ سب کچھ گوارہ نہیں تھا۔ جب ہم اسے زیادہ کچھ کہتے تو اس پر جنون سوار ہوجاتا تھا، وہ یہ ہی کہتی کہ دو، دو نکمے بھائی جب ناکارہ ہوکر گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں تو بہنوں کو گھر سے نکلنا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے گھر پر انگلیاں اٹھتی تھیں۔ ہماری لڑائیاں ہوتی تھیں تو وہ تلخی سے مسکرا کر کہتی۔

''بٹھا لیجیے مجھے گھر میں۔ گھر کی ضرورتیں پوری کردیجیے۔ اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی۔'' ہم نے اسے خودکشی کی دھمکی بھی دی تو اس نے کہا کہ ''شوق سے مرجایے۔ آپ جیسے لوگوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے صاحب! اسے کس نے مار دیا۔ ہم نہیں جانتے، لیکن آپ ہمیں گرفتار کرکے پھانسی دے دو۔ ہم سب ہی اس کے قاتل ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی کے بعد شاہ میر نے پوچھا۔ ''کیا وہ راتوں کو بھی غائب رہتی تھی؟''

''زیادہ تر.... ایک بار میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے اس نے دردانہ کو بازار میں دیکھا تھا۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھی۔ اس سے پہلے کہ سجاد اس کے پاس جائے، اس نے ایک کار کا دروازہ کھولا اور اسے خود چلاتی ہوئی چلی گئی۔''

''کیا اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔''

"کہاں صاحب.... میرے کسی بیٹے تک نے آج تک سائیکل نہیں چلائی۔"

"تم نے اسے ٹھیک سے دیکھا تھا۔ وہی تھی۔" شاہ میر نے سجاد سے پوچھا۔

"جی صاحب۔" اس سے پوچھا بھی تھا۔ تو اس نے غصے سے کہا کہ اپنے کام سے کام۔

"اس نے انکار نہیں کیا؟"

"وہ ہمیں کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ ہم بے غیرت اس کی کمائی جو کھاتے تھے۔ اسے برا کہتے تھے اور اس کی کمائی کھاتے تھے۔ ریاض احمد نے روتے ہوئے کہا۔"

"ہوں.... ہم دردانہ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

دردانہ کے سامان کی نشاندہی کی گئی۔ لباس کاغذات میک اپ کا سامان دردانہ کی تعلیمی رپورٹ براؤن رنگ کا ایک لفافہ ان کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔ اسے کھول کر دیکھا گیا تو اس میں سے کچھ پراسرار کاغذات نکلے۔ ان کاغذات پر بال پوائنٹس سے نقشے بنائے گئے تھے اور ان پر کوئی تحریر نہیں تھی۔ البتہ ایک گروپ فوٹو ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس تصویر میں کچھ لوگ نظر آرہے تھے جو شکلوں سے اچھے لوگ نہیں لگ رہے تھے، ان کے ساتھ دردانہ بھی کھڑی تھی اور وہ جینز میں ہی ملبوس تھی۔

"یہ ہی ہے نا آپ کی بیٹی۔" شاہ میر نے تصویر ریاض احمد کو دکھائی اور وہ پھر رو پڑا۔

"اور یہ کون لوگ ہیں؟" ریاض احمد نے ان سے ناواقفیت کا اظہار کیا تھا۔ "یہ لفافہ میں رکھ رہا ہوں۔ آپ دردانہ کی لاش اسپتال کے سردخانے سے حاصل کرکے اس کی تدفین کرسکتے ہیں۔"

"ایک عرض کرنا چاہتا ہوں انسپکٹر صاحب۔ خدا کے لیے اس کی موت کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی نہ کرائیں۔ ہم پورے محلے میں بدنام ہوچکے ہیں۔ لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی لاش آئے گی تو طرح طرح کی باتیں کی جائیں گی۔ کوئی بھی اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوگا۔ ہم اور ذلیل ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس کی سرکاری طور پر تدفین کردی جائے گی۔ اجازت دیجیے۔"



ضروری کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل ہوچکی تھی، جس کی تفصیل یوں تھی کہ لڑکی کو شدید اذیت دے کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں ٹخنوں کی ہڈیاں توڑ دی گئی تھیں۔ ایک بازو فریکچر تھا، سب سے بڑی اور غم انگیز بات یہ تھی کہ وہ باعصمت تھی۔ اس کی آبروریزی کبھی نہیں کی گئی تھی۔

"مائی گاڈ...." صفورا کی آنکھوں میں آنسو گئے۔

"وہ ایک فاحشہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بھی اسے بدکردار سمجھتے تھے۔

"اس نے اپنے گھر کی بہتری کے لیے اپنی جان بھی دے دی۔"

"وہ فون بھی اس کے کسی پڑوسی کا ہوسکتا تھا، جس نے تصویر پہچان کر پولیس کو فون کردیا ہو۔"

شاہ میر کے لیے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا تھا۔ اس قتل کا سراغ اس کی ڈیوٹی بھی تھا، لیکن اس کے دل کو بھی لگ گئی تھی کہ ایک عصمت ماب لڑکی پر آبرو یافتہ ہونے کی تہمت کیسے ہٹائی جائے۔ وہ ان کاغذات میں کھویا ہوا تھا جو اسے اس براؤن لفافے سے حاصل ہوئے تھے۔ اسے ایک جگہ کے بارے میں اشارہ ملا تھا، جہاں منشیات فروخت ہوتی تھیں۔ غور و خوض کے بعد۔ شاہ میر نے سیزارو جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ سادہ لباس میں سیزارو پہنچ گیا۔ اس جگہ کے بارے میں اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ یہاں ہر طرح کی منشیات آرام سے مل جاتی ہیں۔ اس کا پس منظر شاہ میر سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔

سیزارو کے ہال میں لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کاؤنٹر پر ایک خطرناک سی شکل آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ

میرنے چائے منگوالی۔ وہ گہری نظروں سے پورے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہوٹل کا ایک ویٹر اس کے پاس آگیا۔

"کچھ اور چاہیے صاحب۔"

"نہیں ویٹر' ضرورت ہوئی تو منگوالوں گا۔"

"آپ کو اٹھنا ہوگا۔ یہاں کسی کو بہت دیر تک بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے چاند خان صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں' وہ اس ہوٹل کے مالک ہیں۔"

"ہوں.... کہاں ہیں وہ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو وہی بتائیں گے۔ آپ مہربانی کرو۔ ہمارے ساتھ چلو۔" ہوٹل کے اندرونی حصے کے ایک کمرے میں چاند خان ملا۔ لمبے قد کا مالک تھا۔ اس کا ایک کان غائب تھا اور اس کا سوراخ بہت مکروہ لگ رہا تھا۔ باقی چہرہ بھی جھلسا جھلسا لگ رہا تھا۔ اس نے خوش اخلاقی سے شاہ میر کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کی پیش کش کی۔ شاہ میر اطمینان اطمینان سے بیٹھ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہو چاند ستارے' کیسے آنا ہوا۔ ہمارے لیے کوئی خدمت ہے۔"

"چاند خان تم ہو۔"

"کہنے میں کیا حرج ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"مجھے بلایا تھا تم نے؟"

"ہاں پہلے کبھی ادھر نہیں آئے۔ ویسے تمہارا علاقہ بھی نہیں ہے۔ یہاں کے انچارج شہباز خان صاحب ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم مجھے جانتے ہو۔"

"پکے کام کرتے ہیں چاند ستارے۔ آپ لوگ ہی تو ہمارے مائی باپ ہو۔ ہماری عزت آبرو تو آپ ہی کے پیروں تلے ہوتی ہے۔ آپ خوش تو جہاں خوش۔"

"کیا جانتے ہو میرے بارے میں۔" شاہ میر نے کہا۔

"فائل نکلوالیا ہے آپ کا۔ شہر کے چھ خطرناک افسروں میں سے ایک۔ یہ آپ کا فائل ہے' آپ کے یہاں آنے کے بارے میں خبر ملی تو ہم نے آپ کا فائل نکلوالیا۔" اس نے سامنے رکھا فائل کھول کر شاہ میر کے سامنے رکھ دیا اور شاہ میر دلچسپی سے اس پر جھک گیا۔ اس کے بارے میں تفصیل درج تھی' کون کون سے تھانوں میں اس کی تعیناتی ہوئی۔ کون کون سے مجرموں کو پکڑ کر سزا دلوائی۔ اس کا پاسپورٹ سائز کا فوٹو بھی اس تفصیل کے ساتھ تھا۔

"ویری گڈ..." اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"غلط کام بھی صحیح طریقے سے کیا جائے تو مشکلیں کم ہوتی ہیں چاند ستارے۔ ہوش میں رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم سے کوئی شکایت ہوئی ہے تو بتاؤ۔"

"ایک چھوٹا سا کام تھا تم سے چاند خان۔ کچھ معلومات کرنی ہیں۔"

"حاضر ہیں۔ حکم کرو۔" چاند خان بولا اور شاہ میر نے وہ تصویر نکال کر اس کے سامنے کردی۔

"ان لوگوں کے بارے میں پوری تفصیل چاہیے مجھے۔ چاند خان نے وہ تصویر دیکھی اور یوں لگا جیسے اس کا رنگ بدلا ہو۔" پھر اس نے کہا۔

"بہت بڑے لوگ ہیں یہ۔ بادشاہ لوگ ہیں۔ یہ جو بندہ ہے' یہ والا۔" اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ نادر شاہ ہے' دوسرے معنوں میں وہ جس نے آدھی ریل کاٹ کر رکھ دی تھی۔ ویسے ہم سمجھ گئے افسر جی۔ آپ اس لڑکی دردانہ کے قتل کی تفتیش کررہے ہونا۔ لال پل پر قتل ہوئی تھی۔"

"گڈ... کافی معلومات ہیں تمہاری۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل کررہے ہیں۔ اگر آپ انہیں نہیں جانتے تو بتادیں کہ بہت بڑا گروہ ہے۔ باہر کی دنیا میں اس کا کہاں کہاں سے تعلق ہے' یہ نہیں معلوم' لیکن اندر یہ خاصا طاقت ور ہے۔ ہر طرح کی مشکلوں سے آسانی سے نپٹ لیتا ہے۔ لڑکی کے بارے میں پتا چلا ہے کہ آؤٹ ہورہی تھی۔ نادر شاہ نے اس کی چھٹی کردی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا۔" شاہ میر کا لہجہ خشک ہوگیا۔

"بندے آتے رہتے ہیں۔ ہمیں سپلائی ان ہی سے

ملتی ہے اور خبریں بھی وہی سنا دیتے ہیں۔ ویسے چاند ستارے معاف کرنا وقت برا ہے۔ الٹی سیدھی تحقیق کرکے کیس داخل دفتر کردو۔ بلاوجہ خطرے مول نہ لو۔ اس کے لیے ہم تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔"

شاہ میر نے گردن جھکائی، پھر بولا۔ "بات تو تمہاری ٹھیک ہے چاند خان۔ مگر تم کیسی مدد کی بات کررہے ہو۔"

"نادر شاہ تک یہ خبر ہم پہنچادیں گے کہ تم بھی اس سے تعاون کرنے والوں میں سے ہو۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔" شاہ میر مسکرا کر بولا اور چاند خان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ چاند خان کام کا آدمی ہے۔ وہ لوگ جو بھی ہیں چاند خان ان کا چہرہ ہے۔ رہیں جہاں تک چاند خان کی دوسری باتیں تو پولیس جب اپنے فرائض کی بجا آوری کا حلف اٹھاتی ہے تو... سب سے پہلے اپنی جان کے نذرانے کا فیصلہ کرتی ہے، جو وطن کی بقا کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی بااثر لوگوں کے خلاف کام کرنے کا مزا ہوتا ہے۔ جو قانون کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ رہی بات چاند خان کی تو اس پر کوئی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا جارہا' وہ کار کو مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ لیکن اس دوران اس کا ذہن بے چاری دردانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ آبرو باختہ نہیں تھی، لیکن اس نے اپنے گھر کی پرورش کے لیے ان برے لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا۔

شاہ میر کا دل چاہا کہ کہیں بیٹھ کر چائے پیے۔ تھوڑی دور جاکر اس نے ایک ریستوران کے سامنے کار روک دی۔ پھر وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے ہی والا تھا کہ کار کی عقبی سیٹوں کے پاس سے ایک آواز سنائی دی۔

"اجازت ہو تو میں بھی اتر آؤں۔"

شاہ میر سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے کار کی عقبی سیٹوں پر نگاہ ڈالی تو اسے ایک شخص نظر آیا۔ جو سیٹوں کے نیچے سے ابھر رہا تھا۔ شاہ میر کو پورے سفر کے دوران کار میں کسی کی موجودگی کا شائبہ نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ سب بہت عجیب لگا تھا۔ وہ شخص جلی جلی سی شکل کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

شاہ میر کے ساتھ وہ بھی نیچے اتر آیا۔

"سر... یہ جو میں نے کیا ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن یوں سمجھ لیں میں آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔"

"کار میں کیسے داخل ہوئے۔" شاہ میر سانپ کی طرح پھنکارا۔

"لاک کھول کر، میں لاک ماسٹر ہوں۔"

"لاک خراب تو نہیں ہوا۔"

"ذرا سی خرابی ہوئی تو اپنے ہاتھوں سے ناک کاٹ کر آپ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"کیا چاہتے ہو۔"

"تھوڑا سا وقت۔ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

منفرد شخصیت کا انسان تھا۔ پھر جس طرح شاہ میر کی کار میں آگیا تھا وہ بھی بہت خطرناک بات تھی۔ کوئی ایسا شخص بھی ہوسکتا تھا جو اسے نقصان پہنچا دیتا۔ پولیس کے دشمنوں کی کمی نہیں ہوتی۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "اس طرح آپ سے ملاقات کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کچھ لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا۔"

"کیا چاہتے ہو۔" شاہ میر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"آؤ۔" شاہ میر لاپروائی سے آگے بڑھ گیا۔ ویسے وہ ہوشیار بھی تھا۔ دونوں ریستوران میں داخل ہوگئے۔ یہاں زیادہ لوگ نہیں تھے شاہ میر' ایک میز کے قریب پہنچا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص کھڑا رہا تھا۔

"بیٹھو" شاہ میر بولا۔

"شکریہ..." وہ بیٹھ گیا۔ "میرا نام روشن خان ہے۔"

"ہاں... بولو کیا چاہتے ہو؟"

"کڑک سی چائے پینا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا اور

شاہ میر نے بے اختیار مسکراہٹ روکی۔ پھر اس نے ویٹر سے چائے لانے کے لیے کہا اور روشن خان کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ "تمہاری کار میں داخل ہونا میرے لیے بالکل مشکل نہیں ہوا۔ میں ایک ماہر نقب زن ہوں۔ ہر طرح کی تجوری آسانی سے توڑ لیتا ہوں۔ کوئی تالا کھول لینا اور میرے لیے معمولی بات ہے۔ ساری زندگی یہ ہی سب کیا ہے۔ مگر دھت تیرے کی۔ انسان کچھ بھی کرے۔ اس کی ضرورت بھی پیٹ اور تن ہے۔"

"یہ بات کرنا چاہتے تھے۔" شاہ میر نے سخت لہجے میں کہا۔

"سوری سوری آفیسر۔ کار میں ایسے گھسنا مجبوری تھی۔ وہ کتے کا پلہ بہت چالاک ہے۔ اس نے تمہارے نکلنے کے بعد تمہیں یوں ہی نہ چھوڑ دیا ہوگا۔ نگرانی ضرور کی ہوگی۔"

"کون؟"

"اسی سورج خان کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"اس سے زیادہ کمینہ شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا۔ اس کا اصول ہے کہ پہلے دوستی کرو اور دوستی نہ ہو سکے تو دشمنی کرو۔ وہ سانپ ہے 'پورا سانپ' بلکہ اس سے بھی زیادہ زہریلا۔ خیر مجھے اس سے غرض نہیں میرا مشن اور ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نادر شاہ سے میری بھی دشمنی ہے۔"

"نادر شاہ کو جانتے ہو۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے گرم چائے کے گھونٹ بڑے سکون سے لیتے ہوئے کہا۔

"کون ہے یہ؟"

"منشیات کا بہت بڑا سپلائر.... لیکن وہ سربراہ نہیں ہے۔ ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور ہاتھ بے حد لمبے۔ مگر انہوں نے ایک بس کیڑے سے پنگا لیا ہے۔ چھوٹے سے کیڑے سے، جس نے اب تک ان کے چھ کتے مار دیے ہیں۔ مگر چھ سے کیا ہوتا ہے، چھتیس تو ہونے چاہئیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"تمہاری نادر شاہ سے دشمنی ہے۔"

"اس کے پورے گروہ سے۔ چھ بندے ختم کر چکا ہوں، اس کے گروہ کے۔ مگر ابھی کیا ہے۔ آگے دیکھئے گا وہ.... آگے دیکھے گا.... اور چائے لے لوں۔" اس نے چائے دانی کی طرف لالچی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"ہاں...." شاہ میر نے کہا۔ "دشمنی کی وجہ کیا ہے۔"

"وہ نہیں بتاؤں گا۔"

"میری گاڑی میں کیوں گھسے تھے۔"

"تمہاری اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔"

"کیسے۔"

"بس یہ میرا فن ہے۔ بس کھڑا ہوں میں، زیر کی پوٹ۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"دوستی۔"

"کیوں؟"

"کچھ لو، کچھ دو۔ میں تمہارے لیے بہت کام کا ثابت ہو سکتا ہوں۔ جنگلی بھینسے سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ عقل مند زیادہ نہیں ہوں، لیکن قسمت کا دھنی ہوں۔ دشمنوں سے عموماً بچ جاتا ہوں۔ نادر شاہ کے چھ بندے قتل کر چکا ہوں اور ابھی بہت سے قتل کروں گا۔"

"نادر شاہ نے ابھی ایک لڑکی کو قتل کیا ہے۔"

"دردانہ کو...." روشن خان نے تاسف سے کہا۔ اور شاہ میر کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

"ہاں.... تم اسے جانتے تھے۔"

"معصوم سی بچی تھی۔ اسے پھانسا گیا تھا۔ اپنے حالات کا شکار تھی۔ محبت کرتی تھی کسی سے۔ انہوں نے اس کے محبوب کو مار دیا، بس مخالف ہوگئی اور جان دے بیٹھی۔"

کیا انکشاف ہوا تھا۔ پتا نہیں، ریاض احمد کے گھر والوں کو اور اسے دردانہ کے محبوب کے بارے میں معلوم تھا یا نہیں۔ خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

”تمہیں نادر شاہ کے ٹھکانوں کے بارے میں معلوم ہے۔“
”ایسے لوگوں کا کوئی ایک ٹھکانا کہاں ہوتا ہے سر جی۔ ویسے پھول گڑھی میں اس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔“ بظاہر وہ ایک چھوٹا سا خوب صورت قصبہ ہے‘ لیکن بس یوں سمجھ لیں انٹر نیشنل ہے۔ بڑی بڑی ڈیل ہوتی ہیں وہاں سے۔۔۔“
شاہ میر الجھن میں پڑ گیا۔ پھول گڑھی کے بارے میں کچھ کہانیاں اس کے علم میں بھی آئی تھیں‘ لیکن یہ شخص کافی کام کا معلوم ہوتا تھا۔ خاص طور سے نادر شاہ کے سلسلے میں اس سے کام بھی لیا جا سکتا تھا۔
”میں دردانہ کے قتل کے سلسلے میں کام کر رہا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔
”مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ میں تمہارا ساتھ ساتھ دے سکتا ہوں۔ مجھے بھی اس کی موت کا غم ہے۔“
”تم نے مجھے یہ نہیں بتایا‘ روشن خان کہ تمہاری نادر شاہ سے کیا دشمنی ہے‘ لیکن تمہیں اس سے متعلق لوگوں کے بارے میں بھی بڑی معلومات ہیں۔ جیسے دردانہ کے بارے میں۔ چاند خان کے بارے میں۔“
”ویسے ہی تو چھ زخم نہیں لگا دیے‘ نادر شاہ کے دل میں۔ جن چھ بندوں کو میں نے قتل کیا ہے سر جی وہ اس کے دل کے ٹکڑے تھے۔“
”تم ایک پولیس افسر کے سامنے اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کر رہے ہو۔ میں تمہیں پکڑ کر لے جاؤں اور الٹا لٹکا کر مار لگاؤں اور پوچھوں کہ بتاؤ وہ لوگ کون تھے اور تم نے اسے کیسے قتل کیا۔“
”صورت سے ہی پاگل نظر آتا ہوں صاحب جی۔ ثابت کر دوں گا کہ پاگل ہوں اور پاگل پن میں بکواس کرتا رہتا ہوں۔“ اس نے کہا اور شاہ میر کو ہنسی آ گئی۔
”یہ نہیں بتاؤ گے کہ نادر شاہ سے تمہاری دشمنی کیوں ہے۔“
”نہیں۔“
”تم نے میری مدد کا وعدہ کیا ہے۔“
”میں تیار ہوں۔“
”میرے ساتھ پھول گڑھی چلو گے۔“
”دل جان سے۔“
”کہاں رہتے ہو۔“
”زمین کے اوپر‘ آسمان کے نیچے۔“
”گویا اپنا پتا نہیں بتاؤ گے۔“
”نہیں۔“
”پھر مجھے کہاں ملو گے۔“
”تھانے بھی آ سکتا ہوں۔ اس ہوٹل میں بھی مل سکتا ہوں جب وقت دو گے۔“
”موبائل ہے تمہارے پاس۔“
وہ ہنس پڑا‘ پھر بولا۔ ”موبائل کس کے پاس نہیں ہوتا۔ پھر اس نے اپنا موبائل نمبر دیا‘ اس کے بعد دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔“



زمان شاہ اور صفورا گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاہ میر انہیں اب تک کی کارروائی کے بارے میں بتا چکا تھا اور انہیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔
”اس کا نام پہلے کبھی نہیں سنا سر جی۔۔۔ لیکن پھول گڑھی میں ہونے والے کچھ واقعات میڈیا پر سنے اور دیکھے ہیں۔ دو بندوں کے قتل کا ایک واقعہ ہوا تھا‘ جنہیں سیکڑوں بندوں کی موجودگی میں ڈنڈے مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ یہ کام کچھ بااثر لوگوں نے کیا تھا۔ بعد میں پتا ہی نہیں چلا کہ ان کا کیا ہوا۔“
”لیکن آپ سرکاری طور پر وہاں کیوں نہیں جاتے سر۔“ صفورا نے بے چینی سے پوچھا۔
”سرکاری طور پر ہی جا رہا ہوں صفورا‘ لیکن کوئی بنیاد تو ہو۔ وہاں جا کر حالات کا جائزہ تو لوں۔ ویسے میں نے آئی جی صاحب سے ایک خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا ہوا ہے‘ جس سے ہر جگہ ضرورت پڑنے پر مجھے پولیس کی مدد حاصل ہو سکتی ہے۔“
تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس کے بعد شاہ میر نے روشن خان سے رابطہ کر کے اسے اسی ہوٹل پہنچنے کے

لیے کہا‘ جہاں انہوں نے چائے پی تھی۔ روشن خان تر و تازہ نظر آرہا تھا۔ پھول گڑھی کے راستے میں سفر کرتے ہوئے شاہ میر نے روشن خان سے پوچھا۔

”روشن خان.... تم کہتے ہو کہ تمہارا مشن نادر شاہ کے گروہ کے افراد کو چن چن کر ختم کرنا ہے تو تم نے چاند خان کو کیوں چھوڑا ہوا ہے‘ وہ بھی نادر شاہ کا بندہ ہے۔“

”ایک تالا ہوتا ہے سرجی‘ اس کی ایک چابی ہوتی ہے۔ چابی کو تو سنبھال کر رکھنا ہوتا ہے کیونکہ اس سے تالا کھلتا ہے۔ بہت سی معلومات مجھے اسی سے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ میری چابی ہے۔“

”بات وہیں آجاتی ہے کہ تمہیں اس کے گروہ سے دشمنی کیوں ہے۔ ویسے تم نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟“

”سرجی‘ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ آپ پولیس والے یہ سمجھتے ہو کہ آپ ہی کے پاس مجرموں کے ریکارڈ ہوتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ جو بڑے کام کرتے ہیں سب سے پہلے یہ تلاش کرتے ہیں کہ ان کے راستے کی رکاوٹ کون کون بن سکتا ہے۔ ان رکاوٹوں کو وہ اپنے ریکارڈ میں رکھتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو لارڈ تمہارا ریکارڈ بھی صرف چاند خان کے پاس ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سوں کے پاس ہے۔“

”تمہارے پاس بھی۔“ شاہ میر نے مسکرا کر کہا۔ اسے اس انکشاف سے بہت مزا آیا تھا۔

”ہاں.... میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں بھی بہت کچھ کرتا تھا۔ تمہارے ہی دور کی بات ہے‘ زیادہ پرانی نہیں۔“

”اور اب.... اب تم شریف آدمی بن گئے ہو۔“ شاہ میر نے کہا۔

”شریف آدمی....“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”دیکھو.... جرم کرنے والوں کا کا نیٹ ورک زیادہ اچھا ہوتا ہے یا پولیس کا۔ میں بہت عرصہ سے تمہارے بارے میں جانتا ہوں۔ مگر تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”چلو اب بتا دو.... اب تو ہم دوست ہیں اور مل کر کام کر رہے ہیں۔“ شاہ میر نے کہا اور وہ ہنس پڑا‘ پھر بولا۔

”نہیں افسر صاحب! تم میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں جان سکتے۔ کبھی نہیں جان سکتے۔ شاید میری موت کے بعد بھی نہیں۔“

”چلو چھوڑو.... اب یہ بتاؤ پھول گڑھی پہنچ کر ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“

”جاسوسی.... میں وہاں جا کر تمہیں نادر شاہ کے بہت سے ٹھکانوں اور اس کے آدمیوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا تمہیں‘ پکا وعدہ‘ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہماری یہ دوستی ختم ہو جائے گی۔“

”کیسا وعدہ۔“

مجھے جب بھی موقع ملا میں اس کے بندے مار دوں گا۔ میری زندگی کا یہی مشن ہے۔ تم مجھے اس سے نہیں روکو گے۔ اس کے بدلے میں تمہارے سارے کام کروں گا۔

شاہ میر خاموش ہو گیا۔ وہ قانون کا رکھوالا تھا۔ مجرم کوئی بھی ہو‘ کتنا ہی خطرناک ہو‘ اسے گرفتار کر کے قانون کے حوالے کرنا اس کا فرض تھا۔ اپنی نگاہوں کے سامنے قتل کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا تھا۔

”میں کسی کو تمہاری نظروں کے سامنے ہلاک نہیں کروں گا‘ یہ میرا وعدہ ہے۔“ روشن خان اس کی کشمکش کو سمجھ گیا تھا۔

پھول گڑھی دارالحکومت سے زیادہ دور نہیں تھا‘ لیکن شاہ میر یہاں پہلی بار آیا تھا۔ بہت بارونق اور صاف ستھرا قصبہ تھا۔ حالانکہ کوئی اہم جگہ نہیں تھی‘ لیکن بہت ہی اعلا قسم کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ ایک خوب صورت سا ہوٹل منتخب کر کے انہوں نے اس میں ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ وہ روشن خان کو اپنے ساتھ وہیں رکھنا چاہتا تھا۔ صفورا نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں روشن خان نے شاہ میر کے لیے جال نہ بچھا دیا ہو۔ ممکن ہے وہ نادر شاہ کے لیے ہی کام کر رہا ہو اور شاہ میر کو پھانس کر پھول گڑھی لانے کی

ذمے داری اسے دی گئی ہو۔ لیکن شاہ میر نے اسے تسلی دے کر کہا تھا کہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھے گا۔
کچھ وقت آرام کرنے کے بعد شاہ میر نے کہا۔
”اب ہمیں نادر شاہ کو تلاش کرنا ہے، تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کرسکتے ہو۔“
”میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں سے نادر شاہ کے موجودہ ٹھکانے کا پتا چل سکتا ہے۔“
”پھول گڑھی میں اس کی کیا حیثیت ہے۔“
”بادشاہ نہیں ہے وہ یہاں کا، لیکن اس کا گروہ یہاں پھیلا ہوا ہے۔ تم نے یہاں کی رونق یہ عالی شان ہوٹل دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا۔ یہ سب ہوٹل مقامی لوگوں کے نہیں ہیں، بلکہ انہیں غیر ملکی مہمانوں کے لیے بنایا گیا ہے اور یہ غیر ملکی مہمان کون ہوتے ہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“
پھر تیاریاں کرکے شاہ میر روشن خان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ دلچسپی سے باہر کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ پھول گڑھی کے بارے میں اسے یہ اطلاعات نہیں تھیں کہ وہ اس قدر ماڈرن قصبہ ہے۔ روشن خان نے ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو پتا بتا دیا۔ تھوڑے سے سفر کے بعد ٹیکسی رک گئی۔ بھرا پرا علاقہ تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے روشن خان نے کہا۔
”ایک اور درخواست کرنا چاہتا ہوں شاہ صاحب! آپ نادر شاہ کے لیے جو کر رہے ہو، کرو۔ میرے کام میں کوئی رکاوٹ مت ڈالنا۔ میں کسی کو قتل نہیں کروں گا۔“
شاہ میر نے خاموشی اختیار کی تھی۔ ایک پیچ در پیچ راستے سے گزر کر وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ پھر اس نے دروازے پر لگی بیل دبائی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ وہ ایک تیس بتیس سال کی عورت تھی۔ خوب صورت نقوش کی مالک تھی۔ اس نے بھنویں سکوڑ کر روشن خان کو دیکھا ہی تھا کہ روشن خان نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اسے دھکا دے کر اندر داخل ہوگیا۔ اس کی حرکت پر۔ شاہ میر خود دم بخود رہ گیا تھا۔ لیکن روشن خان پر پتا نہیں کیا جنون طاری ہوگیا تھا۔ عورت کو دھکا دے کر وہ اندر داخل ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے روشن خان نے اس کے خوب صورت بال مٹھی میں جکڑ کر اس کی گردن موڑ دی۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اس نے عورت کا منہ نوچ لیا تھا۔ شاہ میر بھی بادل ناخواستہ اندر داخل ہوگیا۔ تو روشن خان نے اسی طرح عورت کو دبوچے ہوئے کہا۔
”دروازہ بند کردو۔ مجھے پتا ہے اندر اور کوئی نہیں ہوگا۔“
شاہ میر نے دروازہ بند کردیا۔ لیکن اسے روشن خان کا یہ عمل ناگوار گزر رہا تھا۔ دوسری طرف عورت بری طرح جدوجہد کر رہی تھی۔ اب روشن خان نے عورت کو اسی طرح اندر کی طرف گھسیٹنا شروع کردیا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک بڑے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اسی وقت روشن خان کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور عورت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے شاید موقع ملنے پر روشن خان کے ہاتھ میں کاٹ لیا تھا۔ روشن خان کی گرفت سے نکلنے کے بعد عورت نے باہر بھاگنے کے بجائے روشن خان پر حملہ کردیا۔ اب دونوں میں شدید جدوجہد ہونے لگی۔ روشن خان عورت پر بھاری پڑ رہا تھا۔ لیکن عورت بھی لڑائی بھڑائی کی ماہر تھی۔ اسی وقت شاہ میر آگے بڑھا۔
”ختم کرو روشن خان تم دونوں الگ ہوجاؤ۔“
”یہ بلی پنجے مار مار کر میری شکل خراب کردے گی۔“ روشن خان نے مسخرے پن سے کہا۔
”الگ ہوجاؤ۔“ شاہ میر کے لہجے میں عجیب سی غراہٹ تھی۔ عورت اور روشن خان دونوں ہی ٹھٹک گئے۔ اور شاہ میر کو دیکھنے لگے۔ پھر عورت نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔
”میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ.... یہ.... کون ہو تم۔ کیا بات ہے۔“
”وہ بتا دیا جائے گا۔ تم دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹ جاؤ۔“ شاہ میر بولا اور دونوں نے اس پر عمل کیا۔

کمرے میں ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔
شاہ میر کے لہجے سے دونوں مرعوب ہو گئے تھے۔
پھر عورت نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اس نے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا تھا۔“
”تم لوگ کون ہو۔ کیا یہاں لوٹ مار کرنا چاہتے ہو۔“
”ہاں.... ہم تمہیں لوٹ کر لے جائیں گے۔“ روشن خان نے کہا۔
”کیا چاہتے ہو تم لوگ۔“ عورت نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
”نادر شاہ کہاں ہے۔“ روشن خان نے پھنکار کر کہا۔ عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
”کک کون نادر شاہ؟“
”بتاتا ہوں۔“ روشن خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک آٹھ انچ کے پھل والا چاقو نکال لیا اور شاہ میر کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”اس کی زبان صرف یہ چاقو کھلوا سکتا ہے برادر.... مجھے معاف کرنا یہ ضروری ہے۔“
عورت خوف زدہ انداز میں ایک دیوار سے ٹک گئی تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ روشن خان کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ کر ڈالے گا۔ وہ عورت کے قریب پہنچا تو وہ جلدی سے بولی۔
”یقین کرو، مجھے نہیں معلوم۔“
دوسرے لمحے روشن خان نے دوبارہ اس کے بال پکڑ لیے اور شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سوری ماسٹر....“ پھر اس نے چاقو کی نوک عورت کے حلق پر رکھی اور بولا۔ ”نادر شاہ کہاں ہے۔“
چاقو اس طرح رکھا گیا تھا کہ عورت کی گردن سے خون کی ایک لکیر نیچے کی طرف ڈھلکنے لگی۔ ”آخری بار.... اس کے بعد یہ پوری طرح تمہاری گردن میں گھس جائے گا۔“
”میری.... میری بات سنو۔ اگر میں نے کچھ بھی بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“
”اس میں کچھ وقت لگے گا۔ میں یہ کام ابھی کر دوں گا۔“ روشن خان کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔
”میرے بال تو چھوڑو۔ آہ! میں مر جاؤں گی۔ میری گردن۔“
”میں اسے کاٹ کر دور پھینک دوں گا۔“ روشن خان نے اس کے بال چھوڑ دیے، لیکن چاقو پیچھے نہیں ہٹایا۔
”وہ قادر پور گئے ہیں، قادر پور گودام.... بس مجھے اتنا معلوم ہے اور کچھ نہیں۔“
”کیسے گئے ہیں؟“
”کار میں۔“
”کب....؟“
”کل رات....“
”ساتھ کون ہے؟“
”وہی تینوں جو اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔“
”نادر شاہ بھی ہے؟“
”ہاں....“
”تمہیں معلوم ہے دردانہ قتل کر دی گئی۔“
”ہاں....“ وہ بے اختیار بولی۔ لیکن پھر اس نے خوف زدہ انداز میں زبان بند کر لی۔
”نہیں.... جب تک بولتی رہو گی، زندہ رہو گی۔ ہمارا کام پورا ہو گیا تو.... تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے ورنہ۔“
”مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔“
”دردانہ کو کیوں قتل کیا گیا؟“
”وہ راستے سے ہٹ رہی تھی۔“
”قادر پور میں ان کے گودام کے بارے میں بتاؤ۔“ روشن خان نے کہا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پھر ایک دم چیخ کر کھول دیں۔ شاید.... روشن خان نے چاقو کا دباؤ بڑھایا تھا۔
”وہاں مغربی ٹیلوں کے دامن میں ایک پرانا چرچ ہے جو کھنڈر کی شکل میں ہے۔ وہی ان کا سب سے بڑا گودام ہے۔“
”ہوں....“ روشن خان نے کہا۔ پھر عاجزی سے بولا۔ اس سے میری پرانی دوستی ہے ماسٹر، اب مجھے اس

سے کچھ ذاتی باتیں کرنی ہیں۔ صرف دس منٹ کے لیے مجھے اجازت دے دو۔ میں ابھی باہر آتا ہوں۔ شاہ میر نے ایک لمحے سوچا۔ پھر وہ باہر نکل آیا۔

روشن خان بے حد کار آمد ثابت ہوا تھا۔ شاہ میر کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ دردانہ کے قاتلوں کے راستے پر چل پڑا ہے۔ باقی منشیات کے اسمگلروں کا معاملہ تھا تو ایسا کوئی کیس اس کے پاس نہیں تھا، لیکن دردانہ کے قتل کے کیس میں یہ منشیات فروش سامنے آ رہے تھے تو ان پر ہاتھ ڈالنا مزید خوشی کی بات تھی۔

وہ ناگواری کے انداز میں روشن خان کا انتظار کرنے لگا۔ روشن کان نے جس اوباش انداز میں اس سے اجازت مانگی تھی۔ وہ شاہ میر کو ناگوار گزری تھی۔ بے شک وہ عورت جرائم پیشہ افراد کی ساتھی تھی، وہ کوئی باکردار عورت نہیں ہوگی، لیکن روشن خان..... روشن خان دو منٹ کے بعد ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"چلیں؟" شاہ میر نے پوچھا۔

"ہاں..... لیکن تم کچھ بددل سے نظر آ رہے ہو آفیسر۔"

شاہ میر نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آگے چل پڑا۔ "تم شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں..... نہیں آفیسر میں نوجوانی میں بھی گندے کردار کا انسان نہیں رہا ہوں۔ بس میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا ہے، کسی اور برائی میں پاؤ تو ایک چھٹانک سیسہ میرے سینے میں خوشی سے اتار دینا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ ایک چیخ بھی میرے منہ سے نہیں نکلے گی، لیکن بس نادر شاہ کے دل میں اتنے سوراخ کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا دل چھلنی ہو جائے۔" وہ نادر شاہ کی داشتہ تھی۔ اس کی پسندیدہ عورت۔

"تھی.....؟" شاہ میر چونک پڑا۔

"میں نے اسے نرخرے سے پیٹ تک چیر دیا ہے، میں اسی لیے وہاں رکا تھا۔ مجھے ہر اس شخص سے نفرت ہے جس کا کوئی تعلق نادر شاہ سے ہو۔ ان ہی کو ختم کرنے کے لیے جی رہا ہوں..... ورنہ..... زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

شاہ میر اپنے اندر ضبط پیدا کرنے لگا۔ دونوں کار میں آبیٹھے۔ پھر شاہ میر نے کہا۔

"قادر پور تو یہاں سے کافی دور ہے، تم نے دیکھا ہے۔"

"دنیا دیکھنے کے سوا اور کیا کیا ہے۔ کافی لمبا فاصلہ ہے۔ اس کے آخری سرے پر ایک دوسرے ملک کا قدرتی بارڈر ہے۔ بہت عظیم الشان اور ناقابل عبور پہاڑوں نے سرحد قائم کر رکھی ہے۔ اسمگلروں کو ایسی جگہیں بہت پسند ہوتی ہیں، وہ اپنے لیے راستے نکال لیتے ہیں۔ اس کے آس پاس جنگلات بکھرے ہوئے ہیں۔"

"گویا تم اس علاقے کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو۔"

"ہاں..... بتا چکا ہوں۔ تو پھر کیا ارادہ ہے۔"

"چلیں گے۔" شاہ میر نے کہا اور روشن خان مسکرایا۔ پھر بولا۔

"عاشق ہوتا جا رہا ہوں تم پر۔ کھانے پینے اور پیٹرول کا انتظام کر کے چلیں گے۔ آس پاس کے جنگل میں تیندوے نظر آجاتے ہیں۔ ان کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔"

پھول گڑھی سے ضروری انتظامات کیے گئے، پھر دشوار گزار سفر کا آغاز کر دیا گیا۔ شاہ میر پولیس کا ایک پرجوش آفیسر تھا۔ تفتیش ایک لڑکی کے قتل کی تھی، ان دشوار ترین مراحل کو مدنگاہ رکھ کر اس تفتیش کو ہلکا بھی کیا جا سکتا تھا، کیونکہ منشیات کے اسمگلر معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہوتے، لیکن وہ مقتولہ دردانہ کے قاتلوں کے پیچھے تھا، خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔

سڑک بہت پرانی اور بے مرمت تھی۔ اس کے باوجود شاہ میر نے رفتار تیز رکھی تھی۔ آگے جا کر ایک دریا کہیں سے مڑ کر آجاتا تھا اور سڑک کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بلند و بالا درختوں کی قطاریں تھیں۔ کافی دور جا کر دریا رخ بدل گیا تھا اور اب چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آنے لگی تھیں، جن کے

باشندوں نے زبردست کاشت کر رکھی تھی۔

سفر واقعی طویل تھا، لیکن اب آسمان تاریک ہونے لگا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں بارش ہونے لگی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چوڑی پگڈنڈی ایک بستی تک چلی گئی تھی۔ بارش تیز ہوئی تو شاہ میر نے کار پکی پگڈنڈی پر اتار دی، جس کا اختتام ایک جھونپڑا ہوٹل پر ہوا تھا۔

دونوں کار سے اتر کر اندر داخل ہو گئے۔ شاہ میر نے چائے منگوائی تھی۔ گرم گرم چائے سے اٹھتی ہوئی بھاپ اور کھانے کی الٹی سیدھی چیزیں اس ماحول اور منظر میں جو مزا دے رہی تھیں، وہ لاجواب تھا۔ ایسے وقت میں اسے صفورا یاد آ رہی تھی۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چائے پینے کے بعد اچانک روشن خان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے باتیں کرتا رہا، پھر مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔

"تصدیق ہو گئی ہے۔" نادر شاہ اس وقت تار پور میں ہی ہے۔ اس کے ادھر سے گزرنے کی تصدیق ہو گئی ہے۔

"یہ لوگ اسے جانتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔" اسے کون نہیں جانتا۔

"ایک بات بتاؤ روشن خان۔" نادر شاہ سے تمہاری دشمنی کتنی پرانی ہے۔ تم نے اس کے کئی آدمی قتل کیے ہیں۔ ظاہر ہے اس نے بھی تمہیں تلاش کر کے ہلاک کرنا چاہا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ تم اس کے ہاتھ نہیں آئے۔ اب تم بھیڑیوں کی بھٹ میں جا رہے ہو، تمہیں تو وہاں بہت خطرہ ہے۔"

"ہاں وہ لوگ بھی مجھے جانتے ہیں۔"

"تمہارا مقصد صرف نادر شاہ اور اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس سے پہلے تم نے یہاں آنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"

"اس وقت ایک ببر شیر میرے ساتھ ہے اور پھر مجھے تو مرنا ہی ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ منافع کما کر اور میرا منافع یہ ہی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ بندے مار دوں۔ ویسے ایک درخواست میں تم سے کر چکا ہوں۔ وہ یہ کہ تم اپنا کام کرنا اور مجھے میرا کام کرنے دینا۔ میں ہر کام میں تمہاری مدد کروں گا اور اپنے کام میں کہیں تمہاری مدد نہیں مانگوں گا۔"

شاہ میر ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اسے روشن خان کی دیوانگی کا اندازہ تھا۔ لیکن اس نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے سوچا تھا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے وہ قانون شکنی نہیں ہونے دے گا۔ ابھی تک کسی بات سے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ روشن خیال اور نادر شاہ کے درمیان دشمنی کی وجہ کیا ہے۔ روشن خان خود بتانا نہیں چاہتا تھا۔

کار کا سفر جاری تھا۔ علاقہ خطرناک تھا۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے قطعے نظر آ رہے تھے۔ کٹی پھٹی سڑک درختوں کے بیچ میں جگہ جگہ سے مڑ جاتی تھی۔ پھر اچانک شاہ میر کو بریک لگانے پڑے۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک قیمتی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ نادر شاہ کی بی ایم ڈبلیو ہے۔" روشن خان نے آہستہ سے کہا۔

"بانٹ اٹھایا ہوا ہے۔"

"گڑبڑ ہے۔ اس کا رخ ہماری طرف ہے۔ میرے خیال میں اسے ہماری نشاندہی ہوئی ہے۔ وہ ادھر آ رہے تھے، ہمیں دیکھ لیا گیا ہے اور انہوں نے آگے جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ تم کچے راستے سے گاڑی نکال لو۔ میں تیار ہوں۔ یہ کہہ کر روشن خان نے ایک انتہائی جدید ساخت کی گن نکال لی۔ شاہ میر کو اس کا اندازہ بھی پہلے نہیں ہوا تھا۔" روشن خان پھر بولا۔ "ممکن ہے وہ مجھے نہ پہچان سکیں، کیونکہ میرا حلیہ کافی بدلا ہوا ہے۔"

شاہ میر کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس وقت ان سے بھڑنا مناسب نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ لوگ ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ شاہ میر نے گاڑی دیکھ کر پہلے ہی اپنی کار کی رفتار سست کر رکھی تھی۔ پھر اس نے ایسا انداز اختیار کیا، جیسے وہ ان کے قریب جا کر رکنا چاہتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سڑک کے نشیب بھی دیکھ لیے تھے۔ قریب پہنچتے ہی اس نے اچانک ایکسیلیٹر پورا دبایا، ساتھ ہی

اسٹیرنگ کاٹ کر کار کو نشیب میں اتارا' پھر فوراً ہی سڑک کی طرف۔ اس نے مہارت کے ساتھ کار کو سڑک پر کنٹرول کرلیا۔ گردوغبار کا بادل بلند ہوگیا تھا۔ وہ لوگ انہیں دیکھ بھی نہیں سکے۔ اور وہ ان سے دور نکل آئے۔ روشن خان نے بچوں کی طرح قلقاری ماری تھی۔ پھر وہ بولا۔

"کہا تھا نا.... ببر شیر میرے ساتھ ہے۔ اچھا اب یوں کرو' وہ کچی پگڈنڈی نظر آرہی ہے جو اس ٹیلے کے پیچھے غائب ہورہی ہے' ہمیں اس ٹیلے کے پیچھے روپوش ہونا ہے' یہ ضروری ہے۔"

شاہ میر نے اس بات سے اتفاق کیا اور کار کچے راستے پر اتار دی۔ راستہ بائیں جانب جاکر درختوں کے ایک جھنڈ میں گم ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ تیزی سے اس جگہ پہنچ گئے۔ شاہ میر نیچے اتر کر ٹائروں کے نشانات کرنے لگا۔ روشن خان نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

کافی وقت گزر گیا تھا۔ تو روشن خان نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کیا ہوا۔ کیا وہ لوگ واپس پھول گڑھی چلے گئے۔ ایسا ہوا ہے تو پھر کیا ہمارا تارپور جانا بے مقصد نہیں ہوجائے گا۔"

"تم بتاؤ کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہم تارپور چلیں اور وہاں ان لوگوں کے بارے میں معلومات کریں تو......"

"وہ لوگ اتنے لاپروا نہیں ہوسکتے کہ ہمیں نظر انداز کردیں۔ مجھے کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے' میرے خیال میں سڑک کا ایک چکر لگا کر دیکھوں۔ ویسے بھی سورج جھک چکا ہے' کچھ دیر میں اندھیرا ہوجائے گا۔ تم یہاں رکو اور ہوشیار رہو' میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

روشن خان نے انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ شاہ میر اسے اس وقت تک دیکھتا رہا' جب تک وہ نظر آتا رہا' پھر وہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہوگیا۔

شاہ میر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بڑے پراسرار حالات تھے۔ اگر نادر شاہ پھول گڑھی واپس گیا ہے تو اسے اس عورت کے قتل کا پتا چلے گا جس کے بارے میں روشن خان کا کہنا تھا کہ وہ نادر شاہ کی داشتہ ہے۔ پھر اسے اس کار کے بارے میں شبہ ہوگا اور اس کے بعد۔

شاہ میر سوچتا رہا۔ سورج چھپ گیا' درختوں پر اندھیرا اتر آیا۔ اچانک شاہ میر چونک پڑا۔ روشن خان کتنی ہی دور گیا تھا۔ اسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ اب تک اسے واپس آجانا چاہیے تھا۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اچانک اس نے ایک انسانی ہیولا دیکھا جو لڑکھڑاتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ پھر وہ واضح ہوگیا۔ روشن خان ہی تھا۔ لیکن وہ خون میں لت پت تھا۔ شاہ میر اس کی طرف دوڑا۔ قریب سے اس نے دیکھا کہ روشن خان شانے سے پنڈلی تک خون میں نہایا ہوا تھا۔ شاہ میر نے اسے سہارا دیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"شیر شکاری کا شکار ہوگیا افسر جی۔ مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔" شاہ میر اس کے زخموں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ بعد میں اس نے بتایا۔ "جب میں وہاں پہنچا تو ان کی کار وہاں نہیں تھی۔ میں نے یہ ہی سوچا کہ وہ وہاں سے چلے گئے۔ ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ پھر میں واپس پلٹا تو ایک تیندوا مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔ میں نے ٹارزن کی طرح اس سے جنگ کی اور اسے بھگا دیا' لیکن وہ بھی اپنی کچھ نشانیاں چھوڑ گیا۔"

شاہ میر کو بہت افسوس ہوا ہے۔ اس شخص کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں' اسے زندہ رہنا چاہیے۔ باقی فیصلے شاہ میر نے خود کیے تھے۔ اس نے جس حد تک ممکن ہوسکتا تھا روشن خان کی مرہم پٹی کی' پھر وہ کار کو سڑک پر نکال لایا۔ رخ تارپور کی طرف ہی تھا۔ رات پھیلتی جارہی تھی۔ شاہ میر نے کار کی رفتار بہت تیز رکھی اور آخر کار ایک آبادی تک پہنچ گیا۔ کوئی قبیلہ تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ وہی کار اس نے ایک جھونپڑا' ہوٹل کے سامنے کھڑی دیکھی' جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پھول گڑھی نہیں گئے بلکہ واپس تارپور آگئے۔ اب اس وقت کار کے لوگوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے روشن خان کے زخموں کو دیکھنا تھا۔ چنانچہ معلومات کرکے وہ ایک سرکاری ڈسپنسری پہنچا۔ وہاں سے روشن خان کے زخموں کی بینڈیج کرائی' ضروری انجکشن لگوائے۔ لیکن اسے ایک اور خبر بھی ملی۔ یہ کہ کچھ

لوگ تھوڑی دیر پہلے آئے تھے' ان میں سے ایک زخمی تھا' اس کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی۔ کار کے بارے میں بھی معلوم کیا تو اسی کار کا حلیہ بتایا گیا تھا۔

تفصیل سن کر روشن خان سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہ میر نے کہا۔ "میں اس جھونپڑا ہوٹل جا رہا ہوں۔ تم بس کار میں آرام کرو۔ اول تو تم زخمی ہو' دوسرے یہ کہ وہ تمہیں پہچانتے ہیں۔"

"اور تمہیں....." روشن خان نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے شاید نہ جانتے ہوں۔"

"اس بھول میں نہ رہو۔ تم خود مجھے بتا چکے ہو کہ ہوٹل والے بندے نے تمہارا پورا کچا چٹھا کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا تھا۔ جبکہ میرا حلیہ کافی بدل گیا ہے اور وہ آسانی سے مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔"

"آرام کرو۔" شاہ میر نے سخت لہجے میں روشن خان کی بک بک پر اسے غصہ آگیا تھا۔ پھر وہ اس چائے خانے کی طرف چل پڑا' چائے خانے میں مقامی لوگوں کا خوب رش تھا۔ شاہ میر نے ایک میز پر بیٹھ کر چائے پی اور چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا' پھر باہر نکل آیا۔ وہ کار باہر ہی کھڑی تھی اور ایک مکینک ٹائپ کا آدمی بانٹ کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ایک چارجنگ لائٹ جلا رکھی تھی۔ شاہ میر اس کے پاس پہنچا تو اس نے گردن گھما کر شاہ میر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "مستری صاحب! نادر شاہ جی کہاں ہیں۔ میں انہیں ہوٹل میں تلاش کر چکا ہوں۔ وہ وہاں تو نہیں ہیں۔"

"کون نادر شاہ جی۔"

"اس کار کے مالک۔"

"اچھا وہ شاہ جی۔ وہ تو دوسری کار لے کر چلے گئے۔ ان کی گاڑی کی وائرنگ جل گئی ہے۔"

"ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔"

"سب چلے گئے۔ مالک ہیں جی۔ تارپور کے۔ وہیں گئے ہیں۔" یہ کہہ کر کلینک پر اپنا کام کرنے لگا۔ شاہ میر ٹھنڈی سانس لے کر واپس آگیا روشن خان کار کے بانٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کاربائن اس کے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ شاہ میر نے اسے تفصیل بتائی تو وہ بولا۔

"اب....."

"چلو اندر بیٹھو۔ اب یہاں رکنے سے کیا فائدہ۔"

راستے میں روشن خان نے کہا۔ "ایک بات کہوں چیف' تم بھی کھسکے ہوئے ہو۔ ایک غریب سی لڑکی قتل ہو گئی' اس کے قاتل روپوش ہیں' بات ختم ہو گئی' کیس داخل دفتر' مگر تم نے جان ہتھیلی پر رکھ دی ہے۔"

شاہ میر نے کوئی جواب نہیں دیا' خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ رات کافی گہری تھی۔ بادل برسنے کے لیے تیار تھے۔ سڑک بھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ اسی حالت میں کار چلانا آسان نہیں تھا۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ بارش کیا طوفان تھا۔ سڑک کے گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ مجبوراً شاہ میر کو کار روکنی پڑی۔ "ان لوگوں کے لیے بھی سفر آسان نہیں ہوگا۔" روشن خان نے کہا۔ پھر بولا۔ "شیشے چڑھا لو' بارش سے پریشان تیندوے کار میں آرام کرنے آسکتے ہیں۔ ویسے تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"دو ماں باپ' لاغر' لاچار' دو بھائی' مجبور' وہ کسی کو یہ بھی نہیں بتا رہے کہ دردانہ قتل ہو گئی ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ فحاشی کر کے پیسے لا رہی ہے۔ لیکن پوسٹ مارٹم بتا رہا ہے کہ وہ مرتے وقت تک آبرومند تھی۔ اس کے قاتلوں کو سزا اور اس کی آبرومندی کا انکشاف قانون پر قرض ہے۔ بس میں یہ قرض چکانا چاہتا ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔

اس کے بعد روشن خان کچھ نہیں بولا۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر صبح کی تیز روشنی نے انہیں جگایا تھا۔

بارش رک گئی تھی۔ اسی وقت روشن خان کی آواز سنائی دی۔

"ہم دونوں زندہ ہیں نا۔" ہائے بے چارے تیندوے' اور یہ بات سچ تھی' گاڑی کے شیشوں پر تیندوں کے کیچڑ بھرے پنجوں کے نشان تھے۔ ان پر تبصرہ ہوا۔ پھر ناشتا کرنے کے بعد شاہ میر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ آگے بلندیاں تھیں' جب یہ بلندیاں ختم

ہوئیں تو نشیب میں ایک طوفانی نالہ نظر آیا جو رات کی بارش کے بعد بری طرح بپھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ قرب و جوار میں شدید کیچڑ ہو رہی تھی' لیکن شاہ میر ایک دم چونک پڑا تھا۔ خاصے فاصلے پر دلدلی راستے میں ایک کار پھنسی ہوئی تھی۔ روشن خان نے بھی اسے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''وہی ہیں.... سو فیصدی وہی ہیں' اوہ.... وہ دیکھو' وہ نادر شاہ ہے۔ وہ لمبے قد والا۔''

شاہ میر انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''تعجب ہے' یہ لوگ دن رات ان راستوں پر سفر کرتے ہیں' پھر بھی یہاں کی مشکلات کا انہیں علم نہیں۔''

''کسی خاص ہی مشکل کا شکار نظر آتے ہیں۔''

یہ لوگ بڑے محتاط انداز میں ان کی کارروائیاں دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ ٹائروں کے نیچے گھاس پھونس رکھ رہے تھے۔ پھر ایک شخص نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھایا' دوسرے دو پیچھے سے دھکا لگانے لگے۔ ٹائر پوری قوت سے گھومے اور کیچڑ کا طوفان بلند ہو کر دھکا لگانے والوں پر لپکا۔ کار تیزی سے آگے بڑھی' لیکن پھر پیچھے آئی اور دھکا لگانے والوں میں سے ایک پوری طرح اس کے پہیوں کی زد میں آگیا۔ کار کے دونوں ٹائر اس کے چہرے اور پیٹ پر سے گزر گئے۔ اس کی چیخ ابھری اور روشن خان کا قہقہہ....

''ایک اور گیا سرا!''

ان لوگوں میں افراتفری پھیل گئی۔ اور وہ اپنے ساتھی کو کار کے نیچے سے گھسیٹنے لگے۔ جو شخص اسٹیئرنگ پر تھا وہ بھی نیچے اتر آیا تھا اور کار کے نیچے دبے شخص کو باہر کھینچ رہا تھا۔ کار کے نیچے سے نکالے جانے والا شخص بری طرح تڑپ رہا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ سرد ہو گیا۔ اسی وقت ایک اور عمل ہوا۔ اچانک لمبے قد والے نے پستول نکالا اور ڈرائیونگ کرنے والے کی کنپٹی پر نال رکھ کر گولی چلادی۔

''اومائی گاڈ۔'' شاہ میر کے منہ سے نکلا۔

''وہ کسی درندے سے زیادہ وحشی ہے۔'' روشن خان نے کہا۔

نادر شاہ نے خود جھک کر مرنے والے دونوں افراد کی جیبوں کی تلاشی لی' پھر خود اسٹیئرنگ پر جا بیٹھا۔ اس نے پوری مہارت سے گاڑی کیچڑ سے نکال دی۔

اس کا بچ جانے والا ساتھی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ شاہ میر خاموشی سے گاڑی کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ روشن خان نے کہا۔ دو مر گئے۔ جب ان میں سے کوئی کم ہوتا ہے شاہ جی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ لوگ نہ جانے کتنوں کو مار چکے ہوں گے۔ انہیں ایسے ہی مرنا چاہیے۔

''نہیں روشن خان۔ کسی بھی مجرم قاتل کو پھانسی کے پھندے پر موت کی سزا پاتے دیکھ کر مجھے کوئی افسوس نہیں تھا' لیکن انسان پھر بھی انسان ہوتا ہے۔''

''یہ زہر بیچتے ہیں۔ ان میں سے ہر بندہ نہ جانے کتنوں کا قاتل ہوتا ہے۔'' روشن خان نے کہا۔ شاہ میر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کار کے اسٹیئرنگ پر آبیٹھا۔ پھر اس نے کار آگے بڑھادی۔ کافی راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ پھر دور سے ایک کچی دیوار نظر آنے لگ تو روشن خان بولا۔ ''ہم تارپور آگئے ہیں۔ یہ فصیل ہے' جو قلعہ تارپور کے گرد احاطہ کرتی ہے۔ اس کے اندر تارپور کی وسیع آبادی ہے۔''

''ہمیں ان کی تلاش میں مشکل ہوگی۔'' شاہ میر بولا۔

''نہیں.... مجھے ان کے کافی ٹھکانے معلوم ہیں اور پھر اس عورت نے پرانے چرچ کے بارے میں بتایا تھا۔''

''یہاں قیام کے لیے کوئی جگہ مل سکے گی۔''

''چھوٹے چھوٹے سرائے نما ہوٹل ہیں۔ میرے خیال میں یہاں بھیڑ جمع کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔''

روشن خان کا خیال ٹھیک تھا۔ انہیں ایک سرائے میں جگہ مل گئی۔ ''تم میرے زخموں کی فکر نہ کرنا افسر جی۔ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''تم آرام کرو۔'' شاہ میر نے کہا۔ روشن خان کے

سو جانے کے بعد اس نے صفورا کو فون کیا' لیکن سگنل ہی نہیں تھے۔ بہت دیر تک کوشش کرنے کے بعد بھی ناکامی ہی ہوئی تھی۔

دوسرے دن روشن خان تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ سرائے کے بالکل نیچے ایک پرائیویٹ کلینک تھا' جہاں ایک ڈاکٹر نے روشن خان کو دیکھا اور فوراً بولا۔

"تیندوے نے جھنجوڑا ہے۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔"

"میں علاج ہی اسی کا کرتا ہوں۔ کیونکہ یہاں کے جنگلوں سے گزر کر آنے والے تیندوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اصل میں راستہ ہی ایک ہے۔ کوئی اور گزر گاہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے روشن خان کو انجکشن وغیرہ لگا کر رخصت کر دیا۔ شاہ میر اب روشن خان ہی پر انحصار نہیں کر سکتا تھا اور روشن کان زخمی بھی ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ڈیوٹی سرانجام دینی تھی۔ روشن خان سے اتنا فائدہ ہوا تھا کہ وہ ان لوگوں کے راستے پر پڑ گیا تھا جو دردانہ کے قاتل تھے اور اب ان کے بہت قریب تھا۔ اسے نادر شاہ کے بارے میں علم ہو گیا تھا کہ وہ انسانی شکل میں درندہ ہے' اس کا مظاہرہ اس نے راستے میں دیکھ لیا تھا۔

وہ سرائے سے باہر نکل آیا۔ تنگ بازار' ان میں پھنسی پھنسی دکانیں' لیکن ان دکانوں میں دنیا بھر کا بہترین سامان موجود۔ جو ظاہر ہے اسمگلنگ کا ہی تھا۔ شاہ میر ان دکانوں کو دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ پھر اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نے اس شخص کو دیکھا تو جو نادر شاہ کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ چار آدمی تھے جن میں سے نادر شاہ کے علاوہ یہ ہی زندہ بچا تھا۔

یہ شخص بھی خریداری کر رہا تھا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ شاہ میر محتاط ہو گیا' اس نے اس آدمی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اس شخص نے کچھ اور سامان خریدا' پھر ایک طرف چل پڑا۔ بازاروں کے بعد وہ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گیا جہاں بڑے اچھے گھر بنے ہوئے تھے۔ یہاں زیادہ تر تاریکی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شخص ایک گھر میں داخل ہو گیا۔ شاہ میر رک گیا تھا۔ کچھ دیر وہ وہاں کھڑا حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ پھر اس نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کے چاروں طرف چکر لگا کر اس نے اندر داخل ہونے کے لیے جگہ تلاش کی اور پھر ایک کسی قدر ٹوٹی جگہ سے اوپر چڑھ کر ایک چھت پر پہنچ گیا۔ اصطبل میں جگہ تھی' لیکن اس میں گھوڑے نہیں تھے۔ نیچے پہنچنے میں وقت نہیں ہوئی۔ اندر بے ترتیب درخت پھیلے ہوئے تھے۔ بہت وسیع احاطہ تھا' جس میں لمبی لمبی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف بہت سے کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ احاطے میں جگہ جگہ غیر استعمال شدہ اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتا آگے بڑھتا رہا۔ کئی کمروں سے روشنی جھلک رہی تھی اور وہاں انسانوں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاہ میر ایک جگہ رک گیا۔ اس نے ایک کھڑکی منتخب کی' جس سے روشنی چھن رہی تھی اور اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اندر جھانکا۔ دس' بارہ افراد اندر موجود تھے۔ وہ آدمی بھی موجود تھا جس کا پیچھا کرتا وہ یہاں تک آیا تھا۔ کھانا کھایا جا رہا تھا۔ سالم بکرا اور چاول جن کی خوشبو باہر تک آ رہی تھی۔ اس نے نادر شاہ کو بھی دیکھا۔ جو ان کے ساتھ موجود تھا۔ شاہ میر انہیں دیکھ' کھانے سے فارغ ہو کر وہ قریب قریب بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے کچھ فائل لا کر نادر شاہ کے سامنے رکھ دیے اور وہ ان پر جھک گیا۔ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر قلم ہاتھ میں لے کر بولا۔

"ابھی تک اس لڑکی کا نام اس فہرست سے نہیں کاٹا۔ دو نہیں اس میں سے یہ تین نام کاٹ دو۔"

"دردانہ کا۔" ایک شخص نے پوچھا۔

"ہاں..... کام کی لڑکی تھی۔ ننگی بھوکی آئی تھی۔ پیٹ زیادہ بھر گیا تو عشق کی سوجھی۔ خطرناک ہو گئی تھی' اس لیے راستے سے ہٹانا پڑا اور یہ دونوں..... خیر جس کی جتنی زندگی ہوتی ہے' اتنا جیتا ہے۔ میں نے یہ فائل دیکھ لیے ہیں کوئی اور مشکل تو نہیں ہے۔"

''نہیں شاہ جی۔ فائل اٹھالوں۔''

''ہاں.... لے جاؤ۔'' نادر شاہ نے کہا اور وہ شخص فائل اٹھانے لگا۔ اچانک شاہ میر کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔ اس نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور گھوم کر ایسی جگہ آگیا جہاں اس کمرے کا دروازہ تھا۔ پھر اس نے فائل لے کر باہر نکلنے والے کا تعاقب کیا تھا' جو کافی دور کے ایک کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تاریک کمرے میں روشنی ہوگئی۔ شاہ میر نے کی ہول سے آنکھ لگادی۔ تیز روشنی میں اندر کا ماحول نظر آرہا تھا۔ وہ شخص ساتھ لائے ہوئے فائل ایک الماری میں رکھ رہا تھا۔ لیکن پھر گڑبڑ ہوگئی۔ شاہ میر کو پیچھے کی آوازیں نہیں سنائی دی تھیں۔ پھر ایک آواز ابھری۔

''سیدھا ہو جاؤ' کون ہے تو' ساتھ ہی پستول کی نال شاہ میر کی کمر سے آ لگی۔ ایک غلطی ہوگئی تھی کہ اس نے پیچھے کا خیال نہیں رکھا' دوسری غلطی جان لے سکتی تھی۔ اس نے پوری مہارت سے فاصلے اور جگہ کا اندازہ کرکے پیچھے سے لات ماری اور اسے پستول سے کور کرنے والے کی کربناک چیخ نکلی۔ ساتھ ہی پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازے سے ٹکرایا۔ پھر وہ پھرتی سے پیچھے ہٹا اور اس نے ایک نپی تلی کک اس کے سر پر ماری اور اس کے حلق سے دوسری چیخ نکل گئی۔ یہ آوازیں اندر والے نے بھی سنیں اور وہ ہڑبڑا کر باہر نکلا۔ لیکن شاہ میر اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے پھرتی سے اندر سے آنے والے کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے پوری قوت سے ایک دیوار پر دے مارا۔ پھر اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا۔ یہ آوازیں اس خاموش ماحول میں اچھی طرح سن لی گئی ہوں گی اور اس طرف سے ایکشن ہونے ہی والا ہوگا۔ دو صورتیں ہیں یا تو فرار ہو کر جان بچائی جائے یا اس جدوجہد کا فائدہ حاصل کیا جائے' کیونکہ دوبارہ یہاں داخل ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ اس نے ان دونوں کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں تیز روشنی تھی اور وہ الماری کھلی ہوئی تھی جس میں فائل رکھے گئے تھے۔ ان فائلوں کے علاوہ کچھ اور فائل بھی رکھے تھے۔ شاہ میر نے جھپٹا مار کر وہ فائل اٹھائے اور دروازے کی طرف لپکا۔ وہ دونوں سنبھل چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے چیخ ماری۔

''لینا' پکڑنا۔'' شاہ میر نے اندھوں کی طرح ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں' پھر کسی نے کہا۔

''کون ہے' رکو' کیوں بھاگ رہے ہو' کون ہو' رک جاؤ' ورنہ.... رک جاؤ ورنہ....'' شاہ میر برق بنا ہوا تھا اور چیتے کی طرح زقند میں لگا رہا تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہوا' رخ گیٹ کی طرف ہی تھا۔ پھر اس نے گیٹ بھی پھلانگ لیا۔ اب ان لوگوں کو بھی احساس ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہوتی ہے۔ شاہ میر نے انہیں پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے ایک بات پر حیرت تھی' نہ جانے وہ گولی کیوں نہیں چلا رہے تھے۔

تھوڑے فاصلے پر تیز روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ بازار تھا۔ شاہ میر نے رفتار اور تیز کردی اور لمحوں میں بازار میں داخل ہوگیا۔ یہاں خوب رونق تھی۔ خریداری بھی ہو رہی تھی۔ وہ برق رفتاری سے ایک دکان میں داخل ہوگیا۔ دکان ایک بڑا اسٹور تھی جو لمبی گلی کی طرح دور تک چلی گئی تھی۔ اندر داخل ہو کر وہ دکان کے دوسرے سرے تک چلا گیا اور بڑی بے نیازی سے چیزیں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے ایک بیگ خریدا' جس میں وہ فائل آسکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ اور خریداری بھی کی اور کافی وقت وہاں گزار دیا۔ باہر کی کیفیت نہیں ہو سکی تھی۔ فائل اس نے بیگ میں رکھے اور بل ادا کرکے باہر نکل آ۔ اب وہ ایک عام آدمی کی طرح دکانیں جھانکتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن اب کوئی گڑبڑ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ کافی الٹے سیدھے راستے طے کرکے آخر کار وہ سرائے میں داخل ہوگیا۔

اب وہ پوری طرح مطمئن ہوگیا تھا۔ چنانچہ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔ روشن خان جاگ رہا تھا اور اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں تھا' لیکن تم ایک پولیس آفیسر ہو' میرے دوست نہیں

ہو، بہتر تھا جو بھی کرتے ہم دونوں مل کر کرتے۔

"تمہارا شکریہ روشن خان، لیکن میاں یہاں پکنک منانے نہیں آیا ہوں۔ تم زخمی نہ ہوتے تو اس وقت میں تمہیں بھی ساتھ رکھتا، لیکن اسے ضروری بھی نہ سمجھنا۔" شاہ میر نے سنجیدگی سے کہا۔

روشن خان اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ لہجے میں بولا۔ "وہ لوگ یہاں کے بادشاہ ہیں، یہ شہر بھی زیادہ بڑا نہیں ہے۔ وہ جہاں چاہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے، ایک طلسمی جال پھیلا ہوا ہے ان لوگوں نے یہاں ان کی سلطنت قائم ہے۔"

"ان کی سلطنت میں ہی انہیں سزا نہ دی تو بات ہی کیا ہے۔"

"کچھ نئی چیزیں ہیں تمہارے پاس کیا لائے ہو۔"

"تم آرام کرو۔" شاہ میر نے کہا اور فائلوں کا ڈھیر نکال کر بیٹھ گیا۔ پھر اس پر بہت سے انکشاف ہوئے۔ منشیات کے تاجروں میں دارالحکومت میں پھیلے ہوئے کچھ بڑے لوگوں کے نام بھی معلوم ہوئے۔ روشن خان لیٹ کر سو گیا تھا۔ شاہ میر رات گئے تک ان فائلوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر اسے سخت نیند آگئی اور وہ فائل اپنے بستر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔

نہ جانے کب تک سویا تھا کہ روشن خان نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ روشنی پھیل چکی تھی۔ اس نے چونک کر روشن خان کو دیکھا تو اس کی آواز ابھری۔ جلدی کرو چیف، ورنہ پھر کرنے کے لیے کچھ باقی نہ رہے گا۔

"کیا بات ہے۔" شاہ میر نے پوچھا۔

"وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔ تقریباً" پندرہ افراد نے ہماری کار کو گھیرا ہوا ہے۔ ان میں نادر شاہ بھی موجود ہے اور ہوٹل کے مالک سے پوچھ رہا ہے کہ ہوٹل میں کون کون ٹھہرا ہوا ہے اور یہ کار کس کی ہے۔"

"تم نے نادر شاہ کو دیکھا ہے۔"

"میں باہر نکل رہا ہوں۔ موت کی تو خیر مجھے کوئی پروا نہیں ہے، لیکن یہ میری مرضی کی موت نہیں ہوگی۔ مناسب سمجھو تو تم بھی باہر نکل آؤ۔" یہ کہہ کر روشن خان باہر نکلا۔

شاہ میر کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ وہ پھرتی سے اٹھا۔ جوتے پہنے، کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ فائل اپنی جیکٹ جس میں بہت کچھ تھا سنبھالی اور اس کھڑکی کی طرف دوڑا جس کے فریم میں سلاخیں نہیں تھیں۔ بس شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی کے دوسری طرف کودا اور برق رفتاری سے احاطے کی دیوار سے دوسری طرف کود گیا۔ دوسری طرف آکر اس نے جیکٹ پہنی، سروس ریوالور چیک کیا اور پھر طویل احاطے کا چکر کاٹ کر ہوٹل کے سامنے والے حصے کی طرف آگیا۔

کچھ لوگوں نے اس کی کار کو گھیرا ہوا تھا۔ اور پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ آس پاس کے لوگ تماش بینوں کی حیثیت سے کھڑے ہو کر یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شاہ میر بھی ان کے درمیان کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر تک وہ وہاں کھڑا ان کی کارروائیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے پیچھے ہٹ آیا۔ اس کی نظریں روشن خان کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ شاہ میر جانتا تھا کہ روشن خان چالاک آدمی ہے۔ اس وقت خطرہ سر پر تھا، اس لیے اس نے کوئی بہادری دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہی اسے بھی کرنا چاہیے۔ وہ لوگ یہاں پورا اقتدار رکھتے ہیں اور کسی بھی اجنبی کی نشاندہی میں مشکل نہیں ہوتی، اس لیے خود کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔ پیچھے ہٹ کر وہ تیز رفتاری سے چل پڑا۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے قلعے کی دیوار نظر آئی جسے وہ تاریور میں آتے دیکھ چکا تھا۔ دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے آخر کار وہ ایک عظیم الشان دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کے دوسر طرف ایک خوب صورت تالاب نظر آرہا تھا، پھر ایک سیدھا راستہ۔ راستے کے اختتام پر سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ شاہ میر کو اس وقت چھپنے کے لیے جگہ درکار تھی۔ یہاں کے بارے میں اسے معلومات نہیں تھیں، کوئی بھی بہتر جگہ مل جائے۔ سیڑھیاں عبود

کر کے قلعے کا اندرونی لق و دق حصہ نظر آیا۔ جہاں خشک پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ قلعے کی فصلیں نظر آرہی تھیں، یہ جگہ شاہ میر کو بہتر محسوس ہوئی اور وہ آگے بڑھ کر فصلوں پر پہنچ گیا، یہاں سے پورا تارپور نظر آتا تھا۔ کناروں پر پر محرابیں بنی ہوئی تھیں، جن کے نیچے عجیب سی ٹھنڈک تھی۔ شاہ میر ایک محراب کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ زندگی میں کبھی ایسے پراسرار ماحول سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ان محرابوں کے نیچے رہنے والے کسی اجنبی کی آمد سے بے چین ہو گئے ہوں۔ وہ ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے ہوں۔

خستہ حالی دیواروں میں جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ نظر آرہے تھے۔ شاہ میر کو ایک خیال آیا، اس نے ایک سوراخ کو غور سے دیکھا۔ پہلے سن گن لیتا رہا، پھر ہاتھ ڈال کر اسے ٹٹولا۔ سوراخ اس کے کام کے لیے موزوں تھا۔ چنانچہ جیکٹ کا زپ کھول کر اس نے فائل نکالے اور انہیں اس بڑے سوراخ میں پوشیدہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ان محرابوں کو گنا اور اس جگہ کو ذہن میں محفوظ کر لیا۔ یہ بڑا اطمینان بخش کام ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے آگے بڑھا اور فصیل کی بلندیوں سے تارپور کے مناظر دیکھنے لگا۔ عجیب ہیبت ناک منظر تھا۔ نہ جانے ان فصیلوں سے کس کس نے کیا کیا دیکھا ہو گا۔ پھر اسے روشن خان کا خیال آیا۔ نہ جانے کہاں ہو گا۔ دوبارہ اسے مل بھی سکے گا یا نہیں۔ نہ جانے اس کی کہانی کیا ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ہوٹل یا سرائے جانے کا تو اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نادر شاہ کو پتا چل چکا ہو گا کہ یہاں دو اجنبیوں نے قیام کیا تھا جو فرار ہو گئے۔ اب یہاں رکنا بھی بے سود تھا۔ چنانچہ اس نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس کی نظریں ایسی جگہ تلاش کر رہی تھیں جہاں اسے کچھ کھانے کے لیے مل جائے۔ پھر ایک معمولی سا ہوٹل نظر آیا اور وہ اس میں جا بیٹھا۔ چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کھاتے ہوئے اس نے سوچا کہ اب کیا، کیا جائے۔

اسے دردانہ کے قاتل کی تلاش تھی، لیکن یہاں آکر تو سارا کھیل ہی بدل گیا تھا۔ دردانہ کا قاتل ایک پورا گروہ تھا، اس سارے گروہ کو تو وہ گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔

یہ سارا دن اس نے تارپور میں بھٹکتے ہوئے گزارا۔ راستے نامعلوم تھے، لیکن شام کے جھٹپٹے اس وقت فضا میں اتر رہے تھے، جب اسے وہ گھر نظر آگیا، جہاں ان کا قیام تھا اور جہاں سے وہ ان کے قیمتی فائل لے بھاگا تھا۔ یہ انوکھا اتفاق تھا۔ شاہ میر نے کچھ دیر سوچا، پھر اس پر دیوانگی سوار ہو گئی۔ کوئی ہوش مند انسان دوبارہ بھیڑیوں کے بھٹ میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن شاہ میر اپنے مخصوص راستے سے دوبارہ اندر داخل ہو گیا۔ اندر اس کی جانی پہچانی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اب وہ اس عمارت سے کافی واقف ہو چکا تھا۔ یہ بات بھی مضحکہ خیز تھی کہ وہ سب اس کمرے میں موجود تھے۔ لیکن اب ایک اور منظر نظر آرہا تھا۔ وسیع و عریض کمرے کی چھت میں ایک بڑے کنڈے سے ایک انسانی بدن رسیوں سے لٹکا جھول رہا تھا۔ اس کے پاؤں کنڈے سے بندے ہوئے تھے اور سر نیچے تھا۔ لیکن سب سے زیادہ غم آلود بات یہ تھی کہ وہ روشن خان تھا۔ غور سے دیکھنے سے اندازہ ہو گیا کہ روشن خان اب زندہ نہیں ہے۔

شاہ میر کا دل غم و اندوہ میں ڈوب گیا۔ کون تھا روشن خان، کیا کہانی تھی اس کی، اب یہ راز کبھی نہیں کھل سکے گا۔ روشن خان کو کس طرح قتل کیا گیا ہو گا، اس کا شاہ میر کو اندازہ تھا۔ اس کی کنپٹی بڑی خراب ہو رہی تھی، عقب سے فائر ہوا اور گولی شاہ میر کے ایک فٹ آگے دروازے میں گھس گئی۔ معمولی سا نشانہ چوکا تھا، ورنہ شاہ میر شکار ہو گیا تھا۔ پھر پے در پے فائر ہونے لگے۔ شاہ میر نے ذہن پر چوٹ لگائی اور کسی تیز رفتار چھپکلی کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے آگے دوڑنے لگا۔ اس کے بعد وہ کھڑے ہو کر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن اس وقت قسمت میں اسے بچا رہی تھی۔ گولیاں اس کے دائیں بائیں سے گزر رہی تھیں اور اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دو نہیں بہت سے

لوگ ہیں' انہوں نے پوری طرح شاہ میر کی یہاں موجودگی کا اندازہ لگالیا ہے۔ اور اسے چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔

"وہ اس طرف..." ایک آواز ابھری۔

"روشنی کرو' روشنی۔" ان آوازوں کے ساتھ فائر بھی ہو رہے تھے۔ اور ہر جگہ کے بلب جلائے جا رہے تھے۔ شاید اس وقت وہ کافی تعداد میں موجود تھے اور انہوں نے بڑی مہارت سے شاہ میر کو گھیر لیا تھا۔ وہ باہر جاتا' ادھر روشنی ہو رہی تھی اور اس پر فائر کیے جا رہے تھے۔ شاہ میر بہترین تربیت یافتہ تھا اور اپنی مہارت سے بچ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے آسمان نظر آیا اور اس نے بھی چھلانگ لگا دی۔ اب وہ کھلی جگہ آگیا تھا' لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس طرف ہے۔ اس گھیرنے والے بھی ٹھیک راستے پر تھے اور اپنی جیسی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک شاہ میر کو اپنے دائیں طرف روشنی کی دو لکیریں نظر آئیں۔ کوئی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ شاہ میر سے اس کا فاصلہ تین چار گز سے زیادہ نہیں تھا۔ شاہ میر نے ایک درخت کی آڑ لے لی۔ آنے والی جیپ تھی جو گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور گیٹ ابھی کھلا ہوا تھا۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔" کسی کی آواز ابھری۔

"گولیاں چل رہی ہیں۔" دوسری آواز ابھری۔

"جاؤ دیکھو' کیا قصہ ہے۔" پہلی آواز نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔

"ہوشیاری سے کہیں تم ہی گولیوں کا نشانہ نہ بن جاؤ۔"

شاہ میر نے دیکھا جیپ سے اترنے والا جھک جھک کر آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا آدمی جیپ سے نیچے نہیں اترا تھا۔ اور وہیں سے صورت حال کا اندازہ لگا رہا تھا۔ صورت حال معلوم کرنے والا کچھ دور نکل گیا تو شاہ میر درخت کے پیچھے سے نکلا۔ پھر اس نے بدن تول کر جیپ میں چھلانگ لگائی اور اس میں بیٹھے شخص کو چھاپ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرے سے اس کا منہ بھینچ لیا۔ پھر اس نے پوری قوت سے اس کا سر اسٹیئرنگ پر دے مارا۔ اس کے شکار نے زیادہ جدوجہد نہیں کی اور سست پڑ گیا۔ شاہ میر نے مزید دوبار اس کا سر اسٹیئرنگ سے مارا اور پھر اسے جیپ سے نیچے دھکا دے دیا' اب تقدیر کی ایک اور آزمائش تھی۔ اس نے اگنیشن پر ہاتھ مارا۔ چابی اگنیشن میں ہی لگی ہوئی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور جیپ اسٹارٹ کر کے اسے ریورس کرنے لگا۔ گیٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ جیپ کو باہر لا کر اس نے اس کا رخ موڑ دیا۔ لیکن اپنے پیچھے اس نے شور سنا اور پھر عمارت میں بھی کاریں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔

اس وقت کسی راستے کے تعین کا موقع نہیں تھا اور جدھر منہ اٹھا جیپ دوڑا دی۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ پیچھے کئی گاڑیاں چل پڑی ہیں۔ وہ اندھا دھند راستے بدل رہا تھا اور اس کا تعاقب کرنے والے گولیاں برسا رہے تھے۔ کچھ دور جا کر ایک خطرناک موڑ آگیا۔ بس تقدیر ہی تھی کہ شاہ میر کو وہ موڑ نظر آگیا' اس نے بمشکل اسٹیئرنگ کنٹرول کیا اور جیپ کو کنٹرول کیا۔ موڑ مڑتے ہی اسے ایک دوشاخہ سڑک نظر آئی اور اس نے اسٹیئرنگ موڑ دیا۔ یہ بھی ایک کشادہ سڑک تھی' لیکن کچھ دور جاتے ہی قلعے کا کوئی حصہ نظر آیا' یہاں سڑک بھی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ایک طرف قلعے کی بلند دیوار' دوسری طرف کھائی جو بہت گہری اور دور تک چلی گئی تھی۔ اس وقت گولیوں کی بوچھاڑ جیپ سے ٹکرائی اور جیپ اچھلنے لگی۔ پچھلے دونوں ٹائر پھٹ گئے۔ اسے محسوس کرتے ہی شاہ میر نے پورے بریک لگائے اور جیپ کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ اچھلی اور شاہ میر نے اس سے چھلانگ لگا دی۔ جیپ کا اسٹیئرنگ مڑ گیا اور وہ کھائی میں لڑھکنے لگی۔

پھر نیچے کھائی میں ایک دھماکا ہوا اور روشنی کا کوندا ہوا۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کے بریک چرچرائے اور وہ اس جگہ رک گئیں جہاں سے جیپ نیچے گری تھی۔ شاہ میر نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اسے چھپنے کے لیے جھاڑیاں مل گئی تھیں۔ یہاں سے اس نے گاڑیوں سے اترنے والوں کو دیکھا۔ کافی لوگ تھے۔ جو کھائی کے

کنارے نیچے جھانک رہے تھے۔ ان کا سو فیصدی ہی خیال ہو گا کہ وہ جو کوئی بھی ہو گا جیپ کے ساتھ ہی کھائی میں گر گیا ہو گا۔ اس کی تصدیق ان کی باتوں سے ہو گئی۔ اسے نادر شاہ کی آواز سنائی دی۔

"کھائی میں اترو۔ اس کی لاش تلاش کر کے اوپر لے آؤ۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھا' جاؤ.....۔" وہ دہاڑا اور کئی آدمی سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگے۔

شاہ میر کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ انہیں جیپ کے پاس کوئی لاش نہیں ملے گی' تو ممکن ہے وہ اوپر آ کر اسے تلاش کریں۔ یہ جھاڑیاں زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور پھر اسے یہ بھی پتا نہیں ہے کہ وہ تاریور کے کون سے علاقے میں ہے۔ سوچتے سوچتے ان کی نظران گاڑیوں پر پڑی جو زیادہ دور نہیں تھیں اور پھر ایک دیوانگی کا خیال اس کے ذہن میں در آیا۔ اس نے فوراً" ہی اس پر عمل کر ڈالا۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا آگے بڑھا اور وہاں کھڑی کاروں کی طرف بڑھ گیا۔ تین کاریں تھیں' جن میں ایک وہی تھی جو شروع سے شاہ میر کے سامنے آتی رہی تھی۔ شاہ میر نے ایک آس پر اس کار کی ڈکی چیک کی۔ وہ بند تھی' پھر اس نے دسوری کار کی ڈکی چیک کی اور خوش قسمتی سے وہ لاک نہیں تھی۔ شاہ میر خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے ڈکی پوری احتیاط سے کھولی اور اس میں رینگ گیا' ان لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ سب سن رہا تھا۔ اب وہ قرب و جوار میں اسے تلاش کر رہے تھے۔

پھر وہ ناکام رہ کر کاروں میں آ بیٹھے اور کاریں اسٹارٹ ہو کر چل پڑیں۔ سفر ختم ہوا اور کاریں اپنے مسکن پر واپس آ گئیں' لیکن یہاں آ کر نادر شاہ کی آواز سنائی دی۔

"ہوشیار رہنا' کوئی خاص بات ہو تو مجھے خبر کرنا۔"

"جی شاہ جی۔" کسی نے کہا۔ اور پھر کسی کار کے آگے بڑھنے کی آواز سنائی دی۔ باقی دونوں کاریں اندر داخل ہو گئی تھیں۔ شاہ میر کان لگائے ان کی آوازیں سن رہا تھا۔

"لاش کا کیا کرنا ہے؟" کسی نے سوال کیا۔

"شاہ جی نے کچھ کہا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"لٹکا رہنے دو' خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم لوگ چلیں گلزار۔"

"ہاں..... شاہ جی جا چکے ہیں۔ اب وہ آرام کریں گے۔"

یہ باتیں شاہ میر صاف سن رہا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ جانے والے اس کار کو لے کر نہ چل پڑیں' جس میں وہ موجود ہے۔ وہ لوگ آس پاس ہی تھے' اس لیے وہ کار سے نیچے بھی نہیں اتر سکتا تھا۔

"یار بڑی تھکن ہو گئی ہے۔" دوسرا بولا۔ پھر وہ لوگ اندر چل پڑے۔ شاہ میر نے اسے امداد غیبی سمجھا اور سن گن لیتا رہا۔ پھر جب اسے احساس ہو گیا کہ اب کوئی پاس نہیں ہے' تو وہ ڈکی سے نکل آیا۔ اسے روشن خان یاد آیا تھا۔ پتا نہیں برا انسان تھا یا اچھا' لیکن اس کے ساتھ جتنا بھی وقت گزرا تھا اچھا گزرا تھا۔ پتا نہیں کس طرح ان کے ہاتھ آیا اور انہوں نے اس پر کتنا تشدد کیا۔ کیا کیا پوچھا اس سے۔

دیوانگی ہی تھی' لیکن اس کا دل چاہا کہ ایک بار پھر روشن خان کو دیکھے۔ اس کی لاش ابھی تک لٹکی ہوئی ہے۔ ابھی وہ لوگ اس کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ چھپتا چھپاتا آگے بڑھا اور اندر داخل ہو گیا۔ ابھی وہ ایک راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی کی زوردار آواز ابھری۔

"ارے..... لاش کہاں گئی۔ لاش غائب ہو گئی۔ لاش نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

شاہ میر کے کان جھنجھنا گئے۔ بڑے حیران کن الفاظ تھے۔ لاش غائب ہو گئی۔ یہاں روشن خان کے سوا اور کس کی لاش تھی۔ روشن خان کی لاش غائب ہو گئی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کدھر سے آ رہی ہیں اور کدھر جائیں گی' اس بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ چھپنا ضروری تھا۔ وہ دوڑ کر ایک تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی

تھی۔ لاش غائب ہونے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے خود روشن خان کی لاش دیکھی تھی۔ وہ الٹی لٹکی ہوئی تھی اور نہ جانے کب سے لٹکی ہوئی تھی۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی' یہ جگہ بے حد مخدوش تھی۔ کوئی بھی کمرے میں داخل ہو کر روشنی کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کیسا کمرہ ہے۔ معاً" اس کا دل چاہا کہ ایک بار خود اس کمرے میں جا کر دیکھے جہاں روشن خان کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے کان لگا کر باہر کی آوازوں کو سننے کی کوشش کی اور ایک دم ساکت ہو گیا۔ ایک آواز اسے اس کمرے کے بالکل دروازے کے پاس سے آئی تھی۔

"جی شاہ جی' رسی نیچے پڑی ہے۔" "نہیں شاہ جی' کوئی بات نہیں سمجھ میں آرہی۔ ٹھیک ہے شاہ جی' ہم پوری عمارت کی تلاشی لے کر خبر کرتے ہیں.... ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے۔

شاہ میر دروازے کے پاس دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ شاید انہیں پوری عمارت کی تلاشی لینے کے لیے کہا گیا ہے۔ کہیں وہ اسی کمرے سے تلاشی کا آغاز نہ کر دیں۔ لیکن قدموں کی آوازیں دور چلی گئیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔ پتا نہیں کتنے آدمی ہیں۔ وہ چپے چپے کی تلاشی لیں گے۔ اور پوری طرح مسلح ہو کر یں گے۔ کافی خطرناک بات ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ عمارت سے باہر ہی نکل جائے' چنانچہ وہ احتیاط کے ساتھ باہر کی سمت چل پڑا۔ اندر خوب بھاگ دوڑ ہو رہی تھی' اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کتنے آدمی ہیں۔

معاً" اس نے بے حد طاقت ور ٹارچوں کی روشنیاں لہراتی دیکھیں۔ وہ باہر پچھلے درختوں اور جھاڑیوں پر روشنی پھینک رہے تھے۔ شاہ میر نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ پھر ایک دم اسے خیال آیا کہ اس سے چند گز کے فاصلے پر وہ کار کھڑی ہے جس کی ڈکی میں چھپ کر وہ یہاں آیا تھا۔ یہ ڈکی اس وقت سب سے محفوظ جگہ ہے۔ ایک بار پھر وہ ڈکی میں داخل ہو گیا' بس اتنی جھری رہنے دی کہ ہوا آتی رہے۔

بڑی سنسنی خیز صورت حال تھی۔ واقعات اتنی برق رفتاری سے پیش آرہے تھے کہ اسے کسی فیصلے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اس صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اسے تو دردانہ کے قاتلوں کی تلاش تھی اور اسے پتا چل گیا تھا کہ دردانہ کے قاتل اس خوف ناک گروہ کے افراد ہیں۔ منشیات کی تجارت میں ان کا ملوث ہونا ایک الگ بات تھی' وہ دردانہ کے قتل کے مجرم نادر شاہ کو گرفتار کرنا چاہتا تھا' جو فائل اس کے ہاتھ لگے تھے' وہ اس قدر سنسنی خیز انکشاف کے حامل تھے کہ خوف ناک ہل چل مچ جاتی' لیکن یہ بالکل الگ معاملہ تھا اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مقامی طور پر پولیس اسٹیشن موجود تھا۔ وہ وہاں جا کر بہت سے اقدامات کر سکتا تھا' لیکن اس نے منشیات کے اسمگلروں کا جو نیٹ ورک یہاں دیکھا تھا' اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ پولیس یہاں بے بس ہو گی' اس سے رابطہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ پھر اب.... نادر شاہ کے خلاف دردانہ کے قتل کے ٹھوس ثبوت بھی مل جائیں تو اسے یہاں سے لے جانا سخت مشکل ہو گا۔

نہ جانے کتنی دیر اسی سوچ بچار میں گزر گئی۔ اچانک اسے کچھ آوازیں سنائی دیں جو قریب آتی جا رہی تھیں۔ اس نے سانس روک دیا۔ آوازیں بالکل قریب آگئیں۔ پھر اس کا دروازہ کھلا' جس میں شاہ میر چھپا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔



کار کی رفتار کافی تیز تھی۔ اس میں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیو کر رہا تھا' دوسرا اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر نادر شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ کار میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ نادر شاہ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

یہ سفر کوئی چالیس منٹ تک جاری رہا۔ جس علاقے سے کار گزر رہی تھی' وہ بالکل سنسان تھا۔

سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا جو بے حد خوف ناک لگ رہا تھا' البتہ سڑک صاف ستھری تھی۔ بے شک وہ پرانی تھی' لیکن اس میں کوئی گڑھا نہیں تھا' شاید جلدی جلدی اس کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ کار سیدھا سفر کرتی رہی' پھر ایک جگہ اس کی رفتار ست ہوئی اور پھر وہ ایک ذیلی سڑک پر اتر گئی۔ یہ سڑک ایک پرانی کھنڈر نما عمارت تک جاتی تھی جو اس وقت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد کار اس عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ اندر کا ماحول بے حد بھیانک تھا۔ ہر طرف لمبی لمبی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ بے ترتیب درخت پھیلے ہوئے تھے۔ کار ایک جگہ رک گئی اور تینوں آدمی نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک تیزی سے اندر دوڑا۔ اس نے موبائل میں لگی لائٹ روشن کرلی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد جنریٹر کی آواز ابھری اور عمارت کے کچھ حصے روشن ہوگئے۔

تب نادر شاہ دوسرے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ راہ داری میں بھی بلب جل اٹھے تھے۔ باہر کا منظر جس قدر بھیانک تھا' اندر ایسا نہیں تھا۔ راہ داریاں شفاف تھیں۔ جس وسیع کمرے میں نادر شاہ داخل ہوا تھا وہ بہترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔

"کافی بنا کر لاؤ۔" نادر شاہ بھاری لہجے میں بولا۔ اور ان میں سے ایک شخص باہر نکل گیا۔ نادر شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے دوسرے آدمی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں تشویش کا شکار ہوگیا ہوں۔

"بات تشویش کی ہے شاہ جی۔"

"کوئی اندر آگھسا ہے۔ کون یہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر روشن خان ہمارا شکار نہ ہوگیا ہوتا تو ہم اس کے بارے میں سوچ سکتے تھے' کیونکہ وہ اتنا ہی خطرناک تھا۔ لیکن وہ کون تھا جو فائل نکال لے گیا اور جو جیپ لے بھاگا تھا۔ پھر اس کی لاش بھی نہیں ملی۔" اوہ' میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ وہ کس طرح بچ گیا۔ وہ جیپ کے ساتھ حادثے کا شکار نہیں ہوا۔ وہ ضرور بچ گیا ہے۔

"کون ہوسکتا ہے شاہ جی۔ دوسرے آدمی نے کہا اور نادر شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کافی دیر تک خاموشی رہی' پھر نادر شاہ نے چونک کر کہا۔"

"یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے وہ لڑکی دردانہ قتل ہوئی ہے۔ میں غور کررہا ہوں۔ وہاں لال پل پر ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ بعد میں دردانہ کے قتل کی تفصیل اخباروں میں آئی تھی' اس کی تصویر بھی چھپی تھی۔"

"جی شاہ جی۔ سامنے بیٹھے آدمی نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔"

"انتظامیہ کا کوئی آدمی' مگر کون' اوہ ہوسکتا ہے۔ تم ایک کام کرو جابر خان۔ دارالحکومت چلے جاؤ اور یہ معلوم کرو کہ دردانہ کے قتل کا کیس کون سے تھانے میں ہے۔ اگر وہاں ہونے والی کارروائی کا بھی پتا چل جائے تو اچھی بات ہے۔ وہاں انچارج کون ہے۔ یہ ساری تفصیل احتیاط سے معلوم کرو' لیکن جلدی۔ اگر وہ انتظامیہ کا آدمی ہے تو زبردست ٹرینڈ ہے اور ہمارے لیے کافی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ جو فائل وہ لے گیا ہے۔ وہ ہمارے لیے موت بن سکتے ہیں۔ میں ان کے لیے سخت پریشان ہوں۔"

"میں صبح کو چلا جاتا ہوں شاہ جی۔"

اتنی دیر میں دوسرا آدمی کافی لے آیا۔ ٹرے میں کافی کے برتنوں کے ساتھ صرف ایک پیالی تھی۔ نادر شاہ کافی کے سپ لیتا رہا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

"میں پریشان ہوگیا ہوں۔" روشن خان نے ہمیں کروڑوں کا نقصان پہنچایا ہے۔ بڑی مشکل سے اس سے ہمارا پیچھا چھوٹا ہے' لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اس نے قدم قدم پر ہمیں شکست دی ہے۔ اگر وہ انتظامیہ کا کوئی فرد ہے تو..... تو۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے موبائل فون پر بیل ہوئی اور اس نے سیل اٹھالیا۔ دوسری طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ نادر شاہ کا چہرہ۔ آگ کی طرح سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے فون پر کچھ ہدایات جاری کیں اور فون بند کردیا۔ دوسرا آدمی سنسنی خیز نظروں

سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نادر شاہ نے کہا۔
"روشن خان کی لاش غائب ہو گئی۔"



شاہ میر کو خود پر ہنسی آرہی تھی۔ سب کچھ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کے پاس کیس آئے تھے، ہر طرح کے کیس۔ چوری، ڈکیتی، اخلاقی جرائم قتل و غارت گری وہ محنت سے کام کرنے کا عادی تھا، کافی حد تک وہ ان کیسوں کو حل کرلیتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ مغرور مجرموں کی تلاش کرنے کے لیے اسے دوسرے شہروں کا رخ بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس بار جو انوکھے واقعات اسے پیش آئے تھے ان کی نوعیت مختلف تھی۔ منشیات کی تجارت جس اعلا پیمانے پر ہوتی ہے اسے علم تھا، لیکن اب جو اسے منشیات کے تاجروں سے واسطہ پڑ رہا ہے تو یوں لگتا تھا کہ اس سے بڑا تو کوئی کاروبار ہے ہی نہیں۔ جو فائل اسے اس عمارت سے ملے تھے انہوں نے تو اسے دنگ کرکے رکھ دیا تھا۔ جتنے بڑے بڑے نام اسے فائلوں میں درج ملے تھے وہ ناقابل تفتیش تھے۔ ان پر ہاتھ ڈالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس بارے میں بہت سوچنے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ اسے تو صرف دردانہ کے قاتلوں سے غرض تھی، جو سامنے تو آئے تھے، لیکن ان کی نوعیت مختلف تھی۔ نادر شاہ پر ہاتھ ڈالنے کا مقصد تھا کہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا جائے۔

کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ بے شک نادر شاہ کو گرفتار کرکے دردانہ کے قاتل کو بے نقاب کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پھر اس قتل کی وجوہات سامنے لانی پڑتیں اور بات محدود نہ رہتی۔

وہ اس وقت بھی کار کی ڈکی میں سفر کر رہا تھا۔ کار کہاں جا رہی ہے، اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ ڈکی کو تھوڑا سا بھی کھول کر باہر کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا، کیونکہ کار میں بیٹھے لوگوں کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اسی حالت میں ان کے ہاتھوں سے بچنا ناممکن ہو جاتا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کار کے اندر بیٹھے لوگ اس وقت سخت ہیجان کا شکار تھے۔ روشن خان کی لاش غائب ہو گئی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ اور اب شاید ان لوگوں کو نادر شاہ نے طلب کرلیا تھا۔

وہ لاش کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے، شاہ میر کو اندازہ نہیں تھا۔ لیکن شاہ میر اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس دوران وہ روشن خان کی سمت میں اس کے بارے میں بہت سے اندازے لگاتا رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ روشن خان بے حد چالاک اور خطرناک آدمی ہے۔ وہ بہترین صلاحیتوں کا مالک ہے۔ بے شک شاہ میر نے اس کی لاش کنڈے میں الٹی لٹکی دیکھی تھی۔ ظاہر ہے اس پر تشدد بھی کیا گیا ہوگا، لیکن ممکن ہے روشن خان نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انہیں باور کرادیا ہو کہ وہ مر چکا ہے، لیکن وہ زندہ ہو اور موقع پاکر نکل بھاگا ہو۔ لیکن یہ نادر شاہ کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ پتا نہیں روشن خان کی اس گروہ سے کیا دشمنی تھی۔

سفر جاری رہا۔ شاہ میر نے ڈکی کے درمیان میں ہاتھ کی کلائی پھنسا رکھی تھی تاکہ ڈکی بجنے نہ پائے اور ان لوگوں کو اس کے کھلے ہونے کا شبہ نہ ہونے پائے۔ خدا خدا کرکے وہ سفر ختم ہوا اور اسے کار کے رکنے کا احساس ہوا۔ وہ محتاط ہو گیا۔ باہر کی ساری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ کار سے اتر کر اسے لاک کر رہے تھے، پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ شاہ میر نے تھوڑی سی ڈکی اوپر اٹھائی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر پھیپھڑوں میں آکسیجن کھینچنے لگا۔ گہری خاموشی اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ ڈکی سے باہر نکل آیا۔ اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آرہی تھی، جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وسیع و عریض احاطے میں درخت بکھرے ہوئے تھے، اونچی اونچی جھاڑیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، جن میں سرسراہٹیں سنائی دے جاتی تھیں۔ جس جگہ یہ کار آکر کھڑی ہوئی تھی وہاں سے چند گز کے فاصلے پر نادر شاہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ شاہ میر کو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کی

طلبی ہوگئی ہے اور اب وہ نادر شاہ کے سامنے حاضری دے رہے ہیں۔ نادر شاہ یہاں موجود ہے۔ گویا نادر شاہ کے ایک اور ٹھکانے کا پتا چلا۔ لیکن اب بعد کے حالات کا پتا کیسے چلے۔ اس کا دل چاہا کہ عمارت میں اندر جاکر صورت حال کا جائزہ لے۔ لیکن یہ زیادہ آگے کی بات ہوجائے گی۔ وہ بھی بے وقوف نہیں ہیں' ذرا سا شبہ ہوگیا تو بیڑا غرق ہوجائے گا' جبکہ اتنا لمبا سفر ہوا ہے اور یہ پتا نہیں ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

پھر اب کیا' کیا جائے۔ عمارت بڑی عجیب سی تھی۔ اندر کے حالات کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اسی احاطے میں رکا جائے آگے کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ نادر شاہ یہاں موجود ہے' ممکن ہے یہ اس کی خفیہ رہائش گاہ ہو۔ یہاں تھوڑا سا رکنا ضروری ہے' لیکن ان سے محفوظ رہ کر.... اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ یہاں بڑے بڑے اور پرانے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ عمارت کے صدر دروازے کے قریب جہاں کاریں کھڑی ہوئی تھیں' ایک برگد کا درخت موجود تھا' جس کی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے جوتے اتارے اور درخت کے موٹے تنے سے اوپر چڑھنے لگا۔ بڑا زبردست درخت تھا۔ کافی اونچا جانے کے بعد اس نے ایک دوشاخہ تلاش کیا اور وہاں رک گیا۔ بہترین جگہ تھی۔ پیروں میں جوتے پہن کر وہ دوشاخے میں پھنس کر دراز ہوگیا۔

زبردست صورت حال تھی۔ اس کی نظریں دور' دور تک پھیلے جنگل کا جائزہ لینے لگیں۔ پتا نہیں یہ کیسی عمارت ہے۔ اچانک اسے کافی دور پر روشنی کی دو لکیریں نظر آئیں۔ کوئی ٹرک گزر رہا تھا۔ لیکن یہ وہ راستہ نہیں تھا جدھر سے کار یہاں آئی تھی۔ یہ کوئی دوسری سڑک تھی۔ درخت پر چڑھے ہوئے اسے کوئی بیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک اندر دو فائر ہوئے اور شاہ میر اچھل پڑا۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر پھر کوئی قتل ہوگیا۔ غالباً" ان میں سے کوئی جو کار میں یہاں آئے تھے۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ درخت سے اتر کر اندر جائے اور صورت حال کا جائزہ لے' لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ بڑی مخدوش صورت حال تھی۔ فی الحال یہ جگہ مناسب ہے' یہاں رات گزاری جاسکتی ہے۔

رات کے کوئی تین بجے ہوں گے کہ پراسرار عمارت کے دروازے پر روشنی نظر آئی اور شاہ میر چونکنا ہوکر ادھر دیکھنے لگا' دو آدمی ایک انسانی بدن کو اٹھائے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے اس بدن کو نیچے رکھا' پھر اندر چلے گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ دوبارہ اندر چلے گئے اور ایک جسم کو لے آئے۔ شاہ میر کو اندازہ ہوگیا کہ وہ دونوں لاشیں ہیں' پھر ایک آواز آئی۔

"گاڑی یہاں لے آؤ۔" ایک آدمی کار کے قریب آیا اور اسے اسٹارٹ کرکے لاشوں کے قریب لے آیا۔ دوسرا آدمی کار کی ڈکی کے قریب آیا اور چونک کر بولا۔

"ڈکی کھلی ہوئی ہے۔ ویسے یہ غلط بات ہے کہ تم ہمیشہ اسے کھلا چھوڑ دیتے ہو۔"

"رہ گئی ہوگی یار۔ تم دیکھ رہے ہو قیامت تو ٹوٹی ہوئی ہے اور پھر یہ گاڑی تو سہیل کے استعمال میں تھی' میں نے تو اسے دو دن سے ہاتھ نہیں لگایا۔" پہلے آدمی نے کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں مصروف ہوگئے۔ شاہ میر کو اندازہ ہوگیا کہ وہ دونوں لاشیں ٹھکانے لگانے لے جارہے ہیں۔ کسی بھی طرح کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔ کار کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آگئی۔ اس کے بعد اس ٹوٹے کھنڈر کی روشنیاں بند ہوگئیں۔ جنریٹر کی جو مدھم آواز آرہی تھی وہ بھی بند ہوگئی۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے کا وقت ہوگا کہ شاہ میر نے پھر اس عمارت کے دروازے پر چہل پہل دیکھی اور محتاط ہوگیا۔ اندر سے تین افراد باہر نکلے تھے۔ ایک نادر شاہ تھا۔ دوسرا وہ جوان چار آدمیوں میں شامل تھا' جن میں سے دو مارے گئے تھے۔ تیسرا کوئی اور تھا۔ نادر شاہ اپنے ساتھی کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ دوسری کار کا اسٹیئرنگ دوسرے آدمی نے سنبھال لیا اور پھر دونوں

کاریں باہر نکل گئیں۔ درخت کی بلندی سے وہ دور تک جاتی نظر آتی رہی تھیں۔ شاہ میر اندازہ لگاتا رہا کہ اب اس کھنڈر نما عمارت میں کوئی اور تو نہیں ہے۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ اب کوئی اندر نہیں ہے۔ نادر شاہ جاچکا ہے۔ اس کے باوجود اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح کو وہ بغور اطراف کا جائزہ لے چکا تھا۔ برگد کے قدیم درخت کی شاخیں، عمارت کے کچھ ایسے حصوں تک پھیلی ہوئی تھیں جن کے راستے عمارت میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ اس نے یہ ہی کیا، ایک گوک میں اتر کر اس نے نیچے کا راستہ اختیار کیا۔ عمارت بے حد قدیم تھی، لیکن اس کے اندر کے بعض حصے بے حد مضبوط تھے۔ وہ ایک بڑے ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ یہ سروس ہال تھا۔ اس میں انتہائی بوسیدہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے مقدس مجسّمے نظر آرہے تھے، جو ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ شاہ میر کو پھول گڑھی کی وہ عورت یاد آگئی جس نے نادر شاہ کے ٹھکانے کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ پرانے چرچ میں ہے۔ یہ وہی پرانا چرچ تھا۔ گویا اب وہ نادر شاہ کے سب سے اہم ٹھکانے میں ہے۔

عمارت میں اب کسی انسانی وجود کا نشان نہیں تھا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں بہترین فرنیچر موجود تھا۔ پھر اسے ایک بڑی کار آمد چیز نظر آئی۔ یہ کافی کے برتن تھے۔ پاٹ میں ٹھنڈی کافی موجود تھی۔ جس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی کچن بھی ہے۔

پتا نہیں کب سے کسی طرح کی خوراک کی ایک کھیل بھی اس کے منہ میں نہیں گئی تھی، لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لیکن کچن تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کچن مل گیا۔ جس میں بہت کچھ تھا۔ اور اس بہت کچھ کا بہت سا حصہ شاہ میر کے معدے میں اتر گیا۔ اس کے بعد اس نے چرچ کی تلاشی لینی شروع کردی، ساتھ ہی وہ باہر کی آہٹیں بھی لے رہا تھا۔ پھر اسے ایک تہ خانے کا راستہ نظر آیا۔ اور وہ تہ خانے میں اتر گیا۔ یہاں آکر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ منشیات کا گودام تھا۔ ہر طرف منشیات کی بو چکرا رہی تھی۔ بے شمار کارٹن چنے ہوئے تھے۔ خام منشیات کے انبار تھے۔ اندازے کے مطابق اربوں روپے کی ہیروئن، چرس، افیون یہاں موجود تھیں۔ جن سے اس گروہ کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ پھل گڑھی میں ہی ان کا جو نیٹ ورک نظر آیا تھا اسی سے اندازہ ہوتا تھا، لیکن یہ گودام دیکھ کر شاہ میر کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آپڑا تھا۔ زہر کے یہ انبار انسانوں کے لیے تھے۔ لیکن وہ بے بس تھا۔ کوئی بڑی کارروائی کرنا اس کا منصب نہیں تھا۔ پھر ان فائلوں میں اسے جو بڑے بڑے نام نظر آئے تھے ان کی تفصیل پڑھ کر ہی وہ ششدر رہ گیا تھا۔

ایک طرف کچھ کیبنٹ رکھے ہوئے تھے۔ جن کا جائزہ لے کر اس پر مزید انکشافات ہوئے تھے۔ وہ ان تمام چیزوں کو یہاں سے نہیں لے جاسکتا تھا، پھر بھی بڑی چھان بین کے بعد اس نے ان میں سے کچھ کاغذات مزید اپنے قبضے میں کیے۔ اس کے بعد موبائل نکال کر اس گودام کی مووی بنانے لگا۔ کافی دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہا۔ پھر اس خیال سے کہ موبائل کی بیٹری ختم ہوجائے گی، مزید مووی بنانا ترک کردی اور تہ خانے سے باہر نکل آیا۔

بہت بڑا کام ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کیا کرنا چاہیے۔ دل تو کہہ رہا تھا کہ اس گودام کو آگ لگادے، لیکن ایسا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ جانے اور کتنے گودام یہاں ہوں گے۔ ان کاغذات سے اندازہ ہوتا تھا کہ منشیات کا یہ مکروہ کاروبار دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نے پرانی عمارت اور اس کے جائے وقوع کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اب یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہاں اس کا اسے اندازہ تھا کہ نہایت اعلا پیمانے پر اس کی تلاش ہو رہی ہوگی۔ باہر نکل کر اس کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے سیل پر زمان شاہ کا نمبر ملایا۔ پہلے بھی کوشش کرچکا تھا، لیکن سگنل ہی نہیں ملے تھے، اس وقت کال مل گئی اور زمان شاہ کی گھبرائی ہوئی

آواز سنائی دی۔
اور..... اور آپ کہاں ہیں۔ آپ خیریت سے ہیں سر۔ ہم آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں زمان شاہ۔ پھول گڑھی سے تارپور پہنچ گیا ہوں دردانہ کے قاتل یہاں موجود ہیں اور میں ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہوں زیادہ تفصیل نہیں بتاؤں گا کام کی بات سنو۔ تارپور کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔"
"زیادہ نہیں سر....."
"کبھی دیکھا ہے۔"
"نہیں....."
"میں تمہیں اس کی تفصیل بتاتا ہوں۔" شاہ میر تارپور کے راستے کے بارے میں بتانے لگا پھر بولا "میاں منشیات کے تاجروں کی حکومت ہے خوف ناک قاتل ہر طرف دندناتے پھرتے ہیں۔ تارپور میں داخل ہونے والے ہر اجنبی پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ تمہیں یہاں آنا ہے۔ کس طرح یہ تم طے کروگے میں تمہیں تارپور کے قلعے کے بارے میں بتاتا ہوں۔ تفصیل غور سے یاد کرو۔ یہاں آکر تم مجھے کال کروگے۔" شاہ میر دیر تک زمان شاہ سے باتیں کرتا رہا پھر بولا "صفورا کہاں ہیں۔"
"گشت پر ہیں سر بات کراؤں۔"
"نہیں انہیں بس میری خیریت بتا دینا اور کوئی خاص بات....."
"نہیں سر....."
"بس ہوشیاری سے! شاہ میر نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے ذہن سے کافی بوجھ اتر گیا تھا۔ پرانے چرچ کی عمارت اب بالکل سنسان پڑی تھی لیکن یہ جگہ کس قدر خطرناک تھی شاہ میر کو اس کا اندازہ تھا۔ گو تارپور شہر کی نسبت وہ یہاں محفوظ تھا لیکن یہیں پر پڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کون جانے کب کوئی یہاں آجائے۔ اس کے علاوہ اسے زمان شاہ سے ملنے کے لیے قلعے پر جانا تھا۔ شہری آبادی بن تک کا سفر بھی کم نہیں تھا۔ چنانچہ وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

رات کو اس نے درخت کی بلندی سے چرچ کے بائیں جانب روشنی کی دو لکیریں دیکھی تھیں جو کسی گاڑی یا ٹرک کی ہی ہو سکتی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ادھر بھی کوئی سڑک ہے لیکن ان لوگوں کی آمد اس سڑک سے تھی جو جنگل سے گزرتی ہے۔ شاہ میر نے اللہ کا نام لے کر اس سڑک کی طرف سفر شروع کر دیا۔ فاصلے کا اور سمت کا تعین اس نے اپنی ذہانت سے کیا تھا۔ فاصلے ختم ہو گئے اور ایک پختہ سڑک نظر آگئی۔ شاہ میر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر کے بعد اسے ایک بس نظر آئی اور وہ اسے اشارے کرنے لگا بس رک گئی اور شاہ میر اس میں سوار ہو گیا جس کے اوپر اس نے تارپور کا بورڈ دیکھ لیا تھا۔



تمام لوگ محسوس کر رہے تھے کہ نادر شاہ سخت اپ سیٹ ہے وہ بے حد خطرناک آدمی تھا زندگی لینا اور دینا اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بے شمار لوگوں کو قتل کر چکا تھا۔ لیکن جب اچھے موڈ میں ہوتا تو ساتھیوں سے خوب ہنسی مذاق کرتا تھا۔ البتہ اب وہ بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا۔ اس وقت بھی وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے گردن اٹھا کر کہا۔
"تو کیا وہ تارپور سے نکل گیا۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے سخت مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے جو فائل وہ لے کر نکل گیا ہے وہ بے حد خطرناک ہے۔ کیا رپورٹ ہے گلزار۔ پھر سے بتاؤ۔
"وہ ایک نوجوان خوب صورت آدمی ہے۔ ورزشی جسم کا مالک ہے ہوٹل میں ان دونوں نے ساتھ قیام کیا تھا۔ جب ہم نے ہوٹل پر ریڈ کیا تھا تو وہ پیچھے سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ وہاں نہیں آیا۔ جس کے مختصر سے سامان سے کوئی پتا نہیں چل سکا۔
"ہوں۔" نادر شاہ خاموش ہو گیا۔
سارے کام معطل کر دیے گئے تھے۔ نادر شاہ اسی عمارت میں تھا۔ اب یہاں مزید کئی افراد آگئے تھے جو

بہترین اسلحے سے لیس تھے اور عمارت کے چپے چپے کی نگرانی کرتے تھے۔ حالانکہ نادر شاہ اس عمارت میں زیادہ نہیں نکلتا تھا لیکن آج کل وہ یہیں تھا۔ اس کا معتمد خاص جس کا نام سعید خاں تھا ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا۔

"شاہ جی پھول گڑھی سے خبر ملی ہے کہ مسٹر گراور آ رہے ہیں۔ ایک آدھ دن میں وہ پھول گڑھی پہنچ جائیں گے۔" سعید خان نے خبر کی۔

"فوراً" انہیں کال کر کے منع کر دو۔ ان سے کہہ دو ہم آج کل بہت مصروف ہیں انہیں اٹینڈ نہیں کر سکیں گے۔

"ٹھیک ہے شاہ جی۔ میں نے وہاں بھی سب کو ہوشیار کر دیا ہے اور آج کل وہاں سرگرمیاں بند کر دی گئی ہیں۔ ویسے نرگس کا بہت افسوس ہے اس کی ٹکر کی دوسری نہیں مل سکتی۔ آپ کی بڑی وفادار تھی۔

"روشن خان نے ہی اسے مارا تھا۔ اور شاید اسی سے اس نے ہمارا پتا معلوم کیا تھا۔ ویسے سعید خاں بھی کبھی عجیب سی باتیں دماغ میں آتی ہیں جب سے ہم نے دردانہ کو مارا ہے تب سے ہم پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔ اور وہ کمینہ روشن خان۔ ہمارے منہ پر سب سے بڑا جوتا اسی نے مارا ہے۔ پتا نہیں وہ مرا بھی تھا یا نہیں یہ تو تمہیں پتا ہے کہ وہ سانپ سے زیادہ زہریلا اور لومڑی سے زیادہ چالاک تھا۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کی لاش کو بھی غائب کیا گیا ہے وہ کون ہے جو اس کے ساتھ تھا۔ ایک ہے یا ایک سے زیادہ' کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو۔

"ہمارے آدمیوں نے ساری کوششیں کر لیں۔ کہیں سے اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ لگتا ہے شاہ جی وہ تارپور سے نکل گیا۔"

نادر شاہ نے جس شخص کو شہر بھیجا تھا اس نے بڑی تفصیل سے رپورٹ دی۔ "بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں شاہ جی۔" لال پل پر دردانہ کا قتل ہوا اس کی لاش ندی سے مل گئی۔ علاقے کے تھانے کے انچارج نے جس کا نام شاہ میر ہے کیس کی تفتیش شروع کر رکھی ہے۔ ہمارے ایک سپلائی ڈپو کے مالک چاند خاں نے خبر دی کہ تھانہ انچارج اس کے پاس تفتیش کرنے آیا تھا اس نے کوئی خاص بات نہیں بتائی اور شاہ میر چلا گیا۔ چاند خاں سے ہی پتا چلا ہے کہ یہ خطرناک پولیس آفیسر ہے اور جس کیس میں ہاتھ ڈالتا ہے اسے حل کر کے دم لیتا ہے۔

"اس کے بارے میں پتا چلا کہ کہاں ہے آج کل۔"

"میں نے خاص طور سے معلوم کیا ہے کہ وہ آج کل تھانے نہیں آ رہا۔ اور غائب ہے۔"

"اوہ .... نادر شاہ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا "تم ایک کام کرو جلال الدین کے پاس چلے جاؤ۔ انہیں پوری تفصیل بتاؤ۔ دوسرا کام یہ کرو کہ شاہ میر کے گھر والوں کا پتا کرو' کہاں رہتے ہیں کتنے ہیں کون کون ہیں۔ یہ بڑا ضروری ہے۔

"ٹھیک ہے شاہ جی...."

"اور کوئی خاص بات۔"

"نہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ فون بند کرنے کے بعد نادر شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گردن اٹھا کر بولا۔

"میں نے کہا تھا کہ جس دن سے دردانہ قتل ہوئی ہے اس دن سے ہم پر نحوست پڑی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی پولیس آفیسر ہے۔ ان لوگوں کی بڑی ٹریننگ ہوتی ہے کسی طرح اس کا اور روشن خان کا گٹھ جوڑ ہو گیا اور وہ اسے لیے ہوئے یہاں آ گیا۔ یہی بات ہے سو فیصدی یہی بات ہے۔ مگر روشن خاں کی لاش کہاں گئی۔ وہ لوگ کتنے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ شہر کے معاملات جلال الدین کو سنبھالنے ہوں گے ساری ذمے داری میری ہی تو نہیں ہے یہ لوگ مفت میں دولت کے ڈھیر لگا رہے ہیں۔ سنو سعید خاں سارے ڈپو سیل کر دو۔ سارے بندوں کو کچھ دن آرام کرنے دو۔ ان سے کہو ساری سرگرمیاں بند کر دیں۔

"ہم لوگ پھول گڑھی چلیں۔" سعید خاں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہمیں زیادہ بہادری نہیں دکھانی چاہیے۔ پھول گڑھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہمیں اپنی گاڑیاں بھی یہیں چھوڑنا ہوں گی۔ اس وقت پرانا چرچ ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے۔"



"شاہ میر کو زمان شاہ کی کال موصول ہوئی۔" جی زمان شاہ۔

"سر میں آگیا ہوں.....!"

"گڈ کہاں ہو زمان شاہ....."

"قلعے میں ہوں سر۔ اس وقت یہاں اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ میں فصیل کے پاس برجی نمبر چار کے قریب کھڑا ہوں۔"

"خیریت سے ہو۔"

"بالکل.....!"

"میں آرہا ہوں۔ روشنی کا اشارہ تھا۔ شاہ میر نے کہا۔ دس منٹ کے بعد وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ زمان شاہ نے لائٹر کا شعلہ جلا کر اسے اپنی نشاندہی کی تھی۔"

"سر آپ بالکل خیریت سے ہیں۔"

"ہاں۔ تم بتاؤ سب ٹھیک ہے کیسے آئے۔"

"پہلے پھول گڑھی' وہاں سے بس میں۔"

"گڈ..... تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ تمہیں یہاں سے کچھ فائل اور دوسرے کاغذات لے کر واپس جانا ہے۔ بے حد قیمتی کاغذات ہیں ہلچل مچا دینے والے۔ وہاں جا کر بھی انہیں عام جگہ نہیں رکھنا ہے بلکہ صفورا سے کہہ دینا انہیں اپنے گھر لے جا کر احتیاط سے رکھے۔"

"ٹھیک ہے سر!"

"واپسی ابھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں سر صبح کو سات بجے پھول گڑھی کے لیے بس چلتی ہے۔"

"اوکے' سوری زمان شاہ تمہارے ذہن میں تجسس ضرور ہوگا بس میں اتنا بتاؤں گا کہ دردانہ کے قاتل میری مٹھی میں ہیں لیکن ابھی ان پر محنت کرنی ہوگی۔"

"جی سر....."

شاہ میر نے اس جگہ سے فائل نکالے جہاں انہیں چھپایا تھا۔ انہیں پیک کیا۔ پھر اپنے موبائل فون سے اس نے..... میموری کارڈ نکالا اور اسے ایک کاغذ میں لپیٹ کر زمان شاہ کو دیتے ہوئے بولا۔

"اس میں ایک مووی محفوظ ہے۔ بے حد قیمتی ہے اسے احتیاط سے رکھنا ہے۔ یہ دردانہ کے قاتلوں کے خلاف سب سے بہترین ثبوت ہے۔ جو انہیں کسی طور پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتا۔"

"ٹھیک ہے سر!" زمان شاہ نے کہا۔

شاہ میر نے چاروں طرف دیکھا پھر بولا "تارپور کے بارے میں یوں سمجھ لو کہ یہ منشیات کے سوداگروں کی سلطنت ہے یہاں انہیں کا راج ہے۔ میری ان سے کئی جھڑپیں ہو چکی ہیں اور وہ شدت سے مجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

"اوہ سر' آپ یہاں اکیلے ہیں۔"

"یہی بات میرے حق میں ہے۔ اس طرح میں اپنا بہتر دفاع کر سکتا ہوں۔ میں بہت جلد واپس آجاؤں گا لیکن دردانہ کے قاتل کو ساتھ لے کر۔ ظاہر ہے میں اسی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ باقی رہے دوسرے معاملات' تو میں نے ان پر کافی کام کر لیا ہے اگر سرکاری طور پر یہ ذمے داری مجھے سونپی گئی تو مقدور بھر ان پر کام کروں گا۔"

"سر ہمیں تشویش رہے گی۔" زمان شاہ نے کہا۔ اور شاہ میر مسکرا دیا۔

"جب ہماری ٹریننگ مکمل ہوتی ہے اور ہم اپنی ذمے داریوں کا حلف اٹھا کر یہ وردی پہنتے ہیں تو باور کرتے ہیں کہ یہ وردی ہمارے لیے کفن ہے جسے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ہمیں پہننا ہے اور اس کی لاج رکھنی ہے۔"

"جی سر.....!" زمان شاہ نے کہا۔

"تم بے فکر رہو۔ میں نادر شاہ کو ہتھکڑیاں ڈال کر تمہارے پاس آؤں گا۔"

"نادر شاہ کون ہے۔"

"دردانہ کا قاتل۔۔۔۔" شاہ میر نے کہا۔

"اوہ اس کا مطلب ہے کہ آپ اس کا سراغ لگا چکے ہیں۔"

"ہاں اور اس کے پیچھے ہوں۔ اس نے دردانہ کو قتل کیا ہے اور خود میرے سامنے کئی افراد کو قتل کر چکا ہے۔ وہ منشیات کے سوداگروں کے بہت بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور سنو خاص طور سے تمہیں ہدایات کر رہا ہوں صفورا کو یہ تفصیل نہیں معلوم ہونی چاہیے وہ میرے لیے پریشان ہو جائے گی۔"

"جی سر۔۔۔۔"

زمان شاہ نے لاکھ کہا کہ وہ صبح سات بجے بس سے چلا جائے گا لیکن شاہ میر نے یہ قبول نہیں کیا۔ رات انہوں نے یہیں جاگ کر گزاری صبح چھ بجے دونوں بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے اور سات بجے جب زمان شاہ کی بس چل پڑی تب شاہ میر مطمئن ہوا۔

رات بھر جاگنے سے سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے سے چھا رہے تھے لیکن مجبوری تھی۔ اس وقت کوئی ٹھکانا نہیں تھا جہاں آرام کر لیتا۔ لیکن قدرت کے اپنے عمل ہوتے ہیں۔ بس اڈے سے بہت تھوڑے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن تھا۔ ناکارہ لائنوں پر مال گاڑی کے کچھ ناکارہ ڈبے نظر آ رہے تھے جن پر گرد و غبار جما ہوا تھا۔ شاہ میر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی بہترین بیڈروم۔ کھانے پینے کا بھی انتظام تھا۔ بہت سے ٹھیلے والے مختلف اشیاء فروخت کر رہے تھے اس نے کچھ چیزیں خریدیں پانی کی ایک بوتل خریدی اور ڈبوں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک صاف ستھرے ڈبے کو منتخب کر کے وہ اس میں چڑھ گیا۔ ناشتا کر کے ایک گوشے میں لیٹ گیا۔ اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آنکھیں بند کیں تو فوراً" نیند آ گئی۔

جاگا تو شام ہو چکی تھی گھڑی میں وقت دیکھا تو چھ بجے تھے۔ پورا دن سوتے گزرا تھا۔ کسلمندی سے پڑا رہا۔ اب تک خوب ہنگامے رہے تھے خوب قتل و غارتگری دیکھی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس نے ابھی تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی لیکن اب بہت وقت گزر گیا تھا۔ کچھ کرنا ہے کیسے بغیر کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن کیا۔

پرانے چرچ کے قید خانے سے اسے بہت قیمتی مواد ملا تھا۔ اس کے علاوہ ان فائلوں میں ایسی بہت سی چیزیں موجود تھیں جن سے نادر شاہ اور اس کا گروہ دردانہ کا قاتل ثابت ہوتا تھا۔ بات صرف نادر شاہ پر ہاتھ ڈالنے کی تھی وہ دارالحکومت جا کر یہ سارا مواد اعلیٰ حکام کو پیش کر کے یہاں تارپور میں آپریشن کرا سکتا تھا لیکن اس کے انجام سے پوری طرح واقف تھا۔ تارپور میں ان لوگوں کی بہت بڑی طاقت موجود تھی۔ سخت خونریزی ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ ان کے کچھ گودام پولیس کے قبضے میں آجاتے اور بس' منشیات کی سوداگری کا یہ جال تو نہ جانے کہاں کہاں پھیلا ہوا تھا۔ پھول گڑھی اس کی مثال تھی نہ جانے کتنی ایسی پھول گڑھیاں ہوں گی اور نہ جانے انہیں اور کتنے بڑے بڑے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو گی بات دردانہ کے قاتلوں کی تھی۔ ایک بے کس لڑکی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اس نے قتل کر دیا تھا۔ اور شاہ میر کو اس کے قاتلوں کا پتا چل گیا تھا۔ منشیات کے سوداگروں کے سرپرستوں کی تفصیل فائلوں میں موجود تھی اب ان کے خلاف کیا کیا جا سکتا ہے یہ دوسروں ہی کی ذمے داری تھی۔ اسے بس نادر شاہ کو پکڑنا تھا۔ یہی مسئلہ تھا کہ اس پر کیسے ہاتھ ڈالا جائے۔

تارپور اب اتنی چھوٹی جگہ بھی نہیں تھی کہ وہاں ایک آدمی بھی پوشیدہ نہ رہ سکے۔ ان لوگوں کا ذہن کہاں کہاں تک جائے گا۔ یہ جگہ بھی بہترین تھی۔ اس کے بعد کوئی اور جگہ لیکن کب تک نادر شاہ پر کیسے ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔ روشن خاں کا بھی کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ بے شک شاہ میر نے اس کی لاش کو بہت قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن جب اس نے اس کی لاش دیکھی تھی تو نادر شاہ جیسا زیرک آدمی بھی وہاں موجود

تھا۔ انہوں نے روشن خان کو جس طرح ہلاک کیا ہو گا وہ بھی معمولی طریقہ نہیں ہو گا۔ روشن خان نے ان کے بہت سے آدمی بھاگ گئے ہوں گے۔ پھر روشن خان کی لاش کس نے غائب کی۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

آسمان پر گھرے بادل چھا گئے جس سے ماحول بہت جلد تاریک ہو گیا۔ دور بس اڈے پر پختہ دو کانوں میں روشنیاں ہو گئی تھیں۔ شاہ میر نے پاس رکھی پانی کی بوتل سے پانی لے کر چہرے پر چھینٹے مارے پھر وہاں سے نیچے اتر آیا۔ بس اڈے پر زیادہ رونق نہیں تھی سامان بیچنے والے البتہ نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے موبائل چیک کیا اس نے سوچا تھا کہ زمان شاہ سے پوچھے کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا۔ لیکن موبائل کی بیٹری سفید ہو چکی تھی۔ حالانکہ جیکٹ میں چارجر موجود تھا لیکن بے کار تھا۔ وہ بس اڈے کی طرف چلا گیا۔ ایک بس روانگی کے لیے تیار تھی کنڈکٹر آواز لگا رہا تھا ''پھول گڑھی' قصیر آباد آجاؤ دو سواریاں' پھول گڑھی' پھول گڑھی شاہ میر نے ایک ٹھیلے کے پاس بینچ پر بیٹھ کر دال چاول کھائے پانی پی کر چائے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں جو کچھ فاصلے پر نظر آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس کے سامنے دو ٹھکانے ہیں۔ وہ گھر جہاں وہ دو تین بار جا چکا تھا اور جہاں نادر شاہ کا ٹھکانا نمبر ایک تھا۔ دوسرا پرانا چرچ۔ لیکن پرانا چرچ مناسب جگہ تھی۔ اول تو وہاں چھپنے کا معقول بندوبست تھا۔ کچن بھی تھا جہاں کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ دوسری بات یہ کہ نادر شاہ وہاں زیادہ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل سکتا تھا۔ پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر نادر شاہ اس کے ہاتھ لگ بھی جائے تو اسے کرنا کیا ہو گا۔ اسے شہر کیسے لے جائے گا۔ اسے پولیس اسٹیشن کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ اس نے ماحول کے مطابق فرض کر لیا تھا کہ یہاں ان لوگوں کا راج ہے اور پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی ہو گی اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ ابھی تک اس





دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ خواتین آنسو بہا رہی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے یہ گانا بج رہا تھا۔ ''چھوڑ بابل کا گھر' موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔'' مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی جو غم زدہ نظر آنے کے بجائے ایک کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔ لڑکی کی ایک سہیلی نے پوچھا۔ ''رخسانہ' تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ تمہیں کرن کی رخصتی کا دکھ ہو رہا ہے۔''

لڑکی بولی۔ ''دکھ کرتی ہے میری جوتی! کرن نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کرتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے یہ مشورہ دیا کہ عامر سے جتنی ترش روئی سے پیش آؤ گی' وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔''

سہیلی نے پوچھا۔ ''یہ عامر کون ہے۔''

''وہ جو سہرا باندھے' پھولوں سے آراستہ کار کی طرف بڑھ رہا ہے۔''



رئیل اسٹیٹ ایجنٹ مکان کے متوقع خریدار سے کہنے لگا۔ ''یہ گھر فوائد اور نقصان دونوں رکھتا ہے۔ میں ایک دیانتدار انسان ہوں' اس لیے پہلے آپ کو نقصان بتاتا ہوں۔ گھر کے مغرب میں ایک میل دور بھینسوں کا باڑہ ہے۔ مشرق کی جانب ربڑ بنانے والا ایک کارخانہ ہے۔ شمال کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر کوڑے کرکٹ سے کھاد بنانے والا پلانٹ ہے اور جنوب کی طرف سیمنٹ فیکٹری ہے۔''

متوقع خریدار نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ ''فوائد کیا ہیں۔''

''آپ ہمیشہ آسانی سے جان سکتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔''

نے ہمارے تارپور میں پولیس کا کوئی سپاہی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ اگر پولیس سے رابطہ کرکے مدد مانگی جائے تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اگر دارالحکومت سے پولیس کی نفری منگوائی جائے تب بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ نادر شاہ کے پاس کافی لوگ ہیں۔ وہ روپوش بھی ہو سکتا ہے۔ سارا کیس بگڑ جائے گا۔ اسے صرف نادر شاہ کو قانون کے حوالے کرنا ہے۔ شہر لے جانے کے لیے اب اس کے پاس وہ کار بھی نہیں تھی جس کے ذریعہ وہ معہ درشن خان وہاں آئے تھے۔ وہ کار اس نے نادر شاہ کے کسی ٹھکانے پر بھی نہیں دیکھی تھی۔ لازمی امر ہے کہ اسے پولیس اسٹیشن تک پہنچا دیا گیا ہوگا۔ شاہ میر کے دل میں خیال آیا کہ اسے اس ہوٹل کے پاس دیکھا جائے۔ چنانچہ وہ چل پڑا اب اسے یہاں کے بارے میں معلومات ہو چکی تھیں ویسے بھی راستے سنسان ہو گئے تھے چنانچہ وہ ہوٹل کے پاس پہنچ گیا۔ دور سے اس نے وہ جگہ دیکھی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہاں کار موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب پولیس کی تحویل میں پہنچ گئی ہوگی۔

دفعتاً ایک اور خیال شاہ میر کے ذہن میں آیا۔ یہ ایک خوفناک خیال تھا نادر شاہ کو اس کے بارے میں تشویش تو ہوگی۔ کار خواہ نہیں بھی ہو اس کے رجسٹریشن سے وہ شاہ میر کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے اور یہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسے بلیک میل کرنے کے لیے کہیں اس کے اہل خاندان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اس طرح کے لوگ زچ ہو کر ایسے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔

اچانک ہی شاہ میر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اگر نادر شاہ نے ایسا کوئی عمل کیا تو۔ میں تارپور میں قتل عام کردوں گا۔ اس سے منسلک ایک ایک شخص کو ختم کر دوں گا۔ وہ لازمی طور پر پرانے چرچ آتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے کہ اس کا دشمن اس کے اس ٹھکانے تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ وہ یہاں ضرور آئے گا اور اب آخری کام یہی کرنا پڑے گا کہ اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے چاہے اس کے لیے کوئی ایکشن کرنا پڑے۔ حالانکہ اسے پتا تھا کہ وہ اسمگلروں اور قاتلوں کا ٹولہ ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا وہ صرف دردانہ کے قاتلوں کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا باقی معاملات قانون کے ہیں۔

نادر شاہ پرانے چرچ اپنی کار پر آتا تھا۔ وہ جب بھی وہاں آئے گا اپنی کار پر ہی آئے گا اور اب اس کے علاوہ چارہ کار نہیں ہے کہ اس کی کار استعمال کی جائے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہاں آنے کے بعد پہلی بار اس نے اپنے سروس پستول کو چیک کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ پہلی بار وہ اس دوسری سڑک سے بس پر بیٹھ کر واپس آیا تھا بس نے اسے جہاں چھوڑا تھا یہ وہی بس اڈہ تھا جہاں سے اس نے زمان شاہ کو بس میں بٹھایا تھا۔ دوبارہ وہیں پہنچ کر اس نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ کچھ بسیں پھول گڑھی جا رہی تھیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر اسے وہی بس نظر آ گئی جس سے وہ چرچ سے یہاں تک آیا تھا۔ اس وقت اس پر جام پور کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جام پورہ وہی جگہ ہو سکتی تھی جہاں سے بس آ رہی تھی۔ بس میں کافی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خود بھی بس میں جا بیٹھا کچھ دیر تک مسافروں کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک سادہ سی صورت والے مسافر سے پوچھا۔

”یہ بس جام پورہ سے آگے نہیں جاتی۔“

”نہیں صاب جی۔ جام پورہ سے آگے تو مغل سرائے ہے۔ مغل سرائے کے لیے دوسری بس مل جائے گی۔“

”اچھا یہ بس جام پورہ سے تارپور تک آتی ہے۔“

”ہاں جی اور یہاں سے جام پور جاتی ہے۔“

شاہ میر خاموش ہو گیا۔ اب وہ ذہن پر زور دے رہا تھا کہ چرچ سے تارپور آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ نیز وہ کون سی نشانی ہے جس پر اترا جا سکتا ہے۔ بہت دیر تک وہ غور کرتا رہا تھا۔ پھر بس چل پڑی۔ شاہ میر غور کرتا رہا اس وقت وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اصل مسئلہ صحیح جگہ اترنے کا تھا۔ باہر کے مناظر تاریکی میں چھپے ہوئے تھے بس اس نے اپنی پوری توجہ راستے کے وقت پر مرکوز کر رکھی تھی۔ پھر جب اسے اندازہ

ہوا کہ وہ جگہ آ گئی ہے تو اس نے بس ڈرائیور سے بس روکنے کی استدعا کی۔

"خیر ہے صاب جی کیا بات ہے۔" ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے یہیں اترنا ہے۔ شاہ میر نے کہا اور ڈرائیور نے رفتار سست کر دی۔ بس کے تقریباً" تمام ہی مسافروں نے حیرت سے شاہ میر کو دیکھا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جونہی شاہ میر نے نیچے قدم رکھے بس ڈرائیور نے پوری رفتار سے بس بھگا دی۔ شاہ میر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے پستول ہاتھ میں لیا اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں جاگ رہی تھیں۔ ایک ایک درخت ایک ایک جھاڑی کو شناخت کرتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا ایک جگہ اسے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے بخوبی ان چمکتی آنکھوں کو دیکھا تھا جو اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ کوئی درندہ تھا پتا نہیں اس نے شاہ میر پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ چلا گیا اور شاہ میر نے آگے قدم بڑھا دیے۔ پھر اس نے کچھ فاصلے پر وہ بھوت محل دیکھ لیا اور اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے اندازے بالکل ٹھیک تھے البتہ اسے محتاط ہونا پڑا۔ بوسیدہ عمارت کے کچھ حصوں سے روشنی جھلک رہی تھی اور خبر بڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ فیصلہ کن مرحلہ آ گیا ہے۔ نادر شاہ اس کے اندازے کے مطابق اندر موجود ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ پوری احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ عمارت کے کچھ حصے روشن تھے لیکن سن گن لینے سے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ وہ آگے بڑھا اب وہ کوئی لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ پھر اسے نادر شاہ کی کار نظر آئی ساتھ ہی ایک اور کار نظر آ رہی تھی جسے دیکھ کر شاہ میر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ یہ اس کی اپنی کار تھی۔ تو یہ اب نادر شاہ کے قبضے میں ہے۔ اچھا کیا تو نے نادر شاہ میں تجھے اسی کار میں لے جاؤں گا۔

مسکرائیے

عقلمندی

حمید نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس نے ایک محفل میں انچاس اُبلے ہوئے انڈے کھا کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا

"تو ایک انڈا اور کھا لیتے تاکہ پورے پچاس ہی ہو جاتے۔" سلیم نے مشورہ دیا۔

"کیوں کھا لیتا ایک اور انڈا؟" حمید ذرا خفگی سے بولا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں ایک انڈے کی خاطر اپنے آپ کو وہاں پیٹو مشہور کر لیتا۔؟"

☆

اخبار پڑھ کر

ناشتے کی میز پر اخبار دیکھتے ہوئے رمضان نے بیگم کو بتایا۔

"پرسوں رات والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کتنی کامیاب محفل تھی۔"

"جی ہاں۔ مجھے بھی اخبار پڑھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔" رمضان کی بیگم نے جواب دیا۔

پستول ہاتھ میں سنبھال کر وہ اندر داخل ہو گیا اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ جس کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی وہ اس کے دروازے پر رکا اندر مکمل خاموشی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وسیع کمرے کے عین درمیان کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن دوسرے لمحے شاہ میر کو احساس ہوا کہ وہ صرف لیٹے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ تیز قدم اٹھا کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ اور پھر انہیں دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ وہ سب مردہ تھے۔ ان میں ایک نادر شاہ تھا' دوسرا اس کا وہ ساتھی جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ تیسرا بھی اس کا ساتھی تھا۔

شاہ میر سکتے کے عالم میں کھڑا تھا کہ اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ سانپ کی طرح پلٹا لیکن اسے ایک آواز سنائی دی۔ "نہیں انسپکٹر صاحب گولی مت چلانا میں روشن خان ہوں۔"

روشن خان سامنے آگیا۔ وہ دروازے کی سمت سے ہی اندر آیا تھا۔ شاہ میر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ روشن خان کی لاش کی گمشدگی اس کے لیے مشکوک ضرور تھی لیکن اس کے بعد کہیں سے روشن خان کا نشان نہیں ملا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا انسپکٹر مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے وقت کے بارے میں میں نہیں جانتا تھا کب آؤ گے۔"

"یہ لاشیں ہیں روشن خان۔" شاہ میر نے کہا۔

"ہاں یہ میرا شاہکار ہیں۔ ویسے تو اس پورے گروہ کو قتل کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن میرا اصل ٹارگٹ نادر شاہ ہی تھا اور میں نے اسے ختم کر دیا چاہے بنا کر لاؤں تمہارے لیے۔"

"نہیں روشن خان۔ آؤ بیٹھ کر باتیں کریں۔ شاہ میر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ اور دونوں ایک دوسرے کمرے میں آبیٹھے۔ روشن خان نے کہا۔

"میں بھی منشیات کے اسمگلروں کے اس گروہ میں شامل تھا۔ لیکن میں ان سے زیادہ ذہین اور اعلیٰ کارکردگی کا حامل تھا۔ نادر شاہ مقامی طور پر اس گروہ کا سرغنہ تھا لیکن میں نے کبھی اس کی برتری نہیں قبول کی اور اسے نیچا دکھاتا رہا یہاں تک کہ گروہ کے بین الاقوامی سربراہان نے ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ مجھے اس علاقے کا چیف بنا دیا جائے۔ یہ بات نادر شاہ کو سخت ناگوار گزری۔ میری بیوی مر چکی تھی بس ایک بیٹا میری کائنات تھی۔ آکسفورڈ میں پڑھتا تھا۔ نادر شاہ نے اسے دھوکے سے بلا کر مجھے بلیک میل کیا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے میرے بیٹے کو قتل کر کے اس کی لاش میرے پاس بھجوا دی۔ بس۔

بہت دیر تک روشن خاں کی کہانی کا تاثر قائم رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد وہ بولا "میں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے غم کے آنسو اس وقت بہاؤں گا جب اس کے قاتل کی لاش میرے قدموں میں پڑی ہو گی۔ آج میں پہلی بار رویا ہوں اسے یاد کر کے۔"

☼ ☼ ☼

شاہ میر تینوں لاشوں کو لے کر اچانک دارالحکومت پہنچا تھا۔ تھانے میں عملے کے دوسرے لوگ موجود تھے۔ اس نے صفورا اور زمان شاہ کو فون کیا اور دونوں شدید حیرانی کے عالم میں تھانے پہنچ گئے۔

روشن خان ان تینوں کے قتل کا اقبالی مجرم تھا اسے لاک اپ کر دیا گیا۔ شاہ میر نے ورک انچارج ہدایت اللہ سے پوری رپورٹ تیار کرائی اور پورے مواد کے ساتھ پولیس کے سب سے بڑے افسر اعلا سے ملا۔ افسر اعلا یہ سارے ثبوت اور شاہ میر کی رپورٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ لاشیں خاموشی سے سرد خانے میں رکھ دی گئی تھیں۔ افسر اعلیٰ نے کس کس سے میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں کیا کیا ہوا۔ لیکن پھر شاہ میر کو خصوصی طور پر طلب کیا گیا اور افسر اعلیٰ نے کہا۔

"تمہاری اعلا کارکردگی کا دل سے اعتراف کیا گیا ہے انسپکٹر کچھ پولی ٹیکل پرابلم ہیں جن کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان تمام واقعات کی خفیہ تحقیقات کی جائیں۔ روشن خان کو ہماری تحویل میں دیدو۔ ہمیں اس کی مدد درکار ہے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ تینوں لاشیں لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جائیں گی۔

"اور وہ مظلوم گھرانہ اور.... جس کی گردن اس لیے جھکی ہوئی ہے کہ لوگ اسے ایک بدکردار لڑکی کا گھرانہ سمجھتے ہیں۔ اور وہ مظلوم مقتولہ.... شاہ میر کی پھنکار ابھری۔

"مجبوری ہے انسپکٹر شاہ۔ ہم اس کیس کو اعلیٰ پیمانے پر شروع کریں گے تو کچھ غیر متعلقہ افراد کی گرفتاریاں ہوں گی۔ کچھ افسروں کے تبادلے ہوں گے اور بس۔ ہاں ایک وعدہ میں تم سے کرتا ہوں۔ دردانہ کے دونوں بھائیوں کو بہتر نوکریاں میں دلواؤں گا۔ اور ان لوگوں کو بہت معقول معاوضہ دے کر کسی دوسرے علاقے میں رہائش دلائی جائے گی۔ افسر اعلا نے کہا۔

☼ ☼

الٹ پھر

جعفر رضا

انسان سوچیں لامحدود ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات و تصورات میں ہی بہت کچھ حاصل کرلیتا ہے اور بہت کچھ گنوا دیتا ہے۔ چند کرداروں کے گرد گھومتی ایک پراسرار داستان جس کا ہر کردار اپنی جگہ ایک کہانی تھا۔

بارش اور طوفانی رات میں گھر جانے والے ایک مصنف کو پیش آنے والے واقعات کا پرتجسس ناولٹ



اچھے برے دن زندگی کا حصہ ہیں۔ یہ اور اس جیسے جملے میں نے بارہا اپنی کہانیوں میں لکھے تھے لیکن مجھے حقیقی طور پر معلوم نہیں تھا کہ برے دن کسے کہتے ہیں۔ پھر اچانک کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ آج میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں "وہ میرے بہت برے دن تھے"۔

میں ایک مصنف ہوں اور مختلف رسائل کے لیے فکشن اسٹوریز لکھتا ہوں۔ اس سے میری گزر بسر بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اپنا قدرے شاندار قسم کا ذاتی اپارٹمنٹ ہے۔ میں ہر سال اپنی کار تبدیل کرتا ہوں، بینک بیلنس بھی اچھا خاصا ہے اور میں نے شیئرز میں کچھ سرمایہ کاری بھی کی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تین چار طرح دار قسم کی محبوبائیں بھی ہمیشہ میری زندگی میں رنگینی بھرنے کو موجود رہتی ہیں۔ شاید اسی لیے میں نے شادی نہیں کی اور اب بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد اگر چاہتا تو کچھ بھی کیے بغیر اپنی زندگی آرام و سکون سے گزار سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں کچھ کیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اور کرنے کے لیے مجھے صرف ایک کام آتا تھا.... اور وہ کام کہانیاں لکھنا تھا۔

میری کہانیوں کے قارئین کا ایک اچھا خاصا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ میری تخلیق کردہ کہانیاں نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور پھر مجھے بھرپور تعریف سے نوازنے میں تخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کام میں کوئی ناغہ ہو اور کوئی دوسرا رائٹر میری جگہ لے لے۔ میرے علاوہ کسی کی تعریفیں کی جائیں۔

میرے برے دن اور برے حالوں کا سبب بھی یہی قارئین تھے جنھوں نے میری کہانیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر مجھے عظیم افراد کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد میرا سفر عظیم ترین افراد کی صف کی طرف تو جاری رہ سکتا تھا مگر یہ نہیں چاہتا تھا کہ عظیم افراد سے دوبارہ عام انسان بن جاؤں۔ جس کا خطرہ اب مجھے سر پر منڈلاتا ہوا صاف نظر آرہا تھا

کیونکہ گزشتہ دو ماہ کے عرصے میں بار بار کوشش کے باوجود میں ایک لفظ بھی لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ جس طرح کرکٹ کا کوئی نامور بلے باز جب آؤٹ آف فارم ہوتا ہے تو ان دنوں اس سے کچھ نہیں ہو پاتا جس گیند پر وہ چھکا مار سکتا ہے اسی گیند پر آؤٹ ہو کر پویلین کو سدھار جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ کرکٹ کی اصطلاح میں "آؤٹ آف فارم" تھا۔

میں سارا سارا دن کاغذ سامنے رکھ کر اور قلم ہاتھ میں تھام کر بیٹھا رہتا تھا مگر کسی کہانی کا ایک لفظ نہیں لکھا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ افریقی اور انڈین دونوں علاقوں میں پائی جانے والی تخلیق کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ کوئی نئی بات، کوئی نئی کہانی ذہن میں جگہ نہیں پا رہی تھی۔ شروع شروع میں تو مجھے کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا پھر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مجھ پر بے کیفی اور جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ میں جتنا زیادہ خود کو لکھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا، میری بے زاری میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اسی بے زاری کے باعث اپنی محبوباؤں سے بھی بے رغبتی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ یہ بھی بہت خطرناک بات تھی۔ میری زندگی میں ان حسیناؤں کی وجہ سے ہی تو کچھ رونق اور رنگینی تھی۔ یہ بھی اگر ختم ہو جاتی تو میں زندہ کیوں کر رہتا؟

میں یہ سب سوچتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ ایک عجیب سی کیفیت نے میرے وجود پر قبضہ جما لیا تھا کہ کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔

یہ سلسلہ مزید نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ مجھے نکی کا فون موصول ہوا۔

نکی سے میری واقفیت بہت پرانی تھی۔ جب میں نیا نیا لکھنے لکھانے کی طرف آیا تھا۔ اس وقت کچھ عرصہ اس نے میری اسٹینو کی حیثیت سے میرے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ ایک قابل اور سمجھ دار لڑکی تھی اور کسی ملازمت کا وہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ میرے ساتھ چند ماہ رہی پھر اسے ایک سرکاری دفتر میں بہتر ملازمت مل

گئی۔ آج کل وہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں تھی اور اکثرو بیشتر اپنے باس کے جلو میں ٹی وی اسکرین پر نظر آتی تھی۔ اس کا باس اسٹیٹ سیکریٹری تھا اور قومی و بین الاقوامی امور پر آئے دن پریس بریفنگ دینا اس کے فرائض میں شامل تھا۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے فون پر بات کرتی رہی پھر ایک ملاقات کے وعدے پر اس نے فون بند کردیا۔

اس کے فون بند کرنے کے بعد میں کافی دیر تک ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں واقعات کی ایک ریل چلنے لگی تھی۔ وہ واقعات جن میں نکی میرے ساتھ شامل رہی تھی۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور سگریٹ سلگا کر ماضی کو ذہن میں تازہ کرنے لگا۔



میں اور نکی واشنگٹن سے نیویارک واپس آرہے تھے۔ میں ایک پبلشر سے ایک ناول کے حقوق کا معاہدہ کرنے واشنگٹن گیا تھا اور میری سیکریٹری کی حیثیت سے نکی اس سفر میں میرے ساتھ تھی۔ ہمارا سفر بذریعہ کار جاری تھا اور باس ہونے کے باوجود ڈرائیونگ میری ذمے داری تھی' نکی کی ذمے داری صرف میری ناز برداری تھی۔

اب اسے خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی کہ راستے میں جیکس برگ کا مشہور معروف شہر بلکہ قصبہ بھی پڑتا تھا۔ میرا اس طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم نے میری لینڈ پنسلوانیا سے گزر کر خاصا وقت کلپز ہل کے آس پاس گزارا تھا اور ہمارا رخ ڈونسن برگ کی طرف تھا۔ تاہم ہم کلپز ہل سے ذرا آگے نکلے تھے کہ آسمان کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ چند لمحوں میں اتنی تاریکی چھاگئی کہ مجھے کار کی ہیڈلائٹس کو روشن کرنا پڑا۔ ہماری کار کی چھت کھلی ہوئی تھی اور مئی کے اواخر کی ہوا میں نمی شامل ہوکر ہمارے جسموں میں کپکپی کا احساس پیدا کررہی تھی۔

"موسم کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں آرہے۔" نکی نے فکر مند لہجے میں کہا اور ہوا کے باعث چہرے پر آجانے والے سنہرے بالوں کو ایک طرف ہٹایا۔

"فکر نہ کرو۔ ان دنوں یہاں ایسا ہی موسم ہوتا ہے اور ہماری منزل دور نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا مگر اندر سے میرا دل بھی گھبرا رہا تھا۔

میری بات مکمل ہوئی تھی کہ اچانک ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ بجلی چمکی اور پرشوار آواز کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ اس کی رفتار اور مقدار دونوں اس قدر شدید تھیں کہ لمحوں میں ہم بری طرح بھیگ گئے۔

میں نے گھبرا کر کار روک دی اور ترپال کی سمٹی ہوئی چھت کو کھولنے کے لیے کار سے نیچے اتر گیا۔ بے دھیانی میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کار گیئر میں پھنسی رہ گئی تھی نتیجتاً اس نے ایک جھٹکا لیا اور اس کا انجن بند ہوگیا۔ میں نے چھت کھولی اور دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کلچ دبا کر گاڑی کو صحیح طرح گیئر سے نکالا اور چابی کو اگنیشن میں گھمایا' انجن میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی مگر وہ پوری طرح اسٹارٹ نہیں ہوسکا۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی اس بار کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ٹھس ٹھس کی چند آوازیں آئیں اور خاموشی چھاگئی۔

"لعنت ہو۔" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "اب اسے کیا ہوگیا؟" یہ سوال میں نے خود یا پھر کار سے کیا تھا اس لیے نکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شاید انجن میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے خود ہی جواب دیا اور کئی مرتبہ پھر کوشش کی۔ اس بار بھی نتیجہ وہی نکلا اور انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔

"اب کیا ہوگا؟" نکی نے سہمے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا "اس موسم میں میرے اندر چلنے کی ذرا بھی ہمت نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں اس خراب کار کے ساتھ بھیگے ہوئے چوہوں کی طرح رات یہیں گزارنی چاہیے؟" اس کے انداز نے مجھے کھولا دیا تھا۔ اسی وقت میری نگاہ کچھ دور ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں پر پڑی

جو تاریک رات میں لائٹ ہاؤس کا سا کام کر رہی تھیں۔

"ہم یہاں رک کر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔" اس بار میری آواز قدرے نرم تھی "وہ دیکھو سامنے کچھ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں وہاں کوئی مکینک مل جائے گا۔"

"اوہ....!" وہ دردناک آواز میں کراہی "یہ موسم اور پیدل.... بڑی مشکل ہے۔" یہ جملہ شاید اس نے اپنے آپ سے کہا تھا کیونکہ اسی کے ساتھ وہ کار سے باہر نکل گئی۔

میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ کار میں خوش قسمتی سے ایک برساتی موجود تھی وہ میں نے نکی کو دے دی۔

قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑا اور پانچ سات منٹ کی واک کے بعد ہم ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بوڑھے شخص نے گردن نکال کر ہمیں دیکھا۔ وہ نحیف الوجود اور پستہ قد بوڑھا تھا جس کی بھوؤں تک کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ تھی جو شاید ہماری حالت دیکھتے ہی اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔

"فوراً اندر آجاؤ۔" اس نے دروازہ پوری طرح کھولتے ہوئے سرزنش کرنے کے انداز میں کہا۔ "تم جتنا بھیگ چکے ہو وہ تمہیں نمونیا میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے.... اور ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

اس کا انداز تحکمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ محبت آمیز بھی تھا لہٰذا ہم نے فوراً اس کی ہدایات پر عمل کیا۔

"برساتی کی وجہ سے لڑکی کی تو کچھ بچت ہو گئی ہے.... مگر مسٹر....؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"جیفری.... جیفری کوئن۔" میں نے اس کی نظروں کے جواب میں کہا "میں ایک رائٹر ہوں اور یہ ہیں مس نکی.... میری سیکریٹری۔" میں نے اپنے علاوہ نکی کا بھی تعارف کرا دیا۔

"تو مسٹر جیفری کوئن.... میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم فوراً کپڑے بدل لو اور لڑکی! تم آتش دان کے سامنے جا کر بیٹھ جاؤ۔" آخری جملہ اس نے نکی کو مخاطب کر کے کہا۔

ہم سب ڈرائنگ روم میں پہنچے جو سادگی سے سجا ہوا تھا۔ باہر کے مقابلے میں اندر کی فضا میں خوش گوار حرارت تھی جس نے میرے اکڑے ہوئے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا۔ اس کے بعد جب میں کپڑے بدل کر آتش دان کے سامنے پہنچا تو میں نے خود کو نیا انسان محسوس کیا۔

اتنی دیر میں نکی اپنی روداد اس بوڑھے کو سنا چکی تھی جو خود کو ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔

"تم اس بارے میں فکر مند نہ ہو۔" بوڑھا نکی کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اور آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ میں لیویگلے کو کار کی چابیاں بھجوا دوں گا وہ اسے ٹھیک کر کے یہیں پہنچا دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہ ہو گا۔" میں ان دونوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ "تم نے ہماری وجہ سے خاصی تکلیف اٹھائی ہے۔ اب بہتر ہو گا کہ تم مکینک سے میرا رابطہ کرا دو تاکہ ہم اس کی مدد سے کار کو ٹھیک کروا کر اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" بوڑھے نے حتمی لہجے میں سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا "اس موسم میں تم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ رات گزر جائے پھر صبح جہاں جی چاہے وہاں چلے جانا۔"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بوڑھا اپنے گھر میں تنہا معلوم ہوتا تھا۔ زمانہ خراب تھا اور نہ جانے اس بوڑھے کے کیا ارادے تھے۔

"یہ تمہارا گھر ہے اور ہم اسے ہوٹل یا گیسٹ

ہاؤس میں تبدیل نہیں کرنا چاہیں گے لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم اپنی کار کی مرمت کرا کے اپنا کوئی بندوبست کرلیں۔" میں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کوئی بات مجھے مجبور نہیں کر سکتی۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں اس لیے اب بات بڑھانے کی کوشش نہ کرو اور سکون سے یہاں بیٹھو۔" بوڑھے نے نفی میں گردن ہلائی اور پھر بولا "میں تمہارے لیے گرم گرم کافی بنا کر لاتا ہوں۔ اس موسم میں کافی تمہارے لیے اکسیر کا کام کرے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائنگ روم سے نکلنے والے دروازے کا رخ کرلیا۔

میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ "اب جو ہونا ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔" میں نے سوچا۔

کافی بڑی لذیذ تھی۔ بوڑھے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ ہم تینوں کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران میں اس نے اپنا تعارف بھی کرا دیا تھا۔

"میرا نام ڈاکٹر مارٹن ہے۔ مریضوں کے معالج کے علاوہ میں اس قصبے کا میئر اور پولیس چیف بھی ہوں۔" وہ آنکھیں مٹکا کر ہمیں بتا رہا تھا۔ "اس قصبے میں اکثر لوگ دو کام کرتے ہیں جیسے لیو بکلے جو موٹر مکینک ہونے کے ساتھ ساتھ فائر بریگیڈ کا چیف بھی ہے.... اور بل یوڈر جو ہارڈ ویئر کا اسٹور چلاتا ہے مگر اس کے ساتھ یہاں مرنے والوں کے کفن دفن کا بندوبست کرنا بھی اس کی ذمے داری ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں کی آبادی خاصی کم ہے۔" میں نے تبصرہ کیا پھر پوچھا "ویسے ڈاکٹر! پولیس چیف کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کا موقع تو کم ہی ملتا ہوگا۔ آبادی کم ہونے کے باعث یہاں جرائم بھی کم ہوتے ہوں گے؟"

ڈاکٹر ہنسنے لگا "اس کا مطلب ہے کہ تمہاری مصنف والی حس جاگ اٹھی ہے۔ تم رائٹرز کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہر بات میں کہانی ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہو۔"

"تم نے غلط نہیں کہا۔" نکی خاموش نہ رہ سکی۔ "مگر اس کے ساتھ ایک وجہ اور بھی ہے۔ مسٹر کوئن کے والد نیویارک پولیس کے آفیسر رہ چکے ہیں اس لیے جرم سے ان کی دلچسپی موروثی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔" ڈاکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر کہا "بہرحال میں بتا رہا تھا کہ واقعی پولیس چیف کی حیثیت سے مجھے بہت کم ہی کام کرنا پڑتا ہے جیسے کہ گزشتہ ایک سال میں صرف ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جس کی تحقیق میرے ذمے آئی تھی۔"

"واقعہ یا کوئی جرم؟" نکی نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"اوہ! میں بھول گیا تھا کہ میں ایک مصنف اور اس کی ذہین سیکریٹری سے گفتگو کر رہا ہوں اس لیے مجھے بولتے ہوئے الفاظ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔" اس نے نکی کی مداخلت کا برا منائے بغیر خوش دلی سے کہا "بہرحال تم درست کہہ رہی ہو۔ وہ ایک جرم تھا جس کے مجرم کا کچھ پتا نہ چل سکا.... اور جرم تھا ایک بے گناہ کا قتل....!" وہ ڈرامائی انداز میں اچانک خاموش ہوگیا۔

"بولو.... بولو خاموش کیوں ہوگئے۔" نکی نے اس کے انداز کو سمجھ کر پراشتیاق لہجے میں اسے اکسایا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم لوگ صرف آج کی رات میرے مہمان ہو۔ ایک مصنف ہو اور جرم و سراغ رسی کی کہانیاں لکھتے ہو تو...." وہ پرسوچ انداز میں خاموش ہوا پھر لمحہ بھر بعد دوبارہ بولا "میں واقعی ایک احمق انسان ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک فکر نے بھی گھیرا ہوا ہے۔"

"کیسی فکر؟" اب کی بار میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں نظر آرہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم سے بات کی جاسکتی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے گویا ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "کل کا دن یہاں

کے لوگوں کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کل امریکی سول وار کے اختتام کی سال گرہ منائی جاتی ہے۔"

"یہ دن تو پورے امریکا میں منایا جاتا ہے۔" نکی نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کی "پھر یہاں کیا خاص بات ہے؟؟"

"بات ہے... اور بہت ہی خاص بات ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے جواب دیا۔ اس نے اس بار بھی نکی کی مداخلت کو اس کی بے تابی سمجھ کر نظرانداز کردیا "اس قصبے میں گزشتہ سال تک تین افراد ایسے موجود تھے بلکہ ان میں سے دو اب بھی ہیں، جنہوں نے امریکی سول وار کے دوران امریکی عوام کی آزادی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی موجودگی کے باعث ہم لوگ ان پر فخر کیا کرتے تھے اور ہر سال اس دن کو منانے کے لیے خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ مگر اس سال..." اس کی آواز میں فکرمندی کے ساتھ دکھ کی جھلک بھی آگئی تھی۔ "اس سال ہم سب بہت دکھی ہیں کہ پچھلے سال کے واقعے کے باعث ہم یہ دن کس طرح منائیں گے!؟"

"کیوں ایسا کیا ہوگیا ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہمارے درمیان موجود فخر کی تین علامتوں میں سے ایک گزشتہ سال عین اسی دن پراسرار حالات میں مارا گیا۔"

"اوہ!" نکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم مجھے اس واقعے کی تفصیل بتاؤ گے؟" میں نے پراسرار حالات کے امکانات کو ذہن میں دہراتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے مجھے اس طرح دیکھا گویا وہ اس فرمائش کی توقع نہ کررہا ہو۔

"بلکہ اس سے بھی پہلے مناسب ہوگا کہ تم تینوں ہیروز کے بارے میں کچھ بتاؤ اور پھر گزشتہ سال کے واقعے کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہو۔" میں نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کوئن بالکل درست کہہ رہے ہیں۔" نکی نے سرہلا کر میری سفارش کی۔

"اونہہ..." ڈاکٹر مارٹن نے ہنکارا بھرا اور پھر گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ چلو اس طرح رات کا کچھ حصہ گزر جائے گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کے لیے اس سارے سلسلے میں کوئی زیادہ دلچسپی کا سامان نہیں ہے لیکن بہرحال اب تم لوگ اصرار کررہے ہو تو سنو...!"

میں پوری طرح بوڑھے ڈاکٹر کی طرف متوجہ تھا اور نکی بھی پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس قصبے میں سول وار کے تین ہیرو تھے۔ ستانوے سالہ ایٹ ویل، پچانوے سالہ **بیگلو** جو اپنے پوتے اینڈی اس کی بہو اور سات پڑپوتوں کے ساتھ رہتا ہے... اور تیسرا ہے چورانوے سالہ چیز، خوب صورت سسی چیز کا نانا۔" ڈاکٹر مارٹن آنکھیں موندے ان کے نام اور مختصر سے کوائف بتا رہا تھا "اور اس سال ہم ایٹ ویل کے بغیر یہ دن منائیں گے کیونکہ..."

"تو گویا پچھلے سال پراسرار حالات میں ہلاک ہونے والے ہیرو کا نام ایٹ ویل تھا۔" نکی نے درمیان میں کہا تو ڈاکٹر نے آنکھیں کھول دیں اور تائیدی نظر سے نکی کو دیکھا۔

"اے، بی، سی۔" میں نے زیرلب کہا مگر غیرارادی طور پر میری آواز کچھ بلند ہوگئی تھی۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں... بس ذرا میرا دماغ کچھ حسابی کتابی قسم کا ہے۔" میں نے شانے اچکا کر کہا "ایٹ ویل، **بیگلو** اور چیز... یعنی اے سے ایٹ ویل، بی سے **بیگلو** اور سی سے چیز... یہ تو نرسری جماعت کا قاعدہ ہوگیا۔ تم نے بتایا کہ گزشتہ سال ایٹ ویل اس دنیا سے رخصت ہوگیا گویا اے بی سی میں سے "اے" تو گیا..." یہ کہہ کر میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر بولا "بڑی دلچسپ صورت ہے۔ کہیں تمہیں یہ ڈر تو نہیں ہے کہ اس سال "بی" کا کام تمام نہ ہوجائے؟"

"میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔" ڈاکٹر

نے خوش دلی سے کہا ”ویسے یہ معاملہ شاید اتنا سیدھا نہیں ہے کہ اے کے بعد بی اور پھر سی..... بہتر ہوگا کہ میں تمہیں ایٹ ویل کے مرنے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں..... ہم ہر سال ایٹ ویل، بیگلو اور چیز اس یادگار موقع پر اپنی پرفارمنس کا مظاہرہ کیا کرتے تھے جو اس تقریب کا اہم ترین آئٹم تھا۔ وہ اس دن کی پریڈ کی قیادت کرتے تھے اور ان تینوں میں سے عمر رسیدہ ترین فرد.....“

”یعنی ایٹ ویل جس کی عمر ستانوے سال تھی؟؟“ نکی نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر کی بات میں مداخلت کی۔

”بالکل۔“ ڈاکٹر اس مداخلت پر کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”وہ اس موقع پر جنگ کے دور کا بگل بجایا کرتا تھا جس پر تمام پریڈ سلامی دیتی تھی۔ بہرحال پچھلے سال سب کچھ معمول کے مطابق تھا اور ایٹ ویل پورے جوش و خروش کے ساتھ بگل بجا رہا تھا کہ اچانک وہ جھکا اور پھر زمین پر گرتا چلا گیا۔ ہم سب اس کی طرف دوڑے مگر جب ہم نے اسے ہاتھ لگایا اس وقت تک وہ مر چکا تھا۔“

”بے چارہ.....“ نکی نے افسوس کا اظہار کیا ”تاہم کسی سپاہی کے لیے یہ بڑی شاعرانہ سی موت تھی۔“

”ہو سکتا ہے کہ تم موت میں بھی شاعرانہ انداز تلاش کر لیتی ہو؟“ ڈاکٹر نے نکی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا ”مگر میں شاید اس سفاکی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ موت تو بس موت ہوتی ہے؟ بھیانک اور خوف زدہ کرنے والی موت۔ جس کے بارے میں سوچتے ہوئے لوگ کپکپا جاتے ہیں۔“ اس لمحے اس بوڑھے ڈاکٹر کے چہرے پر بھی پیلاہٹ آگئی تھی۔

وہ میرے جوانی کے ابتدائی ایام تھے اس لیے شاید ڈاکٹر کی بات پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ”ویسے اس کی عمر رسیدگی کی وجہ سے اس کی موت پر تمہیں کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوا ہوگا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے عمومی انداز میں پوچھا۔

”شبہ تو ہوا تھا۔“ ڈاکٹر نے غیر متوقع جواب دے کر نکی اور مجھے دونوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ”اگرچہ کسی ستانوے سال کے بڈھے کا مر جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوتی مگر صرف ایک دن پہلے میں نے اس کا طبی معائنہ کیا تھا اور اس کی جسمانی و ذہنی حالت دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی عمر کی سنچری ضرور پوری کرے گا لہٰذا جب صرف ایک دن بعد وہ اچانک اس طرح مر گیا تو میرا شک زدہ ہونا لازمی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے بڑھاپے کی وجہ سے سٹھایا ہوا سمجھو مگر حقیقت یہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس کی موت کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟“ میں نے اس کی رائے جاننے کے لیے پوچھا۔

”یہی تو میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ اس کی موت غیر معمولی کیوں تھی؟ مجھے اس کا بہت افسوس بھی ہے۔“ ڈاکٹر نے تاسف بھرے انداز میں کہا ”میں تو اس کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہتا تھا مگر یہاں کے تقریباً تمام ہی لوگوں نے میرے خیال کا مذاق اڑایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ستانوے سالہ بوڑھے کے مرنے میں بھلا کیا غیر معمولی بات ہو سکتی ہے جو میں خواہ مخواہ ایک مردے کی بے حرمتی پر تلا ہوا ہوں۔ ان کے اصرار کے آگے مجھے بھی سر جھکانا پڑا اور اب مجھے اپنی اس کمزوری پر افسوس ہو رہا ہے۔“ وہ افسوس زدہ انداز میں خاموش ہو کر سر ہلانے لگا۔

”یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“ میں نے تبصرہ کیا۔ اس عمر میں تو لوگ مر ہی جایا کرتے ہیں پھر تمہیں کیا بات غیر معمولی محسوس ہوئی تھی؟ تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ اپنی موت نہیں مرا تھا بلکہ کسی نے اسے.....“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے بوڑھے ڈاکٹر کو دیکھا۔

”شش..... شاید..... یا شاید نہیں۔“ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

”کیا وہ کوئی دولت مند شخص تھا؟“ اس کی جھجک کے پیش نظر میں نے دریافت کیا۔

”اس کے پاس تو کوئی ایسا برتن بھی نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا ”مگر اس کی موت

کے بعد کسی کو ایک بڑی رقم حاصل ہو سکتی ہے!"

"انشورنس وغیرہ؟" نکی نے پوچھا۔

"یہ کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے۔۔۔ البتہ۔۔۔" وہ ایک مرتبہ پھر ہچکچایا "البتہ یہ ہے کہ ان تین ہیروز کے حوالے سے ہمارے قصبے میں ایک کہانی بڑی مشہور ہے۔ میں تو اپنے بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں کہ ان تینوں کو جنگ کے زمانے میں کسی جگہ سے ایک خزانہ ملا تھا۔"

"خزانہ۔" نکی نے بے ساختہ حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ خزانہ۔۔۔" بوڑھے ڈاکٹر نے مستحکم لہجے میں دہرایا "کہانی کے مطابق وہ اس خزانے کو اپنے ساتھ لے آئے تھے اور انہوں نے کسی جگہ اسے چھپا دیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے حتیٰ کہ ان تینوں میں سے کسی دو کی موت ہو جائے۔ اس کے بعد بچ جانے والے کو وہ خزانہ مل جائے گا۔"

"حیرت انگیز!" میں نے کہا "خاصی دلچسپ کہانی ہے مگر میرے لیے اس پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ ایسا خزانہ کس کام کا جو سو سال کی عمر میں جا کر ملے۔۔۔ ہا۔۔۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا "ویسے اس میں شک نہیں کہ تم نے ان باتوں میں الجھا کر وقت کا احساس مٹا دیا ہے۔ اب رات خاصی ہو چکی ہے اس لیے اگر تم ہمیں بیڈ روم کا راستہ دکھا دو تو تمہاری مہربانی ہو گی۔"

"تمہاری مرضی۔" ڈاکٹر نے شانے اچکا کر کہا "ویسے یہ کہانی اس قصبے کا بچہ بچہ جانتا ہے اور سب اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ نکی کچھ مایوس نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ خزانے کے موضوع پر کچھ اور سننے کی خواہش مند تھی۔ خزانہ چیز ہی ایسا ہوتا ہے کہ سب اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بات کرنا چاہتے ہیں۔



صبح بہت روشن اور خوش گوار تھی۔

اس صبح کی روشنی میں نکی کی آنکھیں کچھ اور بھی چمکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ بے دار ہوئے اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ بوڑھا مارٹن کچن میں تھا۔

"مارننگ۔" ہم دونوں پر نگاہ پڑتے ہی اس نے خوش گوار انداز میں کہا "تمہارا ناشتا پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"اوہ۔" نکی نے خجالت آمیز انداز میں کہا "مجھے لگتا ہے کہ ہمارے ناشتے کے چکر میں تم نے صحیح طرح نیند نہیں لی ہو گی۔"

"میں تو گزری رات کو ایک لمحہ بھی نہیں سو سکا۔" بوڑھے مارٹن نے کہا "تم لوگوں کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سسی چیز تھی جو مجھے ہنگامی طور پر بلا رہی تھی۔"

"سسی چیز!" میں نے بھویں سکیڑ کر دہرایا "ڈاکٹر! اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ نام ہماری رات کی گفتگو میں آیا تھا۔"

"بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ تیسرے سپاہی کی خوب صورت نواسی۔" ڈاکٹر نے تائید کرتے ہوئے کہا "بے چاری سسی یتیم ہے اور اپنے نانا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے دس سال کی عمر سے اپنے نانا کی ذمے داریوں کو سنبھالا ہوا ہے۔ بہت اچھی بچی ہے۔"

"تو کیا اس کے نانا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میری پوری رات اس کے ساتھ صرف ہوئی مگر۔۔۔" اس نے ایک سرد آہ بھری اور گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا "مگر آج صبح ساڑھے چھ بجے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

"اور آج بھی اس قصبے کا میموریل ڈے ہے۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا "کیا یہ بھی محض اتفاق ہے؟"

چند لمحوں تک سب خاموش رہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے ہی اس خاموشی کو

توڑا اور پوچھا "چیز کی موت کی وجہ؟"
"مرگی۔" ڈاکٹر نے ایک لفظ کہا اور خاموش ہو گیا۔
"اتنی خطرناک مرگی؟" میرے لہجے میں حیرت تھی "کیا اسے دورہ پڑا تھا؟"
ڈاکٹر مارٹن نے اس سوال پر ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طبی دنیا بہت آگے نکل چکی ہے اور میرا علم شاید اتنا وسیع نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ مرگی کے باعث اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی تھی جس کے بعد وہ ہلاک ہو گیا۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے!"
"ہاں مگر عین میموریل ڈے پر اس کی دماغ کی رگ کا پھٹ جانا تو غیر معمولی بات ہے۔" میں نے اپنی بات پر اصرار کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"انسان ایک پیچیدہ اور ناقابل فہم جاندار ہے۔ کبھی کبھار یہ جھوٹ کو بھی اس طرح ہضم کر لیتا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو حیرت ہوتی ہے اور کبھی سچ کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔" ڈاکٹر نے یکایک فلسفیانہ انداز اختیار کر کے بولنا شروع کر دیا۔ "شاید فطرت خود بھی اس کی متلون مزاجی سے تنگ ہو گی۔ اس معاملے میں بھی یہی ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ چیز کی موت سو فیصد نارمل تھی مگر تم اس میں پراسراریت ڈھونڈ رہے ہو!"
یہ کہہ کر وہ اچانک مسکرایا اور پھر موضوع کو یکسر تبدیل کر کے بالکل عام سے انداز میں بولا "تم لوگ ناشتے میں کس طرح کے انڈے کھانا پسند کرتے ہو؟"
"انڈوں کو مجھ پر چھوڑو۔" نکی نے درمیان میں کہا "تم اوپر جاؤ اور کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔"
"تمہارے پر خلوص مشورے کا شکریہ۔" ڈاکٹر نے محبت آمیز لہجے میں کہا "مگر میرا خیال ہے کہ آج کے یادگار دن مجھے آرام نہیں کرنا چاہیے۔ آخر میں اس قصبے کا میئر بھی ہوں میرے بغیر آج کی تقریب ادھوری اور بے مزا سی رہے گی۔ اگرچہ چیز کی بے وقت موت کے باعث تقریب پر سوگواری ضرور چھائی رہے گی مگر بہرحال مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا۔ ویسے تو کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ چیز کی آخری رسومات کو آج کی یادگار تقریب کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ یہ ایک طرح سے ہم قصبے والوں کی طرف سے اپنے ایک سپاہی کو بہترین خراج تحسین ہو گا۔"
یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر اچانک ہی نئی بات نکالتے ہوئے بولا "ویسے مسٹر جیفوی میری آج صبح لیو بیگلے سے بات ہوئی تھی اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں تمہاری کار تیار کر دے گا۔ میئر کے مہمان کے لیے وہ آج کے دن بھی کام کرنے کو تیار ہے۔ تو پھر تم کب تک روانگی کا سوچ رہے ہو؟"
"میں۔۔۔" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت میری نظر نکی پر پڑی جو ملتجیانہ نگاہوں سے مجھے تک رہی تھی۔ شاید وہ اس قصبے میں رک کر یادگاری تقریب میں شریک ہونا چاہتی تھی "فوری روانگی تو شاید ممکن نہ ہو سکے' ویسے میں سوچ رہا تھا کہ ان تین سپاہیوں میں سے بچ جانے والے بیگلوز پر اپنے دوسرے ساتھی کی موت کا کیا اثر ہو گا۔ اسے تو شاید اس بارے میں ابھی علم نہیں ہو گا!"
"اسے علم ہو چکا ہے مسٹر جیفوی!" بوڑھے ڈاکٹر نے پژمردگی سے کہا "چیز کے گھر سے لوٹتے ہوئے اس کا گھر راستے میں پڑتا تھا لہٰذا میں نے سوچا کہ اسے اس خبر سے مطلع کرتا چلوں۔"
"کتنی بری بات ہے۔" نکی نے افسوس زدہ انداز میں سر ہلایا "بے چارے کو یہ جان کر کیسا محسوس ہوا ہو گا کہ وہ اب اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے!"
"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا "شاید یہ عمر کا تقاضا ہے کہ اب موت اس کے لیے کوئی دکھ کی بات نہیں رہی۔ اس نے خاموشی سے اس خبر کو سنا اور صرف ایک جملہ کہا "اب یہ سوچو کہ جب میں بگل بجا رہا ہوں گا تو گمنام سپاہی کی یادگار پر پھولوں کی چادر کون چڑھائے گا؟ بہرحال تم یہ بتاؤ کہ تمہاری روانگی کب تک ہے؟"

”نکی.....!“ میں نے منمناہٹ آمیز انداز میں اپنی سیکریٹری کو مخاطب کیا ”ہمیں یہاں سے رخصت ہونے کی ایسی کوئی خاص جلدی تو نہیں ہے نا؟“

”میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی خاص جلدی تو نہیں ہے۔“ نکی نے فوراً جواب دیا۔

”تو پھر نیویارک کے دو محب وطن شہری اگر اس قصبے کی یادگاری تقریب میں شریک ہونا چاہیں تو اس قصبے والوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے؟“ میں نے شرارتی نظروں سے ڈاکٹر مارٹن کو دیکھا اور اس نے خوش دلی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔



چیز کا گھر اسی مقام پر واقع تھا جس کی نشاندہی ڈاکٹر مارٹن نے کی تھی۔ اس وقت اس کا مرکزی پھاٹک کھلا ہوا تھا اور پورچ میں اچھے خاصے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں اور نکی ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ ہمیں چیز کی نواسی سسی چیز کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

وہ چوڑے شانوں والی ایک گداز بدن خوب صورت لڑکی تھی جو لوگوں کے درمیان کھڑی تھی۔ رونے کی وجہ سے اس کی ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سب لوگ اس سے اظہار تعزیت کر رہے تھے اور وہ ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تعزیت قبول کر رہی تھی۔

”مس سسی چیز!“ میں نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ میری آواز سنتے ہی مجمع میں جاری بھنبھناہٹ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے ہم اجنبیوں کو خشک زدہ سی نظروں سے گھورنے لگے۔ کئی ایک نے بے چینی سے پہلو بھی بدلا تھا۔

”میرا نام جیفری کوئن ہے اور یہ ہیں میری سیکریٹری مس نکی پورٹر۔“ میں نے بلند آواز میں اپنا اور نکی کا تعارف کرایا اور کہا ”ہم دونوں اس عظیم قصبے کے میئر ڈاکٹر مارٹن کی دعوت پر آج کی یادگاری تقریب میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس تعارف نے لوگوں پر خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ ان کے سرد تاثرات گرم جوش مسکراہٹوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ”اور ڈاکٹر مارٹن نے کہا ہے کہ ہم اس جگہ اس کا انتظار کریں۔“ یہ کہہ کر میں سسی چیز کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے اس کے نانا کی موت پر تعزیت کرتے ہوئے کہا ”مجھے تمہارے سپاہی نانا کی اس بے وقت موت پر بہت دکھ ہوا ہے۔“

”تم یقیناً“ ان پر بہت فخر کرتی ہو گی۔“ نکی نے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

”شکریہ۔“ اس نے انکساری کے ساتھ جواب دیا ”مجھے واقعی ان پر فخر تھا اور وہ اچانک مجھے تنہا چھوڑ کر.....“ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ ”بہرحال تم لوگ اندر آ جاؤ۔ میرا مطلب ہے کہ گھر کے اندر چلو۔ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر میئر کا انتظار کر سکتے ہو۔ ویسے اب میرے نانا کی میت اندر نہیں ہے۔ انہیں تو تیار کرنے کے لیے لے جایا جا چکا ہے۔“

سسی چیز کی آواز بھرائی تھی اور پھر اس نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ نکی آگے بڑھی اور اسے تسلیاں دینے لگی۔

”کیا ان لوگوں میں بیگلو اور اس کا پوتا اینڈریو شامل ہیں؟“ میں نے سسی چیز کا دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

”اوہ..... وہ تو شاید ابھی تک نہیں آئے۔“ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر کہا۔

”وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟“ میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”پتا نہیں..... میرے لیے تو یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب جیسا ہے۔“ سسی چیز نے جواب دیا۔

”واقعی۔“ میں نے تائید کی اور ”اب تم بالکل اکیلی رہ گئی ہو۔ ویسے کیا تمہارا کوئی رشتے دار نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

”اور تمہارا کوئی نوجوان دوست بھی نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا پھر تلخ آواز

میں بولی "کوئی نوجوان مجھ سے دوستی کیوں رکھے گا؟ میرے پاس ہے کیا؟ یہ لباس جو میں نے پہن رکھا ہے تقریباً" چار سال پرانا ہے۔ میں تو اپنے نانا کی پنشن پر گزر بسر کر رہی تھی۔ بھلا مجھ جیسی مفلوک الحال لڑکی کی طرف کوئی لڑکا کیوں کر متوجہ ہو گا؟" اسے شاید اپنی بے بسی پر پھر رونا آنے لگا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں جلد ہی کوئی اچھا ساتھی مل جائے گا۔" نکی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اس بے ہودہ قصبے میں؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ نکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

وہ تینوں گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

"مسی۔" میں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا "ڈاکٹر مارٹن نے کچھ خزانے وغیرہ کا تذکرہ کیا تھا۔ کیا تمہیں اس بارے میں کچھ علم ہے؟"

"وہ خزانہ..... ہاں اس کے بارے میں گریٹ گرینڈ پا نے اپنی پوری زندگی میں دو مرتبہ کچھ ذکر کیا تھا۔ وہ ذکر بھی اتنا سرسری تھا کہ مجھے اس پر یقین کرنا مشکل ہی لگتا رہا ہے لیکن اس علاقے کا بچہ بچہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔"

"دراصل سننے میں آیا ہے کہ ان تین سپاہیوں نے وہ خزانہ کہیں چھپانے کے بعد یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کا کبھی ذکر نہیں کریں گے حتیٰ کہ ان تینوں میں سے دو کی موت نہ ہو جائے۔ یعنی تیسرا بچ جانے والا سپاہی اس خزانے کا اکیلا مالک ہو گا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میری رائے میں تو یہ سراسر بے وقوفی ہے اور کچھ نہیں۔" مسی چیز نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ویسے تمہارے نانا نے اس بارے میں کچھ اشارہ نہیں دیا کہ انہوں نے وہ خزانہ کہاں چھپایا تھا؟" نکی نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کئی مرتبہ سرسری انداز میں ان سے سوال کیا تھا۔ جواب میں وہ خالی آنکھوں اور سپاٹ بے جان سے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"اس میں بھی کوئی اشارہ ہو سکتا تھا۔" نکی نے پرسوچ انداز میں کہا "خالی آنکھیں اور سپاٹ چہرہ....."

"کچھ بھی ہو.... اب تو جو کچھ بھی ہے وہ مسٹر بیگلو کا ہے کیونکہ ان تینوں میں سے اب صرف وہی باقی بچے ہیں۔" مسی چیز نے نکی کی بات کاٹتے ہوئے قدرے بے زاری سے کہا۔

اسی وقت میئر ڈاکٹر مارٹن دیگر کئی افراد کے ساتھ اندر داخل ہو گیا اور ان کی گفتگو کا سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا۔

"اگر اس کہانی میں ذرا بھی حقیقت ہے تو میرا خیال ہے کہ مسٹر بیگلو نے ہی مسٹر چیز کو دوسرے جہان بھجوانے کا بندوبست کیا ہو گا۔" مجمع سے قدرے دور ہو جانے کے بعد نکی نے مجھ سے سرگوشی کی۔ "اسی نے اپنے دوست کو مروایا ہو گا تاکہ خزانے کا مالک بن سکے۔"

"اس وقت جب کہ وہ خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے؟ بلکہ سارے کا سارا ہی لٹکا ہوا ہے.... اس وقت وہ یہ کام کیوں کرے گا؟" میں نے کڑی نظر سے اپنی سیکریٹری کو دیکھا۔

"تو پھر تمہارے خیال میں اور کیا بات ہو سکتی ہے؟" اس نے میری نظروں کا برا منائے بغیر پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ اسی وقت میری نظر میئر پر پڑی جو ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا اور ایک طرف لے جا کر اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگا۔ میئر خاموشی سے میری بات سنتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔



"اس وقت قصبے کا ہر فرد یہاں موجود ہے۔" چیز کی آخری رسومات کے دوران میئر نے فخریہ لہجے میں مجھے بتایا۔ یہ لوگ دو بجے سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ جس کار میں سوار تھا اس میں میئر کے علاوہ بیگلو اور

اس کا پوتا اینڈریو بھی تھا۔ اینڈریو کے چہرے سے خشونت اور سفاکی کے ساتھ سرد مہری ٹپک رہی تھی۔ مجھے اس سے بات کرنے میں ذرا سی جھجک ہوئی پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔ اس سے پہلے میسز ہمارا باہمی تعارف کرا چکا تھا۔

"میں تمہارے گرینڈ پاپا کو کیا کہہ کر پکاروں؟" میں نے اینڈریو کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"وہ جنرل تھے۔" اینڈریو نے بلند آواز میں کہا "میں نے غلط تو نہیں کہا؟" اس نے **بیگلو** کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

میں نے دیکھا کہ پوتے کی بات سے بوڑھے **بیگلو** کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہاں دبلا پتلا بوڑھا تن کر سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے زانو پر ایک پرانا چرمی بیگ رکھا ہوا تھا جسے اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"جنگ کو گرینڈ پاپا نے کبھی اچھا نہیں سمجھا شاید اسی لیے وہ اس حوالے سے بات کرنا نہیں چاہتے۔" اینڈریو نے اپنی بات کا کوئی ردعمل نہ دیکھتے ہوئے خجالت آمیز انداز میں کہا۔

"جنرل **بیگلو**!" میں نے خود اسے بوڑھے سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"یہ اب اونچا سنتے ہیں اس لیے ذرا بلند آواز سے کہیں۔" اس کے پوتے نے مجھے مشورہ دیا۔

"جنرل **بیگلو**!" میں نے قدرے بلند آواز میں دوبارہ کہا۔

"ذرا اونچا بولو جوان!" اس بار جنرل نے اپنی ہلتی ہوئی گردن کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا "تمہاری منمناہٹ مجھے سنائی نہیں دے گی۔"

"جنرل **بیگلو**!" اس مرتبہ میں نے چیخ کر کہا "اب تو خزانے کی ساری رقم تمہاری ہو چکی ہے۔ تم اس کا کیا کرو گے؟"

"کیا... رقم؟"

"خزانہ... گرینڈ پاپا!" اینڈریو نے بلند آواز میں غرایا۔ "انہوں نے اس بارے میں نیویارک میں سنا تھا۔ اور اب تم اس کا کیا کرو گے... یہ اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں!"

"واقعی..." بوڑھے سپاہی نے حیرت سے پوچھا "تو اس کا تذکرہ وہاں تک پہنچ گیا؟"

"وہ کتنی رقم ہے؟" میں نے چلاتے ہوئے پوچھا۔

بوڑھے سپاہی کی نظر مجھ پر ٹک گئی۔ "تمہیں اس خزانے سے بڑی دلچسپی ہے۔ بہرحال آخری مرتبہ جب ہم نے اسے گنا تھا تو اس وقت وہ ایک ملین ڈالر تھے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آنکھ بند کی اور مسکراتے ہوئے بولا "یہ یہاں کے شک زدہ لوگوں کے لیے ایک سرپرائز ہوگا۔ تم یہاں رکو اور اس سے لطف لو۔"

"مگر سسی تو کہہ رہی تھی کہ وہ کل دو لاکھ ڈالر ہیں۔" نکی نے ہلکی آواز میں کہا۔

"یہ **بیگلو** کی عادت ہے۔ وہ جب بھی اس کے بارے میں بات کرتا ہے اس رقم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کر دیتا ہے۔" میسز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جو تم نے کہا وہ میں نے سن لیا۔" بوڑھے سپاہی نے میسز کو دیکھتے ہوئے کہا "تم انتظار کرو۔ بہت جلد سچ جھوٹ سامنے آجائے گا۔ شک کا مارا ہوا بڈھا!" اس نے استہزائی انداز میں کہا۔

"اوکے اوکے۔" میسز نے مصالحانہ انداز میں کہا "اب اپنی سانسوں کو بچا کر رکھو۔ تمہیں آج کی تقریب میں بگل بجانا ہے۔"

بیگلو نے کچھ نہیں کہا۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے زانوؤں پر رکھے بیگ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

میں نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میری نظر **بیگلو** کے پوتے پر جمی ہوئی تھی جس کے چہرے پر بھی جیت کی خوشی کے تاثرات تھے۔ اسے نہ جانے کس جیت کی خوشی تھی۔



رات کے مقابلے میں دن بہت گرم تھا۔ قبرستان کی ویرانی میں یہ گرمی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ بوڑھے چیز

کی آخری رسومات جاری تھیں اور میئر اپنے انداز میں مرنے والے سپاہی کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموشی سے اس کی تقریر سن رہے تھے۔ اس کے برابر میں بوڑھا بیگلو تن کر کھڑا ہوا تھا۔ جونہی میئر کی تقریر ختم ہوئی اس نے بیگلو کو اشارہ کیا۔

بیگلو نے ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ کھولا اور اس میں سے کچھ نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"جلدی کرو گرینڈ پاپا۔" اس کے پوتے نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔

بوڑھا کچھ بڑبڑایا۔ اسے بیگ سے مطلوبہ چیز نکالنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"مجھے دو میں بگل نکال دیتا ہوں۔" اینڈریو نے اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی مگر میئر نے سخت لہجے میں اسے منع کیا۔

"اپنے گرینڈ پاپا کو اپنا کام کرنے دو۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ انہیں اپنی سہولت سے کام کرنے دو۔"

آخر کار بیگ میں سے بگل برآمد ہو گیا۔ قدیم اور روایتی فوجی بگل۔

بوڑھے سپاہی نے بگل کی نال اپنے منہ سے لگائی۔ اس وقت اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور نہ گردن ہل رہی تھی۔ وہ باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ پھر اس کی انگلیاں بگل کی گھنڈیوں پر رواں ہو گئیں۔ اپنے طور پر وہ بگل بجا رہا تھا مگر اس کے نتیجے میں جو آواز برآمد ہو رہی تھی اسے سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بگل بجایا جا رہا ہے۔

اس نے ایک گہرا سانس کھینچا اور بگل کی نال میں ہوا کا دباؤ ڈالنے لگا۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سب کی نظریں اس بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں جو دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر بگل بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کبھار بگل میں سے آواز بھی برآمد ہو رہی تھی۔

اچانک جیسے ہر شے ساکت ہو گئی۔ بوڑھا بیگلو اپنی جگہ کھڑے کھڑے لہرایا اور بگل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرشور آواز کے ساتھ پختہ چبوترے پر گر گیا۔

ایک لمحے کو تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا پھر ہم سب بیگلو کی طرف دوڑنے لگے۔ جواب میئر اور اپنے پوتے کے قدموں پر گرا ہوا تھا۔



"یہ سراسر میرا قصور ہے۔" میئر اور ڈاکٹر مارٹن پر تاسف لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں نے گزشتہ سال ایٹ ویل کے منہ کو چیک نہیں کیا تھا اور نہ ہی بگل کا معائنہ کیا تھا۔ وہ سب بیگلو کے گھر میں جمع تھے اور اس کی لاش بھی وہیں رکھی تھی۔

میں نے اسے تسلی دی "ڈاکٹر! زہر دینے کے اس طریقے کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ ویسے بھی تم نے ایٹ ویل کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا تھا۔"

"یہ تینوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہمارا قصبہ نامور سپاہیوں سے خالی ہو گیا۔" اس نے غم زدہ انداز میں کہا پھر بولا "اس بگل کو کس نے زہر آلود کیا ہو گا؟"

"خدا کے لیے مجھ پر کسی قسم کا شک نہ کرنا۔" اینڈریو نے ڈاکٹر کی نگاہوں کو خود پر مرتکز دیکھ کر جلدی سے اس کے سوال کا جواب دیا "میں ایسے کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کسی اور کا کام ہے!"

"کوئی اور۔۔۔!" ڈاکٹر مارٹن کی آواز شدت جذبات سے پھٹنے لگی تھی "کوئی اور کون؟ ایٹ ویل کی موت کے بعد یہ بگل بیگلو نے لے لیا تھا اور ایک سال سے یہ اسی گھر میں موجود تھا۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی بھی شخص یہ کام بہ آسانی کر سکتا تھا۔ یہ بگل کسی پوشیدہ جگہ نہیں رکھا ہوا تھا بلکہ آتش دان کے اوپر لگی کھونٹی میں لٹکا رہتا تھا اور پھر ایٹ ویل کی موت سے پہلے تو یہاں نہیں تھا تو پھر اسے اس کے گھر میں کس نے زہر آلود کیا ہو گا؟"

"ہم اس طرح کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" میں نے ان دونوں کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا اور پھر اینڈریو سے مخاطب ہو کر بولا "کیا تمہارے دادا نے مبینہ خزانے کے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تھا؟"

"فرض کریں کہ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر حریصانہ انداز میں زبان پھیری "لیکن تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟"

"اس خزانے کی رقم کے چکر میں تمہارے دادا کا قتل ہوا ہے!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ اب وہ ساری رقم میری ہے کیونکہ میرا دادا ان تینوں میں سب سے آخر میں مرا ہے اور اس کا واحد وارث ہونے کے باعث اب اس خزانے پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔"

"تمہیں پتا ہے کہ وہ رقم کہاں چھپائی گئی ہے؟" ڈاکٹر مارٹن نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس بارے میں' میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا "اور اب آپ تمام لوگ میرے گھر سے رخصت ہو جائیں۔" اس کا انداز اب ایسا تھا گویا انہیں دفع ہونے کو کہہ رہا ہو۔

"تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں اس قصبے کا پولیس چیف بھی ہوں۔" ڈاکٹر مارٹن نے نہایت نرمی سے کہا "یہ ایک قتل کا معاملہ ہے لہٰذا بتاؤ کہ وہ رقم کہاں ہے؟"

اینڈریو' ڈاکٹر مارٹن کے انداز اور سوال پر کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بھی رقم کی جگہ کا علم نہیں ہے۔" میں نے اینڈریو کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی۔" وہ دوبارہ ہنسا "سنو ڈاکٹر! یہ تمہارا ساتھی بھی یہی کہہ رہا ہے کہ مجھے رقم کی موجودگی والی جگہ کا علم نہیں ہے۔"

"بالکل درست۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اب سے چند منٹ پہلے تو تم اس مقام سے واقعی بے خبر تھے مگر اب.....!"

اینڈریو کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ "تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"چیز کی موت کی اطلاع ملنے کے فوراً بعد تمہارے دادا نے ایک پیغام لکھ کر لفافے میں مہر بند کر دیا تھا اور وہ لفافہ تمہیں مل....."

اینڈریو کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ "یہ تمہیں کس نے بتایا؟" اس کی آواز دھیمی اور کپکپائی ہوئی تھی۔

"تمہارے بچوں میں سے ایک بچے نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔" میں نے جواب دیا اور پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "لاؤ' یہ لفافہ باہر نکالو!"

اینڈریو نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایک لمحے کو اس کے تیور خطرناک نظر آئے دوسرے لمحے وہ پھر سے ہنسنے لگا۔ "کوئی بات نہیں' میں وہ لفافہ تمہیں دے دیتا ہوں تاکہ تم وہ رقم میرے لیے برآمد کر سکو کیونکہ ہر قانون کے تحت اس رقم پر صرف اور صرف میرا حق ہے اور دیکھو..... دادا نے اس لفافے پر میرا ہی نام لکھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

لفافے پر اینڈریو کا نام لکھا ہوا تھا۔ تحریر شکستہ اور انداز قدیم تھا۔ اندر سے برآمد ہونے والا خط بھی اسی تحریر میں تھا۔

"ڈیئر اینڈی! اب جبکہ چیز بھی مر چکا ہے تو ضروری ہو گیا ہے کہ میں یہ تحریر لکھ ڈالوں۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خزانے کی تمام رقم میں نے ایک ٹین کے بکس میں رکھ کر ایٹ ویل کے تابوت میں رکھ دی تھی۔ میرے مرنے کے بعد تم وہ رقم وہاں سے حاصل کر لینا۔ دعاگو تمہارا گرینڈ پاپا' بیگلو۔"

"ایٹ ویل کے تابوت میں!" ڈاکٹر مارٹن نے بلند آواز میں دہرایا۔

رقم کو چھپانے کے لیے کیا زبردست جگہ چنی گئی تھی؟ میں نے دل ہی دل میں کہا اور ڈاکٹر مارٹن کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تم قبر کشائی کا اجازت نامہ کتنی دیر میں حاصل کر لو گے؟“

”میں یہ اجازت نامہ ابھی جاری کر رہا ہوں کیونکہ میں ہی اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر بھی ہوں۔“ ڈاکٹر مارٹن نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔



صرف ایک گھنٹے میں ایٹ ویل کی ایک سال پرانی قبر کھود کر اس کا تابوت باہر نکال لیا گیا۔ تابوت کے پاس میں، نکی، ڈاکٹر مارٹن، اینڈریو اور چند پولیس والے موجود تھے۔ باقی لوگ دور کھڑے اس خزانے کو برآمد ہوتا دیکھ رہے تھے۔

تابوت کے اسکرو کھولے گئے اور اس کا ڈھکن ہٹا کر ایٹ ویل کی گلی سڑی لاش کے اوپر رکھا ہوا ٹین کا باکس اٹھا لیا گیا۔

بکس کھلا اور ڈاکٹر مارٹن نے بے تابی سی ہاتھ بڑھا کر نوٹوں کی گڈی باہر نکالی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ تمام منسوخ شدہ نوٹ تھے جو سول وار کے بعد نئی حکومت نے بند کر دیے تھے۔ سب لوگ سکتے کی سی حالت میں کھڑے ان نوٹوں کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر چہرے پر مسکراہٹ سجا کر دوسروں کو دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں ساری کہانی سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ان تین بوڑھوں نے اس قصبے کے باسیوں کے ساتھ بہت عمدہ مذاق کیا ہے۔ سول وار کے دوران جب انہیں یہ نوٹ ملے اس وقت ان کی قدر تھی مگر جنگ کے اختتام پر جب حالات معمول پر آئے اور وہ اس رقم کو استعمال کرنے کے قابل ہو سکے اس وقت تک یہ نوٹ منسوخ ہو چکے تھے لہٰذا میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس خزانے کو مذاق کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا اور دیکھ لو کہ وہ کس طرح کامیاب رہے۔ یہ انہوں نے پہلے ہی طے کر لیا ہوگا کہ سب سے پہلے مرنے والے کے تابوت میں یہ خزانہ رکھ دیا جائے گا۔ ہاہ! خزانہ!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا اور ساتھ کھڑے لوگوں کو دیکھا جو مایوسی اور بے دلی کی تصویر نظر آ رہے تھے۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ایٹ ویل اور میکلو کے قتل کا معاملہ تو باقی رہ گیا۔“ نکی نے مجھ سے کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ڈاکٹر مارٹن نے تائید کی ”اور پولیس چیف کی حیثیت سے یہ میری ذمے داری ہے کہ میں ان کے قاتل کا سراغ لگاؤں۔“

”اس بارے میں میرے پاس ایک تھیوری ہے۔“ میں نے پرسوچ انداز میں کہا ”اور اگر مجھے تھوڑا سا غور کرنے کا وقت دے دیا جائے تو میں اسے ثابت بھی کر دوں گا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ ڈاکٹر مارٹن نے فوراً جواب دیا ”تمہیں کتنا وقت درکار ہے؟“

”صرف ایک گھنٹا۔۔۔ اور وہ میں تنہائی میں گزاروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہماری اگلی ملاقات سسی چیز کے گھر میں ہوگی۔“

”یہ سارا حرص۔۔۔ ہوس اور قسمت کی کارفرمائی کا ماجرا ہے۔“ ایک گھنٹے بعد جب لوگ سسی چیز کے گھر میں جمع تھے تو میں نے سب کو مخاطب کر کے کہا ”وہ تینوں سپاہی تو اس قصبے والوں کے ساتھ ایک مذاق



مقدمے کی سماعت کے سارے عرصے میں جج صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے رہے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ جب سماعت مکمل ہو گئی اور صرف فیصلہ سنانا باقی تھا تو وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکے اور آخر ملزم سے پوچھ ہی بیٹھے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔

ملزم نے کہا۔ ”جناب میں آپ کی بیگم صاحبہ کو موسیقی کا سبق دیا کرتا تھا۔“

”چودہ سال قید بامشقت۔“ جج نے فیصلہ سنایا۔

کرنے والے تھے بلکہ کر رہے تھے مگر اس مذاق کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا اس لیے وہ اپنے متعلقین کے لالچ کا شکار ہو گئے۔ وہ متعلقین جنہیں یہ رقم ملنا تھی۔ اب بتائیں کہ آخری بچ جانے والے کے وارث کون ہیں؟" میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر پوچھا۔

"میں ہوں.... اور کون ہے!" اینڈریو نے جواب دیا باقی نے تائید میں گردن ہلا دی۔ وہ سب کینہ توز نظروں سے اینڈریو کو گھور رہے تھے۔ اس کا اعتراف ان سب کو اعتراف جرم محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ان کی کیفیت سے لطف لیا اور پھر یکایک میری نظر سسی چیز پر پڑی جو غراتی ہوئی اینڈریو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"تو تم نے میرے گرینڈ پاپا اور رایٹ ویل کو مار دیا تاکہ تمہارے دادا زندہ بچ جائیں اور ان کے بعد تم ان کے وارث بن کر یہ رقم حاصل کر لو۔" وہ بلند آواز سے بول رہی تھی۔

"بالکل یہی بات ہے۔" نکی نے گردن ہلا کر اس کی تائید کی اور میری طرف دیکھا۔ اسے توقع ہوگی کہ میں اس کی تصدیق کروں گا۔

"بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے مائی ڈیئر!" میں نے افسوس زدہ انداز میں سر ہلا کر کہا "تم سب بیگلو کو آخری زندہ بچ جانے والا سمجھ رہے ہو جبکہ...."

"تو کیا ایسا نہیں ہے۔" نکی نے حیرت سے پوچھا۔

"اور ایسا کیوں نہیں ہے؟ یہ سب جانتے ہیں کہ بیگلو سے پہلے ایٹ ویل اور چیز دونوں اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔" ڈاکٹر مارٹن نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"حقیقت تو یہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر ایک بات تو آپ سب لوگ فراموش کر رہے ہیں۔ مسٹر بیگلو خالصتاً "حادثاتی طور پر آخری زندہ بچ جانے والے تھے۔" یہ کہہ کر میں ڈاکٹر مارٹن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ بتائیں مسٹر مارٹن! کیا مسٹر چیز کی موت طبعی نہیں تھی؟ یقیناً" وہ طبعی موت مرے تھے اور یہ بات آپ صبح ہی مجھے وثوق سے بتا چکے ہیں۔ تو ذرا غور کریں کہ اگر مسٹر چیز کی موت آج صبح واقع نہ ہوتی تو پھر کون زندہ بچتا کیونکہ بہرحال ان کی موجودگی میں بگل بجانے کی ذمے داری مسٹر بیگلو کی ہی ہوتی اور ان کے بعد باقی بچتے مسٹر چیز...." میں نے خاموش ہو کر سب کو غور سے دیکھا۔ سب لوگ میری جانب متوجہ تھے۔

"تو اب ذرا سوچیں کہ مسٹر چیز کا واحد وارث کون ہے جو اس خزانے کا حق دار ہوتا؟"

سب کی نظریں بے اختیار سسی چیز کی طرف اٹھ گئیں۔

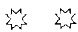
اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور وہ سراسیمہ نظروں سے سب لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے ہر آنکھ میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"اب یہ اس کی قسمت تھی کہ خود اس کے گرینڈ پاپا مسٹر بیگلو سے پہلے مر گئے اور اسے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ بگل کے ماؤتھ پیس پر لگا ہوا زہر صاف کر سکے۔ وہ زہر جو اس نے ایٹ ویل کے گھر میں اس بگل پر لگا دیا تھا۔"

"ہائے ری قسمت!" نکی نے بلند آواز سے کہا۔ "منصوبہ بے داغ تھا مگر قسمت کے آگے کس کا زور چلتا ہے؟"



نکی کے فون کے بعد یہ سارا واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ جب تک کسی نئی کہانی کا پلاٹ ذہن میں نہیں آتا اس واقعے کو لکھ دیا جائے۔ اب یہ میرے قارئین پر منحصر ہے کہ انہیں یہ سچی کہانی پسند آتی ہے یا نہیں اور ہاں! اسی وقت سسی چیز نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا اور قصبے والوں نے اس کے لیے سزائے موت کی درخواست کی تھی جو شاید کسی وجہ سے منظور نہیں ہو سکی تھی۔



شب جنوں

اختر بیگ

قتل کرنا اس کا شوق یا پیشہ نہیں تھا بلکہ اس نے اس اپنا مشن بنا لیا تھا وہ معاشرے کی تطہیر کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت کا وجود معاشرے میں خرابی کا سبب ہے۔

خیروشر کی دلچسپ آنکھ مچولی کا احوال ایک قاتل کی کہانی



وہ بڑے اصرار سے پوچھے جارہی تھی۔ "بتاؤ تو سہی... کسی کو قتل کرنا کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بار کی دھندلی روشنی میں اس کی ستارہ آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر سرخی یوں چمک رہی تھی جیسے ان پر پینٹ کیا گیا ہو۔ یہ عورتیں اس خیال سے اپنے ہونٹوں پر پینٹ جیسی یہ چمک پیدا کرتی ہیں کہ اس طرح ان کے ہونٹ زیادہ دلکش اور جذبات خیز نظر آئیں گے کتنی ہوس ہوتی ہے انہیں دلکش اور جذبات خیز نظر آنے کی!

میں نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرنے کے بہانے گویا کچھ مہلت حاصل کی۔ اپنی ڈرنک کا ذائقہ مجھے دوا جیسا محسوس ہو رہا تھا لیکن مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جس کا علاج اس دوا سے ہو سکتا۔

"کسی کو قتل کرتے وقت... کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔ "حقیقت یہی ہے۔ قطعاً کچھ محسوس نہیں ہوتا۔" حالانکہ یہ جھوٹ تھا مگر وہ عورت اسی قابل تھی کہ اس سے جھوٹ بولا جاتا۔

"تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔" وہ بولی۔ "کچھ نہ کچھ تو محسوس ہوتا ہوگا۔ تمہارے پاس اس وقت ریوالور ہے؟"

"ہاں۔ ہر وقت ہوتا ہے۔ میرا دوست' میرا ساتھ' میرا غمگسار' میرا مددگار' میری شریک حیات' سب کچھ میرا ریوالور ہے لیکن اس وقت میرا خیال ہے تم میری اس سے زیادہ اچھی دوست ہو۔" میرے خیال میں وہ اسی قسم کے الفاظ کا چارہ پھینکنے سے پھنسنے والی مچھلی تھی۔ جذباتی جملے... کھوکھلی باتیں... جھوٹے لفظ۔ بعض عورتیں ان سے بڑی متاثر ہوتی ہیں۔

وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "اپنا ریوالور مجھے دکھاؤ۔ میں ایک منٹ کے لیے اسے ہاتھ میں تھام کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ایک پرانا سا بار تھا۔ بیشتر شراب خانوں کی طرح وہاں بھی روشنی کم تھی۔ ہم ایک بوتھ میں چمڑے کی پوشش والے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ اپنے ٹخنوں پر مجھے ایئر کنڈیشنر کی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ ہمارے گلاس نم آلود تھے اور میز کی فارمیکا پر نمی کے دائرے نظر آرہے تھے۔

وہ اس وقت بار میں آئی تھی جب میں دو ڈرنکس ختم کر چکا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے قریب بیٹھی بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے ہاتھ ہلا کر اشارے سے اسے اپنی میز پر بلالیا۔ اس نے آنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس طرح کی عورتیں بھلا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کی متحمل کہاں ہو سکتی ہیں۔ آوارہ... بدقماش اور ہرجائی...

وہ میری میز پر آگئی تو میں نے پوچھا۔ "ایک اور ڈرنک لوگی؟"

وہ جن میں اورنج جوس ملا کر پی رہی تھی' اس قسم کی ڈرنک کا شوق کسی ماں کو ہی ہو سکتا تھا۔ کم از کم میری ماں کو تو بہت تھا۔ حتیٰ کہ یہی پیتے پیتے وہ مرگئی۔

وہ میری میز پر آگئی تھی تو ایک دوسرے کا نام جاننا بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنا نام رسٹی بتایا۔ اس کے بال سرخ تھے۔ عین ممکن ہے یہ ان کا اصلی رنگ ہی رہا ہو۔ میں اٹھ کر ڈرنک لینے کاؤنٹر پر چلا گیا۔ وہ ایک "سیلف سروس" قسم کی جگہ تھی۔ وہاں کوئی ویٹرس وغیرہ نہیں تھی۔ گاہک بھی زیادہ نہیں تھے۔ ایک کونے میں ٹی وی ٹرٹرا رہا تھا۔ اس پر بیس بال کا کوئی میچ دکھایا جارہا تھا۔ وہ اس قسم کا بار تھا جیسے عموماً "گلی کوچوں" میں ہوتے ہیں لیکن نہ تو وہ گلی کوچہ میرا تھا اور نہ ہی مجھے بیس بال سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اگست کی ایک حبس زدہ رات تھی اور میں نے سوچا تھا' خالی گھر میں اندھیرے میں لیٹ کر چھت کو تکنے سے تو گلیوں میں گشت کرنا ہی بہتر تھا۔

بارٹینڈر نے میری مطلوبہ ڈرنکس تیار کر کے میرے سامنے رکھیں اور منتظر نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ قیمت کا منتظر تھا۔ اس دنیا میں ہر کوئی کسی نہ کسی چیز کی قیمت کا منتظر تھا۔ میں نے قیمت ادا کی' اس کے لیے کچھ ٹپ چھوڑی اور اپنی میز پر

واپس آگیا۔ میں دل ہی دل میں خود کو سمجھائے جارہا تھا۔ یہ افسردگی عارضی ہے۔ جلد ہی ٹل جائے گی۔ کبھی کبھی ہر انسان پر ایک خاص موڈ طاری ہوتا ہے' جلد ہی تم اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کروگے۔

"مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔" میں نے بوتھ میں اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ میں اسے اس کی داستان حیات سنا سکتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی عورتوں کی داستان حیات میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً" میری طرف کچھ توجہ دیتی تو وہ بھی مجھے میری داستان حیات سنا سکتی تھی۔ دونوں میں شاید زیادہ فرق نہ ہوتا۔

اپنی داستان حیات کا خلاصہ سناتے سناتے وہ جب ناکام شادی والے حصے تک پہنچی اور یہ بتانے لگی کہ اس کا ایک بچہ بھی تھا جو اپنی نانی کے ہاں پرورش پارہا تھا' تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسے ایک اور ڈرنک کی ضرورت تھی۔

"اس بار ڈرنک میں لاؤں گی۔" وہ بولی۔ "اس کے بعد تم مجھے بتانا کہ تم نے پولیس آفیسر بننے کا فیصلہ کیوں کیا۔"

کاؤنٹر پر جانے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے لیڈیز روم کی طرف چلی گئی۔ اس دوران میں نے کئی بار سوچا کہ وہاں سے کھسک جاؤں۔ اس وقت مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ یہی میرے حق میں بہتر تھا لیکن میری آنجہانی والدہ کہا کرتی تھیں۔ "یہ جان لینا تو آسان ہے کہ صحیح کام کیا ہے لیکن اسے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

وہ واپس آگئی۔ اونچی ایڑیوں والے سینڈلوں میں چلنا شاید اسے کچھ دشوار محسوس ہورہا تھا۔ ڈرنکس کے ساتھ وہ چپس کے دو پیکٹ بھی اٹھائے ہوئے تھی۔ "کچھ کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔ "لیکن میں یہاں کے کچن کی کوئی چیز نہیں کھانا چاہتی تھی۔ میں نے اتفاق سے کچن میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ اصطبل سے بدتر نظر آرہا تھا۔"

"اصل میں لوگ یہاں کھانے نہیں آتے۔" میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ بھوک کا ذکر چلا ہے تو وہ مجھے کھانے کے بہانے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بالآخر میں نے ہی اشارتاً" ترغیب دی۔ "کہیں چلتے ہیں۔"

"کچھ دیر بعد شاید چلیں۔" پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم جیسے شاندار آدمی پولیس میں نوکری کیوں کرلیتے ہیں جہاں تنخواہ اتنی معمولی ہوتی ہے اور جان کا خطرہ ہر روز رہتا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے گلاس سے چسکی لی۔ وہ سرتاپا نسوانیت تو تھی' کچھ بچا کچھا نسوانی وقار بھی اس کی شخصیت سے کبھی کبھی جھلک اٹھتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہکی بہکی تھیں۔

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ یہ میرا تیسرا تلخ اور استہزائیہ قہقہہ تھا۔ میں اپنے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ایک چوٹ کا ہلکا سا ابھار موجود تھا۔ یہ چوٹ چند دن قبل آئی تھی جب مجھے کسی کے ساتھ زور آزمائی اور ہاتھا پائی کرنا پڑی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ "میرا باپ بھی ایک پولیس والا تھا۔ وہ کوئی اچھا یا مستعد اور اسمارٹ قسم کا پولیس والا تو نہیں تھا...... لیکن بس.... شاید پولیس کی نوکری اب ہماری خاندانی روایات میں شامل ہوگئی ہے۔"

"اچھا.... تو باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔" اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ "تم اس سے بہتر پولیس والا بن کر دکھانا چاہتے ہو۔"

اپنی دانست میں وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ بھلا کیا سمجھ سکتی تھی۔ احمق کہیں کی! اس سے پہلے نادیہ.... شیری وغیرہ بھی کچھ نہیں سمجھ سکی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ "مکی ڈیئر....! ایک بار پھر تمہیں وہی مرحلہ درپیش ہے!"

میں نے سر اٹھا کر بار کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ جانی پہچانی سی جگہ لگ رہی تھی لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ میں وہاں پہلے کبھی آیا تھا۔ شہر میں ایسے ہزاروں شراب خانے پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے.... نیم تاریک۔ ان میں تمباکو کے دھوئیں اور شرابوں کی بو کے ساتھ گویا

گناہ اور برائی کی بو بھی پھیلی رہتی تھی۔
ان کی تھوڑی بہت انفرادیت ارد گرد کے علاقے کی وجہ سے نظر آتی تھی۔ **مثلاً** ”اگر آس پاس آئرش لوگ زیادہ رہتے تھے تو بار میں بھی آئرش زیادہ نظر آتے تھے۔ اگر ارد گرد اطالوی رہائش پذیر تھے تو بار میں بھی اطالویوں کا **جمگھٹا** دکھائی دیتا تھا اور اگر وہ کالوں یا ہسپانویوں کا علاقہ تھا تو انہی کے چہرے زیادہ دیکھنے کو ملتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی سب کچھ ایک جیسا ہوتا تھا۔ یہ شراب خانے گویا کنکریٹ کے فٹ پاتھوں کو چیر کر ابھرے ہوئے تھے ’اگے ہوئے۔ یہ اپنے گاہکوں کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس پر پلتے تھے۔
مجھے اس پیاس سے خبردار رہنا چاہیے تھا۔ میرے باپ کو اس پیاس کی وجہ سے پولیس فورس سے لات مار کر نکال دیا گیا تھا جس کے بعد اس کی پیاس کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس کا انتقال ایسے ہی ایک بوتھ میں ہوا تھا جیسے میں اس وقت میں اور رٹی بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا وہ یہی بوتھ رہا ہو۔
میں اس وقت گھر سے بہت دور تھا۔ میں عظیم امریکا دیکھنے نکلا ہوا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس عظیم امریکا میں میرے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں۔ عظیم امریکا میں یقیناً ”میرے لیے جگہ موجود تھی۔ میں اس وقت اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا!
”تم کافی کم گو معلوم ہوتے ہو۔“ وہ چپس چباتے ہوئے بولی۔ وہ مجھے بولنے کے لیے تحریک دے رہی تھی۔
”بولنے اور بتانے کے لیے میرے پاس کچھ زیادہ نہیں ہے۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا پھر ایک گہری سانس لی۔ ”اف خدایا.....! ہمیں یہاں سے کہیں چلنا چاہیے۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“
”میرا بھی۔“ وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ اس قسم کے لباس میں تھی جس کے ہونے نہ ہونے سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ کتیا کہیں کی.....! میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔
باہر آکر فٹ پاتھ پر رک کر اس نے ویران سڑک پر دائیں بائیں دیکھا اور قدرے پریشانی سے بولی۔ ”ہمیں فون کر کے ٹیکسی منگوالینی چاہیے تھی۔ سڑک پر تو لگتا ہے ہرگز نہیں ملے گی۔“
”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”میرے پاس کار ہے‘ سامنے والی گلی میں پارک کر رکھی ہے۔“ سامنے دو صنعتی سی عمارتیں تھیں اور ان کی درمیانی گلی تاریک تھی۔
”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ جھرجھری سی لے کر بولی پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”معلوم نہیں کیوں میں اتنی بزدل سی ہوں۔ شاید یہ ان عورتوں کے قتل کی خبروں کا اثر ہے جو اخباروں میں پچھلے دنوں چھپتی رہی ہیں۔ کتنی عورتیں اب تک قتل ہو چکی ہیں؟ پانچ؟“
”چھ۔“ میں نے جواب دیا۔ میرا جواب تھوڑا سا غلط تھا۔ چھ ابھی ہوئی تو نہیں تھیں لیکن جلد ہی ہونے والی تھیں۔
پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں راتوں کو اکیلی باہر نہیں پھرنا چاہیے اور اس طرح اجنبیوں سے باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“
وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں ایک پولیس والے کے ساتھ ہوں۔“ اس کی چال‘ اس کا کندھے اچکانا‘ اس کا ہونٹوں کو سکیڑنا‘ سب کچھ جذبات خیز تھا اور یہ بات اسے خود بھی اچھی طرح معلوم تھی۔ اس کی حرکات و سکنات بلا ارادہ نہیں تھیں۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولی۔ ”تم مجھے راتوں کو گھر سے نہ نکلنے کا مشورہ دے رہے ہو لیکن کبھی تم کئی راتوں تک تنہا گھر پر رہ کر دیکھو۔ جب کوئی تم سے بات کرنے والا‘ کوئی تمہاری بات سننے والا نہ ہو۔ چند راتوں کے بعد ہی تم اپنے آپ کو پاگل ہوتا محسوس کرو گے۔“
اچھا.....! تو اس کا مطلب تھا کہ وہ تنہا رہتی تھی اور تنہا رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ اب براہ راست پیش کش کا مرحلہ آ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”تمہارے گھر پر کچھ کھانے کو نہیں ہوگا؟ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ

پولیس والوں کو تنخواہ معمولی ملتی ہے۔ ظاہر ہے میں تمہیں کسی اچھے ریستوران میں لے جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ گویا سوچ میں پڑ گئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا یہ محض اداکاری تھی۔

"مجھے تم کو اپنے ساتھ گھر لے کر تو نہیں جانا چاہیے۔" بالآخر وہ بولی۔ "فرض کرو تم پولیس والے نہیں بلکہ وہی شخص ہو جو جوان عورتوں کو چھری کے نہ جانے کتنے کتنے وار کر کے قتل کر چکا ہے.....؟"

میں نے اپنا بیج نکال کر اس کے سامنے لہرایا اور کہا۔ "میں اپنا ریوالور بھی تمہیں دکھا دوں گا.... بلکہ تمہارے ہاتھ میں بھی دے دوں گا لیکن یہاں سڑک پر نہیں۔"

وہ ہنس دی۔ "مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا اور میں سامنے والی گلی کی طرف چل دیا۔ جب ہم اندھیرے میں پہنچے تو خوف سے وہ گویا مجھ پر گرنے لگی۔ وہ مختصر قد کاٹھ کی تھی۔ اس کا سر بہ مشکل میرے کندھوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ تب وہ اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گئی تاہم میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ہم کار تک پہنچے تو اس نے جلدی سے اندر بیٹھ کر دروازہ مقفل کر لیا۔

میرے ساتھ وہ یقیناً "اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہی تھی اور کیوں نہ کرتی؟ ایک پولیس والے کے بارے میں تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان آوارہ بدقماش اور دوسروں کے جذبات کو ابھارنے والی عورتوں کو ان مصیبتوں سے بھی بچائے گا جنہیں یہ خود اپنی بدفطرتی یا بے وقوفی کی وجہ سے دعوت دیتی ہیں۔ پولیس والوں کے بارے میں ان کے ذہن میں یہ تاثر بھی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ قابل رشک مرد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے زیادہ تر تو پولیس والوں ہی کی تاڑ میں رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے میرے لیے ان کے ساتھ ان کے گھر جانا آسان ثابت ہوتا ہے۔

اس کے گھر پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے فریج میں کچھ بچا ہوا چائنیز کھانا اور چند بے چارے "تنہا تنہا" سے انڈے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک عمدہ قسم کے آملیٹ کی تیاری شروع کر دی اور انڈے پھینٹنے لگا۔ اس نے کافی کے لیے پانی ابلنے رکھ دیا۔

میرے آملیٹ کی تیاری دیکھ کر وہ بولی۔ ایسا آملیٹ تو میں بھی تیار نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے کھانا پکانا کچھ خاص نہیں آتا، زیادہ تر ہی اسی ریستوران میں کھانا کھاتی ہوں جہاں میں کام کرتی ہوں لیکن آج میرا چھٹی کا دن تھا۔"

میں آملیٹ تیار کر کے تلنے لگا تو وہ اپنا میک اپ درست کرنے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی عدم موجودگی میں، میں نے کچن کی درازوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جس عورت کو منتخب کرتا ہوں اسی کے کچن کی چھری استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ ایک تو اسے کہیں چھپانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اس کی مدد سے میرا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک دراز میں مجھے صرف ایک چھری نظر آئی۔ بہت عام سی چھری تھی۔ زیادہ تیز بھی نہیں تھی لیکن بہرحال کام دے سکتی تھی۔

آملیٹ تیار ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک باتھ روم میں ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اسے پیٹ بھر کر کھانے دوں گا اور اس دوران ایک پولیس والے کی پیشہ ورانہ زندگی کے قصے سناتا رہوں گا اور جب وہ اچھی طرح ہیجان زدہ نظر آنے لگے گی تو...

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "کھانا تیار ہے۔"

"بس میں ایک سیکنڈ میں آئی۔" اس نے جواب دیا اور واقعی دوسرے ہی لمحے وہ لوٹ آئی۔ وہ ایک خالص طوائفانہ لبادہ پہنے ہوئے تھی جسے اس قسم کی عورتیں ازراہ بدذوقی شب خوابی کا لباس کہتی ہیں۔ خوشبو اتنی تیز لگا رکھی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ یہ عورت تو خود ہی یقیناً "اپنے لیے مصیبت و اذیت کو دعوت دے رہی تھی اور میں کسی عورت کو مایوس کرنا پسند نہیں کرتا۔

میں نے اس کی توقعات کے عین مطابق آنکھیں

پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اپنا مطلوبہ ردعمل دیکھ کر وہ فوراً اٹھلانے لگی۔ "اچھی لگ رہی ہوں نا؟"

"بہت اچھی۔" میں نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"میرا خیال ہے فی الحال تو ہمیں آملیٹ کو بھی بھول جانا چاہیے۔"

دل ہی دل میں' میں نے کہا۔ گھٹیا... بازاری اور ذلیل عورت...! زمین کے سینے پر ایک بوجھ...!

وہ مزید اٹھلا کر بولی۔ "آملیٹ کو تو فی الحال میں نہیں بھول سکتی۔ میں بھوک سے مری جا رہی ہوں۔ ویسے بھی جب بھوک سے میری آنتیں کلبلا رہی ہوں تو میں ذرا بھی رومانٹک نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ کھانے کے دوران مجھے تمہاری مہمات کے بارے میں بھی تو سننا ہے۔"

اس نے صحیح لفظ استعمال کیا تھا۔ مہمات۔ واقعی وہ مہمات ہی تو تھیں جو میں نے سر کی تھیں۔ میں اس بازاری عورت کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اس جیسی دوسری عورتوں کے کس طرح ٹکڑے کیے تھے۔ وہ بہت گڑگڑائی تھیں' رحم کی بھیک مانگی تھی۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار تھیں۔ احمق نہیں کی! ان میں سے ہر ایک نے یہی سمجھا تھا کہ میں اپنی شیطانی خواہشات کی تسکین چاہتا ہوں۔ انہیں آخری دم تک اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں تو معاشرے کی تطہیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میں معاشرے کو اس غلاظت سے پاک کرنا چاہتا تھا جو انسانوں کی صورت میں... خصوصاً" ان گھٹیا عورتوں کی صورت میں گلی کوچوں میں بکھری ہوئی تھی۔ مسئلہ خواہشات کا نہیں' صفائی کا تھا۔

ہم چھوٹی سی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میز پر سفید میز پوش پھیلا ہوا تھا اور اس پر سجے ہوئے برتن ایک سیٹ کے نہیں تھے۔ چھری میں نے بظاہر یاسی' اطالوی ڈبل روٹی کاٹنے کے لیے قریب ہی رکھی تھی۔

رتی نے کیسٹ پلیئر میں ایک کیسٹ لگا دی تھی۔ موسیقی کے بے ہنگم شور میں کوئی ڈکرا ڈکرا کر اس عورت کے بارے میں بتانے کی کوشش کر رہا تھا جس کے وہ خواب دیکھتا رہا تھا۔ رتی کا موسیقی کا ذوق بھی میرے اندازوں کے عین مطابق گھٹیا تھا۔ اس کے بارے میں میرے سبھی اندازے درست معلوم ہوتے تھے۔ وہ مرحلہ وار وہی کچھ کر رہی تھی جس کی مجھے توقع تھی۔

مجھے امید تھی کہ وہ بہت آسان شکار ثابت ہو گی۔ مجھے کچھ زیادہ مشقت' زیادہ پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس آسانی کا تصور کر کے میرا لطف غارت ہونے لگا تھا۔ جب تک کچھ مزاحمت نہ ہو' کچھ کشمکش' کچھ دشواری نہ ہو تب تک کسی مہم کا کیا لطف۔ اس طرح تسکین نہیں ملتی۔ میں سوچ رہا تھا شاید اب مجھے شکار کے لیے زیادہ وسیع میدان کا انتخاب کرنا ہو گا۔ اب مجھے اونچے طبقے کا رخ کرنا چاہیے تھا۔

وہ کچھ کہہ رہی تھی جو میں سن نہیں سکا تھا۔ میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا... میں نے سنا نہیں۔ دراصل میں اس کیس کے بارے میں سوچنے لگا تھا جس پر آج کل کام کر رہا ہوں۔"

میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا تھا۔ میں واقعی اسی "کیس" کے بارے میں سوچ رہا تھا جس پر "کام" کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ آملیٹ بہت اچھا بنایا ہے تم نے۔ کیا تم خود نہیں کھاؤ گے؟"

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ مرد کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز کھا کر اس قسم کی عورتیں بہت خوش ہوتی ہیں۔ میں نے متانت سے کہا۔ "دو موقعوں پر میں کھانا تک بھول جاتا ہوں۔ ایک تو جب میں کسی کیس میں الجھا ہوتا ہوں۔ دوسرے جب میں عمدہ تفریح میں وقت گزار رہا ہوتا ہوں۔"

"آج کل تم کس کیس پر کام کر رہے ہو؟ کوئی راز کی بات تو نہیں ہے؟ راز کی بات تو میں سننا بھی نہیں چاہتی۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

"راز کی بات تو میں تمہیں بتاؤں گا بھی نہیں۔

صرف اتنا ہی بتاؤں گا جتنا اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ میں ان پانچ عورتوں کے کیس پر کام کررہا ہوں جنہیں پچھلے دنوں قتل کیا گیا ہے۔"

یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے حقیقت میں تو میں ہی وہ شخص تھا جو اس کیس پر کام کررہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ مجھے عورتوں کے بجائے لڑکیاں کہنا چاہیے۔ ان میں سے دو تو بیس سال سے کم عمر کی تھیں۔ بڑے ہی کراہیت انگیز انداز میں انہیں چھری سے کاٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔"

"اس طرح کی ڈراؤنی باتیں مت کرو۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔ "مجھے تو پہلے ہی بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔"

میں نے چھری اٹھا کر ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔ "قاتل نے ہر بار کچن کی عام سی چھری استعمال کی تھی۔ بالکل اس جیسی۔" میں نے چھری ہاتھ میں بلند کی۔

کھانا کھاتے کھاتے اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ جلدی سے نوالا نگل کر بولی۔ "کوئی اور بات کرو۔"

"میں کوئی اور بات کر ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "آج کل تو چوبیس گھنٹے میرے دماغ میں بس یہی خیال رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ میں یہی سوچ کر آیا تھا کہ شاید کچھ دیر کے لیے ادھر سے دھیان ہٹ جائے۔"

وہ چند سیکنڈ غور سے میری طرف دیکھتی رہی پھر میرا چھری والا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "اپنے ذہن کو بوجھل مت بناؤ۔ ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کرو۔ ہم یہاں تفریح کے لیے یکجا ہوئے ہیں۔"

پھر اس نے میرا دوسرا ہاتھ تھام کر مجھے کرسی سے اٹھایا اور اپنے قریب کھینچ لیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب میرے بائیں بازو کے حلقے میں تھی۔ میرے دائیں ہاتھ میں چھری اب بھی موجود تھی اور میں اس کے دستے پر گرفت مضبوط کررہا تھا۔ اب مجھے صرف یہی فیصلہ کرنا تھا کہ اس کا کام یہیں تمام کیا جائے یا بیڈ روم میں؟

اس نے خود ہی میرا مسئلہ حل کردیا اور مجھے دھیرے دھیرے بیڈ روم کے کھلے دروازے کی طرف لے چلی۔

میں دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔ "اوہ... رسٹی! جلد ہی تم اس غلاظت سے نکل آؤ گی اور دوبارہ پاک ہوجاؤ گی۔ تم یقیناً اپنے آپ کو میرا شکر گزار محسوس کرو گی کہ میں نے تمہیں پاکیزگی کی دنیا میں واپس بھیج دیا۔ تمہیں آلودگی سے نجات دلادی۔"

بیڈ روم میں روشنی کم تھی۔ وسط میں بڑا سا ڈبل بیڈ تھا جس پر سرخ ساٹن کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ سرہانے کی طرف تکیوں کے سہارے بڑا سا ایک ٹیڈی بیئر رکھا تھا۔ وہ بیڈ پر جاگری اور کھلونا ریچھ اٹھا کر اس کے عقب میں منہ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے منمنائی۔ "یہ مت سمجھنا کہ... کہ میں ہر ایک پر یونہی مہربان ہوجاتی ہوں اور ہر ایک کو یونہی گھر لے آتی ہوں... وہ تو بس تم اچھے لگے اس لیے..."

"ان گھٹیا عورتوں کو اپنے آپ کو عظیم اور پاکباز ظاہر کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔" میں نے حیرت سے سوچا اور بیڈ کا جائزہ لیا۔ اس کے سرہانے کے تختے میں پیتل کے موٹے موٹے سروں والی آرائشی کیلیں پیوست تھیں۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ اگر سر ٹکرانے کی ضرورت پڑی...

"مجھے بھی تم بہت اچھی لگی ہو رسٹی!" میں نے کہا۔ "اتنی اچھی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

چھری میں نے اپنے پیچھے چھپائی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے میں نے اسے ایک تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ پھر میں نے جیب سے ہتھکڑیوں کی جوڑی نکالی۔ دھات کی کھنکھناہٹ سن کر وہ چونکی۔ ہتھکڑیوں پر اس کی نظر پڑی تو حیرت سے بولی۔ "یہ کیوں نکالی ہیں تم نے؟"

"یہ بھی تفریح اور مذاق کا ایک حصہ ہیں۔ تم ذرا پہن کر تو دیکھو، میں تمہیں کچھ ایسے تماشے دکھاؤں گا جو تم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔"

یہ بھی ایک طرح سے سچ ہی تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا جب میں چھری سے اس کے

قابلِ نفرت وجود پر طبع آزمائی کروں، اس کی ناپاک ہستی کو پاکیزگی کی طرف واپس لے جانے کا آغاز کروں تو اس کے ہاتھ مزاحمت کے لیے آزاد ہوں۔ اس سے پہلے والی عورتوں میں سے بعض تو ہتھکڑیاں لگوانے پر آسانی سے آمادہ ہو گئی تھیں۔ بعض کو کچھ دیر بہلا پھسلانا پڑا تھا اور کسی کے ہاتھ میں زبردستی ڈالنا پڑی تھیں۔

رسٹی کچھ ضدی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہتھکڑیاں پہننے پر تیار نہیں تھی۔ وہ کچھ شک میں بھی مبتلا ہونے لگی تھی۔ بڑے سے ٹیڈی بیئر کو اس نے یوں اپنے سامنے کر لیا تھا گویا وہ اس کا دفاع کرے گا۔ پھر یکدم ہی وہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولی۔ ”میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ تم اب چلے جاؤ۔“ ریچھ پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے تم سرے سے پولیس والے ہی نہیں ہو۔ بلکہ... تم... تم... وہ قاتل ہو جس نے ان پانچ لڑکیوں کو قتل کیا ہے۔“

وہ خوفزدگی کے عالم میں اتنی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی تھی کہ مجھے قہقہہ لگانا پڑا۔ ”اگر میں تمہیں بتاؤں کہ واقعی میں وہی قاتل ہوں تو تم کیا کرو گی؟“

”کیا تم واقعی وہ ہو؟“ اس کی آنکھوں میں خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

”ہاں رسٹی! میں یقیناً وہی قاتل ہوں... اور چونکہ تم بہت ذہین ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں جو تجربہ حاصل ہو وہ تمہاری زندگی کا سب سے انوکھا، سب سے منفرد تجربہ ہو لیکن افسوس کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری تجربہ ہو گا۔ اس تجربے سے بچنے کے لیے تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔“

میں نے ہتھکڑی لگانے کے لیے اس کے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے ٹیڈی بیئر کے عقب سے سامنے آیا تو اس میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ بدلی بدلی آواز میں بولی۔ ”اس تجربے سے بچنے کے لیے میں بہت کچھ کر سکتی ہوں کیونکہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور میں تمہیں حراست میں لے رہی ہوں۔“

”اچھا... تو تم چارہ بنی ہوئی تھیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تم نے اتنا گھٹیا روپ دھارا ہوا تھا۔“ میں نے غصے سے کہا۔ میں اسے ڈانٹنے میں اپنے آپ کو حق بہ جانب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مکمل طور پر طوائفانہ انداز و اطوار اختیار کیے تھے۔ یہ میرا عقیدہ تھا کہ ایک پولیس آفیسر کو عظیم ترین مقاصد کے لیے بھی اتنا گھٹیا روپ نہیں دھارنا چاہیے تھا۔ میرے ڈیڈی تو کہا کرتے تھے کہ ”عورتوں کو تو پولیس میں بھرتی کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ مخلوق اس قابل ہی نہیں ہوتی۔“

لیکن کیسی ستم ظریفی تھی کہ عورتوں کو تو پولیس فورس میں بھرتی کر لیا جاتا تھا لیکن مجھے نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے پولیس میں بھرتی ہونے کا جنون کی حد تک شوق تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں کبھی منشیات استعمال کرتا رہا ہوں اور شاید اسی وجہ سے یا پھر اور سبب سے میرے دماغ میں کچھ خلل آ گیا تھا۔

چنانچہ اب مجبوراً مجھے پولیس کا جعلی بیج لے کر پھرنا پڑتا تھا لیکن میرا ریوالور بہرحال اصلی تھا اور اس سے میں رسٹی کی پیشانی کا نشانہ لے چکا تھا۔

”تم مجھ پر گولی چلا سکتی ہو لیکن ساتھ ہی تمہیں بھی گولی لگ چکی ہو گی۔“ میں نے خبردار کیا۔ ”اس سے بہتر ہے کہ تم ریوالور پھینک دو اور میری بات مان لو۔ شاید میں تمہاری جان بخش ہی دوں۔ ضروری نہیں کہ میں نے ان پانچ عورتوں کو ہلاک کیا تھا تو تمہیں بھی ہلاک ہی کروں۔“

پھر یکدم ہی میں نے چلا کر کہا۔ ”ریوالور پھینک دو۔“

اس طرح چلانا میری غلطی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو خود پر قابو نہیں رہا اور سامنے والے کو یہ احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کو خود پر قابو نہیں رہا۔

”کیا واقعی یہ تم سمجھ رہے ہو کہ میں یہاں اکیلی ہوں؟“ وہ بولی۔ ”کیا تمہارے خیال میں ہم تمہاری

حقیقت سے آگاہ نہیں ملی؟ ہم ہفتوں سے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں، تمہارے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ جب سے آخری لڑکی قتل ہوئی ہے تب سے ہم اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم جب اس تک پہنچے تو اس میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ ہمیں اتنا بتانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اس کا قاتل کوئی پولیس والا تھا جس کا باپ بھی پولیس میں تھا۔ وہی کہانی جو تم نے مجھے سنائی ہے۔ وہ لڑکی کافی حد تک حلیہ بتانے میں بھی کامیاب ہو گئی تھی۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تم جعلی پولیس آفیسر ہو اور تمہارا دماغی توازن بھی ٹھیک نہیں۔"

"تم بکواس کرتی ہو۔" میں ایک بار پھر چلا اٹھا۔

"میں جب اس لڑکی کے پاس سے رخصت ہوا تو وہ مر چکی تھی۔" دل ہی دل میں، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "چیخو مت۔ بالکل پر سکون رہ کر بات کرو۔ صورت حال اسی کے ہاتھ میں رہتی ہے جو پر سکون رہتا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ میں رسٹی کو گولی مار کر ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں کوئی مزا نہیں تھا۔ مجھے گولی کھانے کی بھی پروا نہیں تھی اور اس بے خوفی کی وجہ سے مجھے رسٹی پر کچھ برتری حاصل تھی۔ ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے گولی مارنے سے حتی الامکان گریز کرے گی۔ مجھ جیسے آدمی کو لاش کی صورت میں پولیس اسٹیشن لے جانے کے بجائے زندہ لے جانے کی تمنا اس کے دل میں زیادہ شدت سے جاگزیں ہو گی۔

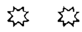
میں نے ایک بار پھر اس کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ تیزی سے بیڈ کے دوسری طرف پھسل گئی اور بولی۔ "تمہارے بارے میں ہمیں تمہارے باپ کے ایک پرانے دوست نے بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں تم عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتے تھے۔ آوارہ بلیوں کو مار ڈالتے تھے۔ کبھی کہیں آگ لگا دیتے تھے۔ تمہاری حرکتوں سے دل برداشتہ ہو کر تمہاری ماں اور باپ دونوں شرابی ہو گئے تھے۔ بالغ ہوتے ہی تم پولیس ہیڈ کوارٹرز کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ ہر وقت تمہارا ایک ہی مطالبہ تھا کہ تمہیں پولیس میں بھرتی کر لیا جائے۔ تمہارے باپ کے اس پرانے دوست کا کہنا تھا، خدا کا شکر ہے اس لڑکے کو پولیس میں بھرتی نہیں کیا گیا۔ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ پولیس میں ہوتا تو کیا قیامت ڈھاتا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا نا مکی؟"

"ٹھیک بھی کہہ رہا تھا تو میں کیا کروں؟ تمہارا خیال ہے میں اپنے آپ کو خطاکار محسوس کر کے اپنے آپ پر ترس کھانے لگوں گا؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں۔ اب تم اپنا ریوالور مجھے دے دو اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں وہ مجھے کرنے دو ورنہ مجبوراً" "مجھے تم کو گولی ہی مارنا پڑے گی۔ تمہارا وقت آ چکا ہے رسٹی! اس سے بچنے کا اب کوئی طریقہ نہیں۔"

تب رسٹی بہ آواز بلند بولی۔ "بھئی یہ یوں نہیں مانے گا۔ اب تم لوگ باہر آ ہی جاؤ۔"

اچانک دیوار گیر الماریوں کے دروازے کھلے اور ہاتھوں میں ریوالور، چہروں پر غصہ لیے کئی آدمی یکدم باہر آ گئے۔ میں نے اپنے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ لی لیکن رسٹی نے بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے چھری نکالنا چاہی لیکن رسٹی نے میرے پیٹ میں لات رسید کی اور میں دہرا ہو گیا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ انہوں نے مجھے میری ہی ہتھکڑیاں لگا دی تھیں!



اظہار ذات

لیلیٰ زبیر

انسان خود کو منوانے کے لیے نہ معلوم کیا کیا جتن کرتا ہے اپنی شخصیت، اپنی شناخت کے لیے ہر مشکل سے گزرنے کو تیار رہتا ہے۔ ایک ایسی ہی عورت کی کتھا جو اپنی ذات کے اظہار کے لیے کوئی ذریعہ چاہتی تھی یہ جنون اسے ایک غلط راہ پر لے گیا۔

بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر " ایک شوخ و چنچل ہنستی مسکراتی تحریر

نینسی دبے قدموں گھر میں داخل ہوئی تو اس کا خیال تھا کہ جان اور بچے ٹی وی پر کارٹون شو دیکھ رہے ہوں گے اور وہ چپکے سے کچن میں جا کر ڈنر تیار کر سکے گی۔ جب جان اور بچوں تک کھانے کی خوشبو پہنچے گی تو وہ اپنا غصہ بھول جائیں گے مگر وہ سب لیونگ روم میں ہی موجود تھے۔ جان سگار یوں چبا رہا تھا جیسے اس سے کوئی پرانی دشمنی ہو۔ تیرہ سالہ ٹام اوندھے منہ قالین پر لیٹا رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ نینسی کو معلوم تھا کہ بھوک کی حالت میں اس سے کچھ نہیں ہوتا بارہ سالہ جینی پاپ کارن کا تھیلا سنبھالے بیٹھی تھی اور نو سال کا ٹونی صوفے پر بیٹھا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ غصے کے عالم میں وہ یہی کرتا تھا۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ تو نینسی کو اسی سے ہو گیا تھا کہ وہ اپنا پسندیدہ کارٹون شو بھول کر لیونگ روم میں اس کے منتظر تھے۔

"سوری جان، مجھے ذرا دیر ہو گئی۔" نینسی نے فوراً شرمندگی ظاہر کی۔ جان نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور سگار چباتا رہا۔ نینسی نے اندازہ لگایا کہ معافی تلافی سے کام نہیں چلے گا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کو مدد کے لیے پکارا اور سوچنے لگی کہ آغاز کہاں سے کرے۔ اس نے ہمت کر کے کہا "دراصل آج میری فریڈ سے ملاقات ہو گئی تھی۔"

"فریڈ۔" جان نے سگار چبانا موقوف کر کے غرا کر کہا۔ اس کی غراہٹ کسی بھینسے سے مشابہ تھی جس نے اپنے رقیب روسیاہ کو دیکھ لیا ہو۔ "وہ بدمعاش ابھی تک زندہ ہے اور تم کب سے اس سے مل رہی ہو؟"

جواب دینے سے پہلے نینسی نے بچوں کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ گھریلو تنازعہ اب مما پپا کا ذاتی جھگڑا بننے والا ہے۔ لہٰذا وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ نینسی نے کہا "تمہیں بچوں کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"پھر کس قسم کی باتیں کرنی چاہئیں اور یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"میں وہی بتا رہی ہوں۔" نینسی جلدی سے بولی "آج فریڈ مجھے ایورنیو اسٹریٹ پر ملا تھا۔ بے چارہ اپنی



کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ظاہر ہے۔" جان نے منہ سے سگار نکالا "جس کار میں فریڈ جیسا منحوس شخص بیٹھا ہو وہ کیسے اسٹارٹ ہو سکتی ہے۔" نینسی نے اسے پر ملامت نظروں سے دیکھا۔

"جان تم پرانی باتوں کو بھول نہیں سکتے۔ یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے جب ہم بچے ہوا کرتے تھے۔ اب تو خود ہمارے بچے ہیں۔"

"کیسے بھول جاؤں۔" آج جان صرف غرانے کے موڈ میں تھا۔ "وہ خبیث کیسے فخر سے تمہیں اپنی منگیتر بتاتا تھا۔ تم نے غالباً" زیادہ ہی جذبات میں آکر اس سے کوئی نام نہاد سی منگنی کر لی تھی۔"

نینسی کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا۔ وہ مدافعانہ انداز میں بولی۔ "لیکن شادی تو میں نے تم سے ہی کی ہے۔"

"اور اس جرم میں اس بدمعاش نے اپنے لفنگے دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔"

"خدا کی پناہ۔" نینسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ انہوں نے تمہیں چار گھونسے اور شاید اتنی ہی ٹھوکریں ماری تھیں لیکن تم نے تو مبالغے کی حد کر دی۔"

"ان کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہی تھا۔" جان نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

نینسی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہر حال میں نے اسے لفٹ دے کر اسے گھر تک چھوڑا۔ وہاں فریڈ نے مجھے ایک کپ کافی کی پیش کش کی جو میں نے اخلاقاً" قبول کر لی۔ پھر ہم باتوں میں ایسے کھوئے کہ مجھے وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ جب فریڈ نے مجھے ڈنر کی دعوت دی تو مجھے گھر کا خیال آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ میں نے ابھی گھر جا کر اپنے شوہر اور تین بچوں کے لیے ڈنر تیار کرنا ہے۔ تمہارا سن کر وہ گھر آنے کو تیار ہو گیا تھا۔ میں نے بہ مشکل اسے باز رکھا۔ مجھے معلوم تھا تم اسے پسند نہیں کرو گے۔ میں پہلے تمہیں تیار کرنا چاہتی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ وہ خبیث اور بدمعاش اب یہاں آئے گا۔ اس گھر میں؟" جان چلا اٹھا تھا۔

"ظاہر ہے ایک شادی شدہ عورت کا کسی مرد سے باہر ملنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

جان نے مشکوک نظروں سے نینسی کو دیکھا "سنو تم فلاور میکنگ کی کلاس ہی لینے جاتی ہو؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نینسی نے احتجاج کیا "اب تمہیں مجھ پر اعتماد بھی نہیں رہا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن تمہاری افتاد طبیعت پر بالکل نہیں ہے۔ مجھے تو اس فریڈ کے عقب میں بھی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے ورنہ اس کی منحوس صورت پر کوئی بندریا ہی فریفتہ ہو سکتی ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ اصل چکر کیا ہے؟"

"جان کوئی چکر نہیں ہے۔" نینسی کسی قدر نروس نظر آنے لگی۔

"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری فلاور میکنگ کی کلاس کیسی جا رہی ہے؟"

نینسی نے منہ بنایا۔ "ایک دم فضول، پہلی والی ٹیچر جاب چھوڑ کر جا چکی ہے اور جو دوسری ٹیچر آئی ہے اسے فلاور میکنگ اتنی ہی آتی ہے جتنی کہ تمہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں بلکہ سوچ لیا ہے کہ فلاور میکنگ چھوڑ دوں۔ بلاوجہ رقم کا زیاں ہے۔"

یہ سن کر جان نے تھوڑی سی تسلی محسوس کی۔ فلاور میکنگ پر نینسی اتنی رقم گنوا چکی تھی جس سے پورا گھر پھولوں سے بھرا جا سکتا تھا۔ اصلی اور مہکتے پھولوں سے مگر اب پورے گھر میں جا بہ جا نینسی کے تیار کیے ہوئے پھول نظر آتے تھے حالانکہ کپڑے، کاغذ اور تار کی مدد سے وہ جو کچھ بناتی تھی' اسے پھول کہنا ذرا مشکل کام تھا مگر جان اور بچے نینسی کی دل شکنی کے خیال سے اپنے تاثرات خود تک محدود رکھتے تھے۔

جب جان اور نینسی کی شادی ہوئی تو وہ خاصے عرصے تک بالکل ٹھیک رہی تھی۔ مسئلہ آج سے پانچ سال

پہلے پیدا ہوا تھا۔ [illegible] مگر نینسی [illegible]
فکر ستانے لگی تھی۔ [illegible] اپنا [illegible] اظہار [illegible]
لیے کچھ نہیں کیا تھا اور [illegible] خیال [illegible]
تھا جو بقول نینسی کے ایک عظیم ڈریس ڈیزائنر تھی اور
ہالی ووڈ کی اداکاراؤں کے لیے کپڑے ڈیزائن کرتی تھی
مگر جان کے خیال میں وہ صرف ایک عظیم گپ باز
تھی۔ بھلا ہالی ووڈ والوں کو کیا ضرورت تھی کہ براڈوے
کی اس چھوٹی سی ڈریس ڈیزائنر سے کام لیتے۔ ویسے
بھی ہالی ووڈ کی ہیروئنوں میں اب کپڑے وغیرہ کا رواج
ختم ہوتا جا رہا تھا کم از کم پہننے کی حد تک تو۔ بہت بولتی
تھی اور اپنی گفتگو میں بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے
کی شوقین تھی اور یہ ذات کے اظہار والی اصطلاح بھی
اس نے نینسی کو بتائی تھی۔ جسے وہ اب بغیر سوچے سمجھے
زور و شور سے استعمال کرتی تھی۔ جان کا خیال تو یہی
تھا۔ ذات کے اظہار کے لیے نینسی کو جو طریقہ سب
سے مناسب لگا وہ ماڈلنگ تھا۔ جب اس نے یہ بات
جان کو بتائی تو اسے اچھو لگا۔ بد قسمتی سے وہ اس وقت
بے حد گرم کافی پی رہا تھا۔ جو اس کے پیروں پر گری تو وہ
خاصی دیر رونے والے انداز میں ہنستا رہا مگر نینسی کو
سنجیدہ دیکھ کر اسے بھی سنجیدہ ہونا ہی پڑا۔

"جان من ابھی تو فرسٹ اپریل میں پورے دس دن پڑے ہیں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ میں ماڈل بننے کا حتمی فیصلہ کر چکی ہوں۔"

جان نے ملائمت سے کہا "تم جانتی ہو۔ تم پورے تیس سال کی ہو چکی ہو اور میں نے کسی عورت کو اس عمر میں ماڈل بننے کا فیصلہ کرتے نہیں دیکھا۔"

"عمر کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" نینسی نے گویا اسے سمجھایا "اب دیکھو جتنی بھی سپر ماڈل ہیں، سب تیس سے چالیس سال کے درمیان ہیں۔ بعض تو اس سے بھی زیادہ عمر رسیدہ ہیں۔"

"درست۔" جان نے تسلیم کیا "لیکن وہ برسوں کی جدوجہد کے بعد اس مقام تک پہنچی ہیں اور تمہیں ابھی ماڈلنگ کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔"

"میں بھی [illegible] مسئلہ [illegible]
کہا۔ "ماڈلنگ کوئی مشکل کام تو نہیں [illegible]
ہزاروں دوسری عورتیں بھی تو ماڈلنگ کر رہی [illegible]
میں سے کتنی ہی مجھ سے کم خوب صورت [illegible]"

یہ بات تو جان بھی تسلیم کرتا تھا۔ [illegible]
دل میں۔ دس سالہ [illegible]
تھا کہ بیوی کے حسن کی زیادہ [illegible]
جیب کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ [illegible]
بھی بے حد متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کی [illegible]
آنکھیں اور شفاف جلد دیکھ کر کوئی بھی اسے [illegible]
برس کی تسلیم کر سکتا تھا۔ اس کے سنہرے مائل
بھورے بال آبشار کی طرح اس کی پشت پر پھیلے رہتے
تھے۔ اس کے مقابلے میں جان قبل از وقت گنجا اور
بوڑھا ہونے لگا تھا۔ جان وکیل تھا اور آرنی جیسے مشہور
وکیل کا پارٹنر تھا اور یہ مقام اس نے خاصی جدوجہد کے
بعد حاصل کیا تھا۔ اب جان صرف بڑے مقدمے لیتا
تھا اور چھوٹے موٹے کیسز کے لیے درجن بھر جونیئر
وکیل تھے۔ وکالت میں مقام بنانے کے چکر میں وہ
ورزش اور دوسری سرگرمیاں بھی بھلا بیٹھا تھا۔ نتیجے
میں اس کی توند نکلنے لگی اور وہ موٹا ہوتا چلا گیا۔ بعد میں
نینسی اس کے کھانے پینے پر کڑی نظر رکھنے لگی تھی۔
اس کے مجبور کرنے پر جان نے ایک ٹینس کلب بھی
جوائن کر لیا تھا۔ ابتدائی مصروفیات کم ہونے کے بعد
نینسی کو احساس ستانے لگا کہ اس نے اپنے لیے تو کچھ
کیا ہی نہیں تھا۔ بس گھر دیکھتی اور بچوں کو پالتی رہی
تھی۔ اب جان کی مصروفیات بھی کم ہو گئی تھیں اور
بچے بھی سمجھ دار ہو گئے تھے۔

جان با دل ناخواستہ اس کے فیصلے سے متفق ہوا اور اس نے نینسی کو ماڈلنگ کے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی۔ اسے امید تھی کہ ایک آدھ مہینے میں نینسی کے دماغ سے یہ بھوت اتر جائے گا تو فیس کے چار سو پچھتر ڈالرز اور تیس سینٹ زیادہ برے نہیں رہیں گے۔ گھریلو خواتین کے لیے یہ کلاسز دوپہر کے بعد ہوتی تھیں۔ لہٰذا نینسی کو کچھ معمولات کی طرف

سے بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ گھر کے سارے کام صبح ہی نمٹا لیتی تھی۔ بچے اسکول سے آکر کھانے کے بعد ہوم ورک میں لگ جاتے تو وہ اپنی کلاس کے لیے نکل جاتی وہاں سے واپسی پر وہ بہت تھک جاتی تھی کیوں کہ اس کی ٹیچر کے خیال میں ماڈلنگ کے نقطہ نظر سے اس کا جسم کچھ "فربہ" تھا۔ اسے دبلا کرنے کے لیے کڑی ورزشوں کی تجویز کے ساتھ ٹیچر نے متعدد ایسے کھانوں پر پابندی لگادی جن میں سے اکثر نینسی کو بے حد پسند تھے۔ خاص طور سے اسنیکس اور چکن روسٹ' وہ ان عورتوں میں سے تھی جو کچھ بھی کھالیں۔ ان کے جسم پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا مگر "ذات کے اظہار" کے لیے کچھ قربانیاں تو دینی پڑتی ہی ہیں۔ جب اس کی ٹیچر رینی نے اسے بتایا کہ سپر ماڈل کلاڈیا شیفر نے اپنے جسم کو دبلا بنانے کے لیے کتنے فاقے برداشت کیے تھے تو نینسی کا عزم مزید بڑھ گیا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ کھانے کی میز پر جان اور بچے تو مرغن غذاؤں پر ہاتھ صاف کررہے ہوتے تھے تو وہ ابلی ہوئی سبزیاں زہر مار کررہی ہوتی تھی اور وہ بھی اتنی کم مقدار میں کہ اسے کھانے کا خلاصہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ رات کو اکثر اسے مارے بھوک کے نیند ہی نہیں آتی تھی اور جب نیند آتی تو وہ خواب بھی لذیذ کھانے کے دیکھا کرتی تھی۔

بقول رینی کے ایک مہینے بعد نینسی کی کچھ شکل نکل آئی تھی۔ جب کہ جان کا خیال تھا کہ اس کی ہڈیاں نکل آئی ہیں اور اس کی صورت اس بلی سے مشابہ ہوگئی ہے جس نے ایک ہفتے سے کچھ نہ کھایا ہو۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ایک ڈش واشنگ پاؤڈر بنانے والی کمپنی اس کی تصاویر دیکھ کر اپنے اگلے اشتہار کی ماڈل کے طور پر منتخب کرلیا۔ بقول کمپنی کے پبلٹی منیجر نینسی ایک مثالی گھریلو خاتون نظر آرہی تھی (تصویروں میں) لیکن جب اسے ٹیسٹ کے لیے بلایا گیا۔ تو اس کا قحط مارا جسم اور فاقے زدہ صورت دیکھ کر کمپنی کے گرم جوشی کے جذبات ٹھنڈے پڑگئے اور انہوں نے نینسی سے معذرت کرلی کہ انہیں اس نینسی کی ضرورت ہے جو تصویروں میں نظر آرہی تھی۔ اس کی ہیں جو تین دن کے فاقے سے نظر آتی ہے۔

ایسا جاندار موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس شام وہ گھر آئی تو جان نے بغور اس کی صورت دیکھی "ڈارلنگ شاید تمہارا کچھ آنسو وغیرہ بہانے کا پروگرام ہے۔"

یہ سن کر سچ مچ نینسی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور رونے کے ساتھ جان کو اپنی خراب تقدیر کا احوال سناتی رہی "میں نے خود پر اتنا جبر اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھے مسترد کردیں۔"

جان نے بہ مشکل اپنی مسرت چھپائی اور اسے تسلی دی "تم کیوں اپنا دل چھوٹا کرتی ہو۔ دنیا نے کب کسی کی صلاحیت کو پہچانا ہے میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم لعنت بھیجو اس کام پر۔"

نینسی اتنی جلدی بددل نہ ہوتی اگر وہ رینی کو ایک ریستوران میں وہی سب کچھ کھاتے نہ دیکھ لیتی جن کھانوں کی اس نے نینسی پر پابندی عائد کررکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے سچ مچ ماڈلنگ پر لعنت بھیج دی۔ جان اور بچوں نے اس خوشی میں پارٹی دی تھی۔ البتہ نینسی کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ پارٹی کس خوشی میں دی جارہی تھی۔ جان کے خیال میں اب نینسی کے دماغ سے یہ "ذات کے اظہار" کا خیال نکل جائے گا مگر ایسا ہوا نہیں۔ چھ سات مہینے سکون سے گھرداری کرنے کے بعد نینسی کو ایک بار پھر یہ خیال ستانے لگا کہ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ بچے پالنا اور گھر چلانا بھی کوئی کام تھا۔

ایک روز وہ سب پورے انہماک سے کاریگن شو دیکھ رہے تھے۔ اس شو میں ایسے افراد کو مدعو کیا جاتا تھا جو کوئی غیر معمولی کام کرجاتے تھے۔ اس دفعہ شو میں ایک ستر سالہ بڑی بی کو مدعو کیا تھا۔ جنھوں نے اس عمر میں کمرشل پائلٹ کا لائسنس حاصل کرکے ایک ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ شو میں بڑی بی کی مختصر سوانح عمری اور یہ بتانے کے بعد کہ انہیں اس عمر میں پائلٹ بننے کا شوق کیوں چرایا تھا۔ کاریگن نے ایک فلم چلوائی جس

میں بڑی ہی خاصی مہارت سے چار نشستوں والا ایک سیسنا اڑا رہی تھیں۔ نینسی یہ فلم دیکھنے میں اتنا محو ہوئی کہ اسے کھانا جلنے کی بو بھی نہیں آئی جسے وہ اوون میں رکھ آئی تھی۔ اوون کا الارم خراب تھا اور اسے ٹھیک کرنے والا کاریگر کئی بار فون کرنے کے باوجود نہیں آیا تھا۔ فلم ختم ہونے کے بعد جب اسے کھانے کا خیال آیا تو وہ کچن کی طرف دوڑی۔ جہاں کھانا کوئلہ ہوچکا تھا۔ اس رات انہیں سینڈوچ کھانے پڑے تھے۔ جب نینسی برتن دھو رہی تھی اور جان کافی پیتے ہوئے آج کی ڈاک دیکھ رہا تھا کہ اچانک نینسی اس کی طرف گھومی۔

''جان۔'' اس نے جس لہجے میں کہا' جان سمجھ گیا کہ اب کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ اس کا اندازہ درست نکلا نینسی بولی ''اگر میں فلائنگ سیکھ لوں تو کتنی انوکھی بات ہوگی۔''

''بات تو واقعی انوکھی ہوگی۔'' جان نے دل میں سوچا اور منہ سے بولا ''یہ کون سی خاص بات ہے امریکا میں ہزاروں عورتیں فلائنگ کرتی ہیں۔''

''خاص بات کیوں نہیں ہے۔ اب دیکھو امریکا کی کل آبادی اٹھائیس کروڑ ہے۔ اس میں سے آدھی عورتیں ہیں یعنی چودہ کروڑ اور میں نے کچھ دن پہلے پڑھا تھا کہ امریکا میں ایک لاکھ کے قریب خواتین کے پاس پرواز کا لائسنس ہے۔ یعنی ہر ایک ہزار چار سو عورتوں میں سے ایک عورت پائلٹ ہے جب کہ میں نے سنا ہے کہ ہر چھ سو افراد میں سے ایک وکیل ہے تو فلائنگ خاص کام ہوا نا؟''

''ہاں ہوا تو۔'' جان نے بادل ناخواستہ اقرار کیا۔

اس پر نینسی کے جوش و خروش میں اضافہ ہوگیا۔ ''اب سوچو کہ ہمارے جاننے والوں میں کتنی عورتیں ہیں جو فلائنگ جانتی ہیں۔ شاید ایک بھی نہیں۔ اگر میں طیارہ اڑانا سیکھ لوں تو نئی بات ہوگی ناں؟''

جان نے نینسی کو سمجھانے کی بے سود کوشش کی کہ فلائنگ کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اتنا مشکل کام ہے کہ ہزار میں سے کوئی ایک فرد ہی فلائنگ سیکھ پاتا ہے پھر اس میں خطرات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ سن کر نینسی کے جوش و جذبے میں کمی نہیں آئی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ ''اسی لیے تو میں پرواز سیکھنا چاہتی ہوں۔'' اگلی صبح نینسی نے ایک فلائنگ کلب اسکول سے رابطہ کیا اور وہاں داخلہ لے لیا۔ اسکول ان کے گھر کے نزدیک ہی واقع تھا۔ اس کی فیس کے چیک کو سائن کرتے ہوئے جان نے خود کو کوسا تھا۔ آخر اسے اتنا کمانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس کی بیوی کو اس قسم کے شوق چرائیں۔ ساتھ ہی اسے پہلی بار کارٹون شو سے بھی نفرت ہوئی تھی۔

فیس کی خیر تھی اسے رقم سے زیادہ نینسی کی فکر تھی۔ اسے آج تک ڈھنگ سے کار ڈرائیو کرنا نہیں آئی تھی۔ وہ جب بھی کار لے کر نکلتی تھی۔ واپسی میں اس پر کوئی نہ کوئی نیا ڈینٹ ہوتا تھا مگر طیارے میں حادثے کی صورت میں معاملہ صرف ڈینٹ پر نہیں ٹلے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نینسی بعض اوقات اچھی خاصی تکلیف دہ ہوجاتی تھی لیکن وہ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پھر بچوں کو اور گھر کو کون دیکھتا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نینسی کسی بات پر ضد میں آجائے تو اپنی کرکے رہتی ہے۔ ان کی بارہ سالہ ازدواجی زندگی میں ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا جب انہوں نے طلاق کے بارے میں سوچا ہو اور نہ ہی جان چاہتا تھا کہ ایسا کوئی موقع آئے۔

فلائنگ کورس خاصا آسان سا تھا۔ پہلے دو ہفتے کی کلاسیں تھیں۔ جن میں ایرناٹیکل کے بارے میں پڑھایا جاتا۔ اس کے امتحان کو پاس کرلینے والوں کو عملی تربیت دینے کا آغاز ہوتا تھا۔ ایک ہفتے تک انسٹرکٹر طیارہ اڑا کر شاگرد کو دکھاتا تھا پھر مزید دو ہفتے شاگرد انسٹرکٹر کی زیرہدایت طیارہ اڑاتا اور اس کے بعد انسٹرکٹر اگر مناسب سمجھتا تو سیکھنے والا اکیلے ہی پرواز کرتا۔ آخر میں ایوی ایشن کا امتحان ہوتا جس میں پاس کرنے والے کو فلائنگ لائسنس مل جاتا تھا مگر جان کو شبہ تھا کہ نینسی اس مرحلے تک پہنچ نہیں سکے گی۔ وہ

اس سے پہلے ہی طیارہ کسی اسکائی اسکریپر سے ٹکرا دیتی یا کسی گالف کے میدان میں اتار دیتی۔ دونوں صورتوں میں اس کی وفات کے امکانات روشن تھے۔

پہلے دن نینسی فلائنگ کلب سے واپس آئی تو خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اس نے لگاتار ہنستے ہوئے جان اور بچوں کو بتایا "فلائنگ تو اتنا آسان کام ہے۔ اگر آج وہ مجھے طیارے پر بٹھا دیتے تو میں فلائنگ کر کے ہی واپس آتی۔"

جان نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ فلائنگ کلب والوں نے ایسی غلطی نہیں کی ورنہ یہ کہنا مشکل تھا کہ نینسی کس شکل میں واپس آتی۔ اسے نینسی کے جوش و خروش سے مایوسی ہوئی پھر یہ مایوسی بڑھتی ہی چلی گئی کیوں کہ نینسی کا جوش و خروش بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ہفتے بعد اس نے گھر آکر خوش خبری' سنائی کہ اس نے نظر کا امتحان پاس کر لیا ہے' کل سے اس کی عملی تربیت کا آغاز ہو رہا ہے۔ جان نے اوپری دل سے مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد دی تھی لیکن جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹے تو جان نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

"ڈارلنگ میرا خیال ہے تم یہ فلائنگ وغیرہ کا پروگرام فی الوقت ملتوی کر دو۔"

نینسی چونکی "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میرے خیال میں تو ٹھیک ہی ہے۔"

"تب تم نے ایسی احمقانہ بات کیوں کی۔" نینسی چلائی۔ اسے بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو..... اس تصور سے جان کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ جلدی سے بولا "دیکھو تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ابھی بچوں کے امتحانات ہونے والے ہیں اور مجھے بھی آرنی کے ساتھ واشنگٹن میں ایک سیمینار میں جانا ہے۔"

نینسی کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ "تم اس کی فکر مت کرو۔ روزانہ ایک گھنٹے کی کلاس تو ہو گی۔ میں تین بجے جاؤں گی اور پانچ بجے لوٹ آیا کروں گی۔"

یہ نینسی کے عملی فلائنگ شروع کرنے کے چوتھے یا پانچویں دن کی بات ہے۔ جان دفتر میں ایک کلائنٹ سے مغز ماری کر رہا تھا کہ ڈسٹرکٹ ویسٹ اسپتال نے کال آئی "مسٹر ریکٹن جان۔ نینسی جان تمہاری بیوی ہے؟" جان کا دل اندیشوں سے بھرنے لگا۔ "ہاں خیریت تو ہے؟"

"خیریت تو ہے لیکن بہتر ہو گا تم اسپتال آجاؤ۔"

جان نے دفتر سے اسپتال تک کا فاصلہ یوں طے کیا جیسے کسی فارمولا ون کار ریس میں حصہ لے رہا ہو۔ کئی بار وہ حادثے سے محض اس لیے بچ گیا کہ ابھی اس کی قضا نہیں آئی تھی۔ اسپتال میں اسے معلوم ہوا کہ نینسی جان نامی جو خاتون آئی تھیں' وہ آئی سی یو میں ملیں گی۔ یہ سن کر جان کی آنکھوں تلے اندھیرا سا آگیا۔ وہ جیسے تیسے آئی سی یو تک پہنچا۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر ہر بری خبر کے لیے تیار کر لیا تھا۔ آئی سی یو میں اس نے نینسی کے بارے میں پوچھ ہی تھا کہ عقب سے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ نینسی تھی۔ جان ہکا بکا رہ گیا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے سر سے پیر تک نینسی کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک ہی نظر آرہی تھی۔ سوائے سر اور ہاتھوں پیروں پر بندھی کچھ پٹیوں کے۔

"یہ بالکل ٹھیک ہیں۔" نینسی کے عقب میں کھڑے ڈاکٹر نے کہا۔ "البتہ دوسرے کا حال برا ہے۔"

"دوسرا کون؟" جان نے پوچھا۔

"میرا انسٹرکٹر۔" نینسی نے منہ بنا کر کہا "اسے خود طیارہ اڑانا نہیں آتا دوسروں کو کیا سکھائے گا وہ۔"

"ایک منٹ۔" جان نے اس کی بات کاٹی ڈاکٹر سے بولا "تم مجھے بتاؤ کہ اصل چکر کیا ہے؟"

"چکر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" ڈاکٹر نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "لیکن میں نے سنا ہے کہ ائر کلب کا ایک طیارہ بغیر پہیوں کے اتر گیا تھا۔"

نینسی نے فوراً" صفائی پیش کی "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ڈارلنگ' بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ ہینڈل کو زیادہ دیر دبائے رکھوں گی تو پہیے واپس چلے

جائیں گے۔ یہ سب جیری کا قصور ہے۔"

"کیا مطلب؟" جان کی آنکھیں پھیل گئیں "تم فلائنگ کر رہی تھیں، چوتھے ہی دن۔"

"میں فلائنگ ضرور کر رہی تھی لیکن طیارہ جیری ہی اڑا رہا تھا۔ وہ میرا انسٹرکٹر ہے۔"

"پھر تم نے ہینڈل کیوں استعمال کیا؟"

"مجھے جیری نے کہا تھا۔ وہ اسی طرح تربیت دیتا ہے۔" جان نے ٹھنڈی سانس لے کر ڈاکٹر سے پوچھا "مسٹر جیری کہاں ہیں؟"

ڈاکٹر اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں جیری بستر پر ہاتھ پیر ہوا میں لٹکائے لیٹا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ نینسی پر نظر پڑتے ہی وہ چلا اٹھا تھا۔ "میں تم پر مقدمہ کردوں گا۔ وہ تمہارا وکیل شوہر بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔"

جان بولا "وہ وکیل شوہر اتفاق سے میں ہوں۔ ذرا مجھ سے بات کرلو۔"

"تو تم ہو اس کے شوہر۔ یہ عورت نہیں موت کا فرشتہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس نے کیا حرکت کی۔ اوہ میرے خدا میں نے بغیر پہیوں کے لینڈنگ کی تھی۔ میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کے طیارے کا بیڑا غرق ہوگیا میں نے اس کی ری انشورنس بھی نہیں کرائی تھی۔ اب مجھے ایک پیسہ نہیں ملے گا اور یہ سب اس عورت کی وجہ سے ہوا۔ یہ عورت نہیں چڑیل ہے۔" اس نے شعلہ فشاں نظروں سے نینسی کی طرف دیکھا تو وہ فوراً" جان کے عقب میں ہوگئی۔

"افسوس کہ تمہاری ٹانگیں پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہیں۔"

جان نے اسے بلاواسطہ دھمکی دی۔ وہ ایک ڈاکٹر کے سامنے اس کے مریض کو نہیں دھمکا سکتا تھا "خیر تم جلد ہی ٹھیک ہوجاؤ گے اور کہیں نہ کہیں دوبارہ ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ ویسے یہ سن کر تمہیں خوشی ہوگی کہ میں کالج کے زمانے میں مڈل ویٹ چیمپئن رہ چکا ہوں۔"

جیری کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا تھا "میرا یہ مطلب نہیں تھا مسٹر جان۔ میں معافی چاہتا ہوں لیکن دیکھو اس حادثے میں تمہاری بیوی......"

جان نے اس کی بات کاٹی "تم میری بیوی کو الزام دے رہے ہو کہ وہ اس حادثے کی ذمے دار ہے۔ مجھے یہ تو بتاؤ کہ تمہیں طیارہ اڑاتے ہوئے کتنے سال ہوگئے ہیں؟"

"دس سال۔"

"گڈ، تو تمہیں یہ تو معلوم ہوگا ہی کہ طیارے کے پینل پر ایک اشارہ ہوتا ہے۔ جو بتاتا ہے کہ طیارے کے پہیے کھلے یا نہیں کھلے۔ تم نے اشارہ دیکھا تھا؟"

"میں نہیں دیکھ سکا تھا۔" جیری کمزور لہجے میں بولا۔

"تو تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت تمہارا دھیان کس طرف تھا؟" جان نے ملامت سے پوچھا۔

"وہ۔ میں نینسی کو سمجھا رہا تھا۔" جیری پوری طرح بدحواس ہوچکا تھا۔

"ڈاکٹر تم گواہ رہنا اور ضرورت پڑنے پر عدالت کو بتانا۔ اس شخص نے استاد کے فرائض سے روگردانی کی اور اپنی اور میری بیوی کی جان خطرے میں ڈالی۔ جو کوڈ پینل کے تحت قابل سزا جرم ہے۔ کم از کم اس کا لائسنس تو ضبط ہو ہی جائے گا پھر اس نے بدزبانی کی اور میری بیوی کو گالی دی۔ اس پر مجھے ہتک عزت کا دعوا کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اب کیا خیال ہے مسٹر جیری؟"

"میں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔" جان نے مسکرا کر کہا۔ "بہ شرطیکہ نینسی چاہے۔"

نینسی نے فوراً" اسے معاف کردیا ورنہ اسے تو اپنی گلوخلاصی بھی مشکل نظر رہی تھی۔ اس نے جان بچنے پر خدا اور پھر جان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جس کا موڈ گھر آتے آتے خوف ناک حد تک خراب ہوگیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اسپتال سے کال آنے پر میری کیا حالت ہوئی تھی؟"

"مجھے کسی حد تک اندازہ ہے۔" نینسی نے اعتراف کیا "اس لیے میں نے فلائنگ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"اگلے روز جان اور بچوں نے ایک اور پارٹی دی۔ سب سے چھوٹے ٹونی نے ایک ڈرائنگ بنائی تھی۔ جس میں ایک عورت کو گھر آتے دکھایا گیا تھا اور نیچے لکھا تھا "واپسی مبارک ہو مام۔"

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نینسی کے دماغ سے ذات کے اظہار کا خناس نکل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی تقریباً" ہر ششماہی میں اسے دورے پڑتے رہے تھے۔ مثلاً "انٹیریئر ڈیکوریٹر بننے کا بھوت، وہ گالف کھیلنے لگی اور آخر میں اس نے فلاور میکنگ شروع کر دی۔ جان اور بچے اس شوق سے سب سے زیادہ عاجز تھے کیوں کہ نینسی پھولوں کے نام پر جو عبرت ناک اشیا تیار کرتی تھی۔ وہ نہ صرف وقتاً "فوقتاً" انہیں تحفے میں دیتی تھی بلکہ اس نے جان اور بچوں کے دوستوں کو بھی یہ پھول بانٹنے شروع کر دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ان کے گھر کا رخ کرتے ہوئے ہچکچانے لگے تھے۔

نینسی کا فلاور میکنگ کا اسکول خاصا دور تھا۔ اکثر نینسی کو ٹریفک جام کی وجہ سے دیر ہو جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جان اور بچوں کو ڈنر دیر سے ملنے لگا تھا۔ اس روز تو حد ہو گئی تھی۔ فریڈ کی وجہ سے نینسی کو گھر آتے آتے رات کے دس بج گئے تھے۔ جان اور بچے ابھی تک بھوکے بیٹھے تھے۔ وہ جلدی سے کچن میں گھسی۔ اس نے کباب نکال کر تلے۔ سینڈوچ بنائے۔ کھانا کھا کر ان لوگوں کا موڈ کچھ خوش گوار ہوا تو نینسی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ وہ دیر تک پڑے سوتے رہے پھر نینسی نے اٹھ کر ناشتا تیار کیا اور بچوں کو جگانے لگی۔ جان پہلے ہی اٹھ کر جاگنگ کے لیے جا چکا تھا۔ اس کی واپسی تک نینسی ناشتا لگا چکی تھی۔ ناشتے کے بعد بچے لان میں جا چکے تھے اور جان اخبار دیکھ رہا تھا۔ جب نینسی نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ جان سے پوچھا۔

"ڈیئر تمہارے خیال میں پرائیویٹ جاسوسی کا کام کیسا ہوتا ہے؟"

"اچھا ہوتا ہے۔" جان بے دھیانی سے بولا۔ "یہ شرط یہ کہ ہم وکیلوں کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائیں۔"

"یعنی اچھا ہوتا ہے۔ اب دیکھو ایک وکیل اور پرائیویٹ جاسوس مل کر کام کریں تو آسانی رہتی ہے۔"

اس دفعہ جان کی بھویں سکڑ گئیں "کس قسم کی آسانی اور تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

نینسی نے گویا اسے سمجھانا چاہا "دیکھو نا کسی وکیل کو کسی کیس میں خاص معلومات درکار ہوتی ہیں۔ سراغ رساں ان معلومات کو جمع کرنے میں وکیل کی مدد کر سکتا ہے۔"

"نینسی تم گھما پھرا کے بات کرنے کے بجائے اصل بات کہہ دو۔" جان نے ملائمت سے کہا۔

"وہ..." نینسی ہچکچائی "میں نے سراغ رساں بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں یاد ہے اسکول کے زمانے میں' میں نے ایک ڈی ٹیکٹو کورس کیا تھا۔"

یہ سنتے ہی جان پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے ہنسنے سے کچھ اس قسم کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے بطخوں کے تالاب میں کتا گھس آیا ہو اور تمام بطخیں بیک وقت چلا رہی ہوں۔

"جان۔" نینسی برہم ہو گئی "میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

جان نے بہ مشکل ہنسی پر قابو پایا "تم اور سراغ رساں یہ بات کسی لطیفے سے کم ہے" اس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"اچھا تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" جان نے نیم مزاحیہ لہجے میں کہا "ویسے یہ انوکھا خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟"

"تم جانتے ہو۔ میں نے اب تک اپنی ذات کے اظہار کے لیے..."

"میرے خدا' اس لفظ کی تکرار مت کرو۔ مجھے معلوم۔ مجھے معلوم ہے تمام احمقانہ خیالات کہیں نہ کہیں سے تمہارے ذہن میں آتے ہیں۔ یہ خیال کہاں سے آیا؟"

نینسی گویا سوچ میں پڑ گئی کہ جان کو اصل بات سے آگاہ کرنا کس حد تک مناسب ہوگا۔ اس نے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں ہے۔ آج کل فریڈ پرائیویٹ سراغ رساں بنا ہوا ہے۔ اس نے نیویارک کے مرکزی علاقے میں شاندار دفتر لے رکھا ہے اور اس کے ماتحت چار افراد کام کرتے ہیں مگر ان میں کوئی عورت نہیں ہے۔"

"لہٰذا وہ مردود چاہتا ہے کہ تم یہ کمی پوری کردو۔" جان کا موڈ یک دم بدل گیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے گزشتہ کئی سال سے نہ مسکرانے کی قسم کھا رکھی ہو۔

"فریڈ نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ میں ایک کامیاب سراغ رساں بننے کی پوری صلاحیت ہے۔" نینسی نے فخریہ انداز میں کہا۔ "اس نے مجھے اپنی ایجنسی میں پارٹنر بننے کی پیش کش کی ہے۔"

"پارٹنر۔" جان غرایا "بغیر مطلب کے وہ شخص اپنی ماں کو کفن بھی نہ دے۔"

"جان تم زیادتی کر رہے ہو۔ اب فریڈ اتنا برا بھی نہیں ہے۔"

"میرے خدا۔" جان نے سر پر ہاتھ مارا۔ "تم ایک دفعہ اس سے دھوکا کھا چکی ہو پھر بھی اس کی باتوں میں آرہی ہو۔"

"تم یقین کرو ڈیئر۔ وہ بالکل بدل چکا ہے۔ کل اس کا رویہ مجھ سے اتنا شریفانہ تھا کہ خود مجھے بھی یقین نہیں آیا دیکھو نا' اسکول لائف کی بات اور ہے لیکن جب انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو بالکل بدل جاتا ہے۔ فریڈ تو چہرے سے بھی شریف لگنے لگا ہے۔"

"لیکن اس کی فطرت نہیں بدل سکتی۔" جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں تمہیں اس کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"میں نے تم سے اجازت کب مانگی ہے۔" نینسی نے جارحانہ انداز میں کہا "جب تم آرنی کے ساتھ پارٹنر شپ کرنے جارہے تھے تو تم نے مجھ سے اجازت لی تھی۔"

"وہ دوسری بات تھی۔" جان کا انداز مدافعانہ تھا "تم فریڈ کا موازنہ آرنی سے مت کرو۔"

"کیوں نہ کروں۔ آرنی کون سا شریف آدمی ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے وہ مجرموں کی وکالت کرتا ہے۔"

"وہ تو میں بھی کرتا ہوں۔ تو کیا میں بھی بدمعاش ہوں؟" جان چراغ پا ہو کر بولا۔

"اگر آرنی شریف آدمی ہے تو فریڈ فرشتہ ہے۔ تم اس بات کو اپنے اوپر لانے کی کوشش مت کرو۔"

بچے ان کی آوازیں سن کر اندر آگئے تھے۔ پہلے ٹام نے مداخلت کی۔ "ٹام ڈیڈ' میرا خیال ہے آپ بچوں کی طرح لڑنے کے بجائے ذرا معقولیت کے ساتھ اور دلائل سے بات کریں تو بہتر رہے گا۔"

"ڈیڈ' ممی پہلے بھی تو بہت کچھ کرتی رہی ہیں آپ نے انہیں یوں نہیں روکا۔" جینی نے ماں کی حمایت کی' اس کا مطلب تھا کہ بچے ان دونوں کی ساری بات سن چکے تھے۔

"میرے خیال میں بچے درست کہہ رہے ہیں۔ ہمیں ذرا انسانیت کے جامے میں رہ کر بات کرنی چاہیے۔" نینسی نے کہا۔

"درست اور اس کے لیے سب سے مناسب مقام بیڈ روم ہے۔" جان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں بیڈ روم میں چلے گئے اور بچے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا خیال ہے مام سراغ بن سکتی ہیں؟" ٹام بولا۔

"بن تو سکتی ہیں لیکن چل نہیں سکتیں۔" جینی نے حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کیا۔

"گپ۔" ننھے ٹونی نے کہا "میں دس ایسی ٹی وی سیریز کے نام بتا سکتا ہوں جن میں خواتین سراغ رساں ہیں۔"

"ٹی وی اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔" جینی نے پھدرانہ انداز میں کہا۔

"بحث نہیں' بتاؤ کہ مام سراغ رساں بن کر کیسی لگیں گی۔" ٹام بولا۔

"ایسی ہی جیسی ہیں۔ میں نے کسی سراغ رساں کے سر پر سینگ نہیں دیکھے۔" ٹونی نے جینی کی نقل

کی۔ اسی وقت جان کے چلانے کے ساتھ ایک چھناکے کی آواز آئی۔ میرا خیال ہے ڈیڈ نے ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ۔۔۔۔" ٹونی کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیوں کہ اسی لمحے پھر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

جینی نے اظہار خیال کیا "یہ مما کا کرسٹل جیولری بکس ہے اور غالباً" ڈیڈ نے توڑا ہے۔"

اس کے بعد بھی تین چار بار توڑ پھوڑ کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ آخر ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور جان باہر آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب کہ نینسی مسکرا رہی تھی۔ جینی نے بہ غور انہیں دیکھا۔

"میرے خیال میں آپ دونوں میں کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے۔"

"ہاں سن۔ اگرچہ تمہارے ڈیڈ ایک تنگ نظر اور متعصب مرد ہیں لیکن مجھ سے محبت کرتے ہیں کیوں ڈیئر؟"

"ہوں۔" جان غرایا۔

نینسی نے بات جاری رکھی۔ "لہٰذا طے پایا ہے۔ آج جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے وہ تمہارے ڈیڈ کے اکاؤنٹ سے پوری ہوگی اور میں فریڈ ڈی ٹیکٹو ایجنسی میں کام کروں گی۔ لہٰذا آنے والے اتوار سے ہماری ذمے داریاں کچھ تبدیل ہوں گی۔ سوری بچوں اب میں تم لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی۔ امید ہے تم لوگ برا نہیں مناؤ گے۔ جان تو قطعی برا نہیں منائے گا۔ کیوں جان؟"

"ہوں۔" جان پھر غرایا۔

اگلا ایک ہفتہ جان پر خاصا بھاری گزرا تھا۔ نہ صرف نینسی اس کی مرضی کے بغیر فریڈ جیسے رقیب کے ساتھ کام کرنے جا رہی تھی بلکہ فریڈ بھی دوبارہ ان کے گھر آ چکا تھا اور تمام تر کوشش کے باوجود جان اسے خوش اخلاقی کا تاثر دینے میں ناکام رہا تھا۔ ہر بار وہ کام کا بہانہ کر کے اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو گیا تھا اور یہ کسی قدر سچ بھی تھا کیوں کہ ان دنوں وہ "شیرف" نامی مجرم کے مقدمے کی تیاری کر رہا تھا۔ شیرف بینک ڈکیتیوں کا ماہر تھا۔ درجن بھر ڈکیتیوں کے ساتھ اتنے ہی قتل بھی اس کے کھاتے میں تھے۔ پولیس خاصے عرصے سے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ ہر بار چکنی مچھلی کی طرح ان کے ہاتھ سے پھسل جاتا تھا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آخر ایک روز شیرف حسب معمول ڈکیتی کے بعد فرار ہو رہا تھا کہ شامت اعمال کچرا اٹھانے والے ٹرک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ شریف کی کار ٹرک سے جا ٹکرائی اور جب اسے اسپتال میں ہوش آیا تو وہ پولیس کی تحویل میں تھا۔ نینسی نے حیرانی سے جان سے کہا۔

"لیکن تمہارا اس کیس سے کیا تعلق۔ یہ کام تو ڈسٹرکٹ اٹارنی کا ہے۔"

"درست لیکن اس شیرف نے جس آخری شخص کو قتل کیا تھا' اس کے لواحقین اسے برقی کرسی یا کم از کم دو سو سال کے لیے جیل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہماری فرم کی خدمات حاصل کی ہیں۔" جان نے کہا۔



فریڈ کا دفتر تھا تو نیویارک کے مرکز میں ہی لیکن یہ علاقہ حلیے سے ہی خراب سا تاثر دیتا تھا۔ پرانی وضع کی شکستہ اور خستہ حال عمارتیں۔ گلیوں میں جا بہ جا بکھرا کچرا' گلیوں میں پھرتے بچوں کے غول جن میں اکثر سیاہ فام تھے اور شکل سے ہی بد معاش نظر آنے والے افراد جو ہر آنے جانے والے کو یوں گھورتے تھے جیسے ابھی اسے پھاڑ کھائیں گے۔ پہلے تو نینسی اس علاقے میں آ کر ہی پریشان ہوئی تھی۔ اس پر وہ فریڈ کے' شاندار دفتر کو بھی تلاش کرنے میں ناکام رہی۔ تنگ آ کر اس نے ایک دیو قامت سیاہ فام سے رجوع کیا۔ جس کے ایک ہاتھ میں بیئر کاٹن تھا اور دوسرا ہاتھ سے اس نے پتے والے کاغذ کو کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بولا "شراب نہ ملنے کے باعث میرا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ تمہارے پاس دس ڈالر ہوں گے؟"

"نہیں۔" نینسی نے اس سے کاغذ چھین لیا۔ اس کے بعد ایک بجے' ایک معمر خاتون اور ایک پولیس والے نے اس کی مدد کی تو وہ فریڈ کے دفتر پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ جو ایک سال خوردہ عمارت کی چوتھی منزل پر تھا اور عمارت میں لفٹ بھی نہیں تھی۔ پانچ درجن سیڑھیاں چڑھ کر نینسی کا حال برا ہو گیا تھا اور اس نے سراغ رساں بننے کے ارادے پر تھوڑا بہت پچھتانا شروع کر دیا تھا۔ بہ قول فریڈ کے اس کا شاندار دفتر دو کمروں کا ایک فلیٹ ثابت ہوا جس کے پر دروازے فریڈ نے اپنے بدخط میں 'پرائیویٹ ڈی ٹیکٹو' لکھ رکھا تھا۔ ایک کمرے میں دو افراد یوں پڑے سو رہے تھے جیسے اب قیامت آنے پر ہی اٹھیں گے۔ دوسرے کمرے میں فریڈ کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا۔ جابہ جا کچرا اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر بیئر کی خالی بوتلیں اور برگر کے لفافے پڑے تھے۔ فرنیچر شاید ایک صدی پہلے بنا تھا۔

"خدا کی پناہ فریڈ یہ ہے تمہارا دفتر۔" نینسی نے بے یقینی سے کہا۔ "جس کی تم اتنی تعریف کر رہے تھے۔ تم نے جھوٹ بولنا اب تک نہیں چھوڑا اور یہ دونوں کون ہیں؟"

"میرے ماتحت۔" فریڈ نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی غلط بیانی پر قطعی شرمندگی نہیں تھی۔ "دونوں رات بھر ایک کیس پر کام کرتے رہے تھے۔ صبح تھکے ہارے آئے اور مجھے رپورٹ دے کر سو گئے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ وہ کیس کسی بار میں تھا۔" نینسی نے طنز کیا۔ کا پچھتاوا بڑھنے لگا تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت ہے کہ اپنا پرسکون گھر محبت کرنے والا شوہر اور بچے چھوڑ کر اس اجاڑ جگہ آ بیٹھے مگر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ وہ جان سے جھگڑے کے دوران میں دعوا کر چکی تھی کہ وہ اسے سراغ رساں بن کر دکھائے گی اور پھر آج کل پورا سچ کون بولتا ہے۔ اگر فریڈ نے بھی تھوڑا سا جھوٹ بول دیا تو کیا برا کیا۔ لوگ تو اس سے بھی بڑے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ بہرحال پرائیویٹ جاسوس تھا۔ نینسی نے اس کا لائسنس دیکھا تھا۔ اس کے باوجود اسے یہ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ اسے روز اس علاقے میں آنا پڑے گا اور اس دفتر میں بیٹھنا پڑے گا۔ وہ ہمیشہ سے نیویارک کے پرسکون نواحی علاقوں میں رہتی آئی تھی اور اس قسم کے علاقے اس نے آج سے پہلے صرف فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں ہی دیکھے تھے۔

نینسی ایک کرسی صاف کر کے بیٹھ گئی۔ "پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کسی اچھے علاقے میں دفتر نہیں لے سکتے۔"

"اچھے علاقوں میں دفتروں کے کرائے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ البتہ میرا ارادہ ہے کہ کچھ عرصے بعد براڈوے کے علاقے میں کوئی دفتر لے لوں۔ وہاں سراغ رسانوں کو خوب کام ملتا ہے۔"

نینسی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "کچھ عرصے میں تمہارے حالات میں ایسی کون سی تبدیلی آجائے گی۔"

"پہلی بہتری تو یہ آئی ہے کہ تم جیسی خوب صورت اور ذہین عورت میرے ساتھ کام کرے گی' دوسرے جلد مجھے ایک اچھا کیس ملنے والا ہے اس کی فیس سے ہم کوئی اچھا دفتر لے سکیں گے۔"

ہر عورت کی طرح تعریف نینسی کی کمزوری بھی تھی۔ اس کا پچھتاوا ختم ہو گیا اور وہ پہلے کی طرح پرجوش ہو گئی۔

"کیسا کیس' مجھے بھی بتاؤ اور یہ بھی کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"کام بڑا معمولی سا ہے اور اصل کام بھی تم نے ہی کرنا ہے۔ اس کے بعد تم دیکھنا ہماری ایجنسی پر لوگ کیسی بارش کی طرح برسیں گے۔"

"مائی گاڈ۔" نینسی پرجوش ہونے لگی۔ "لیکن تم نے کیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔ سنو کیا ہم کیس کے بارے میں میڈیا کو بتا سکیں گے۔ ذرا سوچو ایک ہی دن میں ہم کتنے مشہور ہو جائیں گے۔"

فریڈ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو اس کے بعد تو لوگ ہمارے پاس کبھی نہیں پھٹکیں گے' سراغ رسانی بالکل مختلف بزنس ہے۔ اس میں پبلسٹی خطرناک بھی

ثابت ہو سکتی ہے۔"

"اچھا۔" نینسی کو مایوسی ہوئی "میں نے تو کچھ اور بھی سوچا تھا۔"

"اسے فوراً ذہن سے نکال دو۔" فریڈ جلدی سے بولا۔ "ہمارے پیشے میں رازداری کی بنیادی اہمیت ہے۔ اچھا سراغ رساں وہی ہوتا ہے جو راز رکھ سکے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" نینسی بولی "اب ذرا کیس کے بارے میں بتاؤ۔"

"ہمیں ایک شخص کو نیویارک سے باہر پہنچانا ہے۔"

نینسی کا جوش و خروش دھیما پڑنے لگا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں ایک شخص کو شہر سے باہر لے جانا ہے۔"

"ہاں اتفاق سے میرا یہی مطلب ہے۔" فریڈ نے ایک گھٹیا سا سگار سلگا کر کہا۔

"کیا حماقت ہے۔ نیویارک سے باہر جانا کون سا مشکل کام ہے۔ خشکی، سمندر اور ہوائی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ شخص کسی بھی طریقے سے باہر جا سکتا ہے۔"

"نینسی خدا کے لیے ذرا عقل سے کام لو۔ آخر تم سراغ رسانی کا کورس کر چکی ہو اور سراغ رساں بننے آئی ہو۔ اگر وہ شخص ایسا نہیں کر رہا تو اس کی کوئی وجہ ہو گی۔ وہ کچھ لوگوں سے چھپ کر نیویارک سے باہر جانا چاہتا ہے اور اس نے اسی لیے ہماری خدمات حاصل کی ہیں۔"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔" نینسی نے اعتراف کیا۔ "بہرحال تم بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"اصل کام تم نے ہی کرنا ہے۔ اسے شہر کی حدود سے باہر چھوڑ کر آنا ہے پھر وہ جانے اور اس کا کام۔"

"اور یہ کام کب کرنا ہے؟"

"اسی ہفتے کے اندر۔ تم بارہ گھنٹے کے نوٹس پر تیار رہنا۔"

"اور یہ کام ہو گا کیسے؟"

فریڈ اس کے سوالوں سے عاجز سا نظر آنے لگا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "تم ایک چھوٹا طیارہ چارٹر کراؤ گی۔ نیویارک سے ملوائی کے لیے۔ طیارہ چار نشستوں والا ہو اور تم تین افراد کے نام لکھواؤ گی۔ جو سب فرضی ہوں گے۔ تم یہ کام کر کے مجھے مطلع کرو گی اور میں عین موقع پر لے کر اسے ائرفیلڈ پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد ہم طیارے کو راستے میں کسی ویران ائرفیلڈ پر اتار دیں گے۔"

"اور پائلٹ کو کیسے راضی کرو گے۔" نینسی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ بعد کا کام ہے۔" فریڈ متانت سے بولا "تم اس کی فکر مت کرو۔ صرف اپنے کام کی طرف توجہ دو۔"

مگر نینسی مزید غور و فکر کے موڈ میں تھی۔ "یہ آسان سا کام تو تم خود بھی کر سکتے تھے۔"

فریڈ نے دانت پیسے "تب پھر تمہیں پارٹنر بنانے کا فائدہ۔ جب سب میں خود ہی کر لوں گا۔"

"اوکے۔ اوکے۔" نینسی جلدی سے بولی "میں یہ کر ہی لوں گی لیکن یہ سب مجھے عجیب سا....."

"دیکھو نینسی ڈیئر۔ میں نے کہا نا ہمارے پیشے میں سب سے زیادہ اہمیت رازداری کی ہوتی ہے۔ دوسرے ہمیں صرف اپنے کلائنٹ کے کام سے غرض ہونی چاہیے۔ اس سے نہیں کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے لوگ ہمیں معاوضہ ہی کام کرنے کا دیتے ہیں اور ایسے کلائنٹ تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ لہٰذا غیر ضروری تجسس اور سوالات سے پرہیز کرو۔ میں خود بھی اتنا ہی جانتا ہوں۔"

اگرچہ نینسی نے فریڈ کی بات کا یقین نہیں تھا لیکن اس نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلایا۔ فریڈ نے بات جاری رکھی۔ "جب کوئی بات چھپانی ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے سب سے چھپانا۔ اپنے نزدیک ترین عزیزوں سے بھی، مجھے یقین ہے تم جان کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ مجھ سے وعدہ کرو۔"

نینسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے آج تک جان سے جھوٹ نہیں بولا اور یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ چھپایا

جاسکتا۔ اگر وہ نہیں بتاتی تو جان شک میں پڑ جاتا اور فی الوقت وہ اسے مزید ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

"اوکے میں جان کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"ویری گڈ۔" فریڈ خوش ہو گیا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں جان کے خلاف اکسا رہا ہوں۔ بس سمجھ لو یہ ایک طرح سے تمہارا امتحان ہے۔ اب تم گھر جاؤ اور میری کال کا انتظار کرو۔ فی الوقت تمہیں دفتر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تمہارے کرنے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری صلاحیتوں کو صحیح جگہ استعمال کروں۔"

نینسی نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا تھا کہ ابھی اسے دفتر نہیں آنا تھا اور اسے امید تھی کہ جب وہ باقاعدگی سے دفتر میں بیٹھنا شروع کرے گی تو فریڈ اس وقت دفتر کسی ڈھنگ کی جگہ منتقل کر چکا ہو گا۔

جان اور بچے پریشان اور کسی قدر حیران تھے۔ خاص طور سے اس بات پر کہ نینسی اچانک گھر کیوں بیٹھ گئی تھی ان کے سوالوں کے جواب میں وہ ذرا گول مول سے انداز میں اتنا ہی کہتی تھی۔ "دراصل کوئی خاص کام نہیں ہے۔ اس لیے میں گھر میں ہوں۔"

جان نے صدقِ دل سے دعا مانگی کہ یہ خاص کام کبھی نہ نکلے اور نینسی گھر میں رہے حتیٰ کہ اپنی افتادِ طبیعت کے ہاتھوں اس کام سے بھی بور ہو جائے۔ وہ ان دنوں تندہی سے شیرف کے مقدمے کی تیاری میں لگا ہوا تھا پولیس عنقریب اسے عدالت میں پیش کرنے والی تھی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اور جان کی کوشش تھی کہ اس کی ضمانت کے تھوڑے سے خدشات بھی باقی نہ رہیں۔ وہ خبیث اس سے پہلے بھی دو بار ضمانت پر رہا ہونے کے بعد بھاگ چکا تھا۔ شہر میں افواہ گرم تھی کہ مافیا والے شیرف کو بہر صورت پولیس کے چنگل سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے بعد پولیس یوں شیرف کی حفاظت کر رہی تھی۔ جیسے مرغی چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کے باوجود حالات کی سنگینی کم نہیں ہوئی تھی۔ شہری صورت حال میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ گلی کوچوں' بازار اور ریستورانوں میں بحث چل رہی تھی کہ پولیس شیرف کو عدالت میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گی یا نہیں۔ حتیٰ کہ بک میکر لوگوں سے شرطیں بھی لگا رہے تھے۔ گویا ان دنوں شہر کا موضوع ہی شیرف تھا۔

یہ خبر بھی گشت کر رہی تھی کہ شیرف کے پاس مافیا والوں کے کچھ ایسے راز تھے۔ جو اگر افشا ہو جاتے تو مافیا کی آدھی قیادت جیل میں نظر آتی' شیرف نے مافیا کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر اسے صحیح سلامت پولیس کی تحویل سے نہیں نکالا گیا تو برقی کرسی یا جیل وہ اکیلا نہیں جائے گا بلکہ مافیا کے اکثر سرکردہ اس کے ہم نشین ہوں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد مافیا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ شیرف کو بہر صورت پولیس کی تحویل سے نکال لے۔ آسان کام تو یہ تھا کہ وہ اسے مروا دیتے لیکن اس صورت میں بھی ان کے راز پولیس تک پہنچ جاتے کیوں کہ شیرف نے وہ راز کسی اور شخص کی تحویل میں دے رکھے تھے۔

ان افواہوں نے جان کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ اگر شیرف فرار ہو جاتا یا پولیس کی تحویل میں مارا جاتا تو یہ ایک طرح سے اس کی ناکامی ہوتی جب کہ اس کیس میں کامیابی کا اتنا یقین تھا' جیسے نینسی کے اپنے بیوی ہونے کا یقین تھا۔ اگر کوئی غیر متوقع بات ہو جاتی تو کیس اس کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح نکل جاتا۔

جس روز شیرف کو عدالت میں پیش کیا جانا تھا اس روز جان صبح سے خاصی ٹینشن میں تھا۔ صرف جان کیا خاصے لوگ پریشان تھے۔ ان میں پولیس والے سرفہرست تھے۔

پولیس کا ایک پورا دستہ شیرف کو لے کر جلوس کی صورت میں سٹی کورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ حفاظتی انتظامات بے حد سخت تھے اور شہر کا پولیس چیف خود ہیلی کاپٹر میں فضا سے پولیس قافلے کی نگرانی کر رہا تھا لیکن کرنے والوں نے یہ کارروائی زمین کے نیچے سے شروع کی' ایک تنگ گلی میں اچانک بم کے دھماکے

ہوئے اور بد حواسی میں کاریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر رک گئیں۔ پولیس والے کھانس کھانس کر بے حال ہوئے جارہے تھے۔ جب گلی میں مین ہولز کے ڈھکن کھلے اور ان سے نقاب پوش برآمد ہونے لگے۔ انہوں نے بکتر بند سے نیم بے ہوش شیرف کو نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے واپس مین ہول میں غائب ہوگئے۔ جب تک پولیس والوں کے ہوش بجا ہوتے اور وہ مین ہول میں اتر کر ان کا تعاقب کرتے شیرف کو لے جانے والے کہیں کے کہیں نکل چکے تھے۔

نینسی بچوں کے اسکول اور جان کے دفتر جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی کہ فریڈ کا فون آگیا۔

"ہیلو ڈیئر۔ تم تیار ہونا۔"

"کس لیے؟" نینسی نے بے دھیانی میں انڈا پھینٹتے ہوئے کہا۔

فریڈ نے دانت پیسے "میں نے تم سے کیا کہا تھا۔"

"اوہ اچھا اچھا مجھے یاد آگیا۔ میں طیارہ کب تک چارٹر کراؤں۔"

"جلد از جلد۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔" فریڈ نے فون بند کردیا۔

جن دنوں نینسی پر پرواز سیکھنے کا خبط سوار ہوا تھا۔ ان ہی دنوں اس کی اکثر فلائنگ ایجنٹوں سے ملاقات ہوتی تھی۔ اس نے ایک فلائنگ ایجنٹ کا نمبر ملا کر اسے چار نشستوں والا بائی پلین نیویارک سے ملوائی کے لیے چارٹر کرانے کو کہا۔ اس نے اپنا نام ڈائماڈ لکن بتایا۔ اسی طرح دیگر دو نام بھی فرضی بتائے۔ پائلٹ کے ساتھ چارٹر کیے جانے والے طیارے کے ایجنٹ کو ان کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہاں وہ صرف طیارہ مانگتی تو وہ اس کا شجرہ نسب جاننے پر تل جاتا۔ یہ کام کرتے ہوئے نینسی نے سنسنی محسوس کی۔ وہ سچ مچ خود کو سراغ رساں سمجھنے لگی تھی۔ حالانکہ اس کام میں سراغ رسانی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"طیارہ اور پائلٹ ائیر فیلڈ پر شام چھ بجے تیار ملے گا۔" ایجنٹ نے کہا "لیکن ادائیگی۔"

"وہ میں نقد کروں گی۔" نینسی نے جلدی سے کہا کیوں کہ اسے فریڈ نے یہی کہا تھا۔

شام چھ بجے کا مطلب تھا کہ وہ جان کے آنے سے پہلے گھر سے نکل جاتی ورنہ اسے خاصے سوالوں کے جواب دینے پڑتے بچوں کو مطمئن کیا جاسکتا تھا۔ اس نے فوراً فریڈ کو فون کیا اور اسے بتایا کہ طیارہ چارٹر ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے اور ان دونوں کے فرضی نام بھی بتادیئے۔

"یہ کیا نا تم نے سراغ رسانوں والا کام۔" فریڈ خوش ہوکر بولا "اب تم دیکھنا ہم کتنی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔"

"اوکے۔" نینسی بولی "میں ائیر فیلڈ پر تمہارا انتظار کروں گی۔"

نینسی اچھے خاصے سرد موسم میں ائر فیلڈ پر ٹہل رہی تھی۔ پائلٹ طیارے سے ٹیک لگائے کھڑا اس کی برہمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چھ بج چکے تھے اور ان دونوں کا اب تک کوئی پتا نہیں تھا خدا خدا کر کے فریڈ کی کار ائر فیلڈ کی پارکنگ میں رکتی نظر آئی اور اس میں سے فریڈ کے ساتھ جو شخص نکلا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی ریچھ کو پتلون اور جیکٹ پہنادی گئی ہو۔ گھنے بالوں اور داڑھی کی اوٹ سے بہ مشکل اس کی ناک اور آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" نینسی ان کی طرف لپکی "اور یہ کون ہے؟"

"غوں۔" اس شخص نے ریچھ کی سی آواز نکالی۔

"یہ مسٹر ہرمن بیکر ہیں۔" فریڈ نے مسکرا کر وہی فرضی نام بتایا جو نینسی نے ائر ایجنٹ کو لکھوایا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ فریڈ اسے اس شخص کے اصل نام سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ دانت پیس کر بولی۔

"دیر مت کرو۔ ہمیں واپس بھی آنا ہے۔"

"غوں۔" ریچھ نے اس دفعہ غصیلی نظروں سے فریڈ کی طرف دیکھا۔

فریڈ نے اس کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیا اشارہ کیا۔ وہ ٹھنڈا پڑگیا ورنہ وہ فریڈ کی گردن دبوچنے والا تھا۔

وہ طیارے کی طرف آئے۔ پائلٹ نے ان سے کچھ کاغذات سائن کرائے۔ جو انہوں نے اپنے فرضی نام کے تحت سائن کردیے۔ پائلٹ نے کاغذات لے کر جاکر دفتر میں جمع کرائے اور واپس آکر طیارے کا انجن چلایا۔ وہ پہلے ہی طیارے میں بیٹھ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد طیارہ پرواز کرچکا تھا۔ پائلٹ نے کنٹرول ٹاور سے ضروری بات چیت کے بعد جیسے ہی ریڈیو بند کیا' فریڈ کے ساتھ آئے ریچھ نے اپنی جیب سے اپنے جیسا ایک بدصورت پستول نکال کر پائلٹ کے سر سے لگا دیا۔

"طیارے کو نیچے لے چلو۔" ریچھ نے پہلی بار انسانی آواز نکالی تھی "دو ہزار فٹ سے کم بلندی پر....."

"یہ.... یہ کیا ہے؟" پائلٹ نے اپنے برابر میں بیٹھی نینسی سے دریافت کیا۔ جو دم بخود سی بیٹھی تھی۔

اس نے فریڈ سے یہی سوال کیا تو اس نے اطمینان سے کہا "تمہیں سب معلوم ہوجائے گا ڈیئر اور مسٹر جیسا تم سے کہا گیا ہے ویسا ہی کرو۔ یہ شخص بہت خطرناک ہے۔ گولی پہلے مارتا ہے سوچتا بعد میں ہے۔"

"دیکھو۔ یہ کام ہائی جیکنگ ہے۔ اس کی سزا....."

"مجھے معلوم ہے۔" ریچھ غرایا "اگر تم نے اگلے ایک منٹ کے اندر میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو میں تمہیں باہر پھینک دوں گا۔ طیارہ میں خود بھی اڑا سکتا ہوں۔"

پائلٹ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے پھرتی سے ریچھ کے حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دیر بعد طیارہ دو ہزار فٹ سے کم بلندی پر اڑ رہا تھا۔ یوں طیارہ کسی بھی ریڈار کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اس کے بعد پائلٹ نے ریچھ کے حکم پر طیارے کے تمام ٹرانسپونڈر بند کردیے اور طیارے کا رخ فلوریڈا کی طرف موڑ دیا۔

"طیارے میں اتنا ایندھن نہیں ہے کہ ہم فلوریڈا جاسکیں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں اس سے پہلے ہی ایک غیر آباد رن وے پر اترنا ہوگا۔" فریڈ بولا۔

"تم.... تم نے مجھے پھر دھوکا دیا۔" نینسی نے رو

چٹکلے

بیٹا درسی کتب ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ "کیا مصیبت ہے۔ یہ ورڈز ورتھ تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔"

والد صاحب نے عینک کے اوپر سے بیٹے کو جھانکا' کچھ دیر ڈکشنری کا مطالعہ کیا اور پھر بولے۔ "بیٹے۔ مجھ سے ورڈز ورتھ کے معنی پوچھو۔ اس کے معنی ہیں بات کے قابل۔ مثلاً تمہاری امی مجھے اکثر کہتی ہیں کہ۔ "تم کسی بات کے قابل نہیں۔" انگریزی میں اس جملے کو یوں لکھیں گے۔ "یو آر ناٹ اے ورڈز ورتھ۔"

☆

شیخ چلی کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ رمضان المبارک میں انہوں نے روزوں کی تعداد یاد رکھنے کے لیے ایک ترکیب ایجاد کی۔ وہ افطار کے بعد کھجور کی ایک گٹھلی ایک گھڑے میں ڈال دیتے یوں ایک روزہ ہو جاتا۔ شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی نے جب اپنے والد کو گھڑے میں گٹھلیاں ڈالتے دیکھا تو وہ بھی اپنی گٹھلیاں اسی گھڑے میں ڈالنے لگی۔

عید کے بعد لوگوں نے شیخ چلی سے پوچھا۔ "آپ نے کتنے روزے رکھے۔"

شیخ صاحب نے کہا۔ "الحمدللہ! ساٹھ پورے ہوگئے۔"

لوگوں نے کہا۔ "مہینہ تو انتیس دن کا تھا۔ آپ نے ساٹھ روزے کیسے رکھ لیے۔"

کہنے لگے۔ "میں نے تو ابھی آدھے بتائے ہیں۔ گھڑے کے حساب سے تو میں نے ایک سو بیس روزے رکھے ہیں۔"



دینے والے انداز میں کہا ”جان ٹھیک کہتا تھا۔“
”چچ۔۔۔ چچ۔۔۔ اتنی جلدی حوصلہ ہار گئیں۔ تمہیں تو میں بہت بہادر سمجھتا تھا۔“ فریڈ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

نینسی کا خوف سے برا حال تھا اور وہ دل ہی دل میں خدا سے دعا کررہی تھی کہ وہ اس معاملے سے بچ نکلی تو آئندہ بھول کر بھی اس قسم کے کسی کام میں ٹانگ نہیں پھنسائے گی۔ جان اور بچوں کے تصور سے اسے رونا آرہا تھا۔ اسے شاید دوبارہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہو۔ طیارہ ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ایک ویران ایئر فیلڈ پر اترا تھا جو نیویارک سے تقریباً ڈیڑھ سو میل شمال میں تھا۔ رات ہوچکی تھی لیکن رن وے کے ساتھ ہی واقع ہائی وے کی روشنیوں میں رن وے کی لکیر صاف نظر آرہی تھی۔
”طیارہ یہاں اتار لو۔“
”یہاں!“ پائلٹ دم بخود رہ گیا۔ ”اس ایئر فیلڈ پر جس کی ایک روشنی نہیں جل رہی ہے۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو۔ میری ابھی شادی ہوئی ہے۔“
”طیارہ اتارو۔ ورنہ تمہاری بیوی ضرور بیوہ ہوجائے گی۔“ ریچھ نے خطرناک لہجے میں کہا تھا۔
بادل ناخواستہ پائلٹ نے اس تاریک رن وے پر طیارہ اتار لیا اور دعا کرتا رہا کہ رن وے صاف ہی ہو۔ اس پر کچھ پڑا نہ ہو۔ خاصی کوشش کے بعد اس نے طیارہ قبل از وقت ہی روک لیا تھا۔
”نیچے اترو۔“ ریچھ نے پستول لہرا کر حکم دیا۔
نیچے اتر کر نینسی اور پائلٹ ساتھ ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اور ریچھ اور فریڈ یوں اطمینان سے سگریٹ پینے لگے جیسے انہوں نے اسی مقصد کے لیے اتنی تگ و دو کی تھی۔ غالباً انہیں کسی کا انتظار تھا۔
”یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟“ نینسی نے سرگوشی میں پائلٹ سے پوچھا۔
”مجھے کیا معلوم۔“ پائلٹ نے بھنا کر کہا ”ان مصیبتوں کو تم ہی لائی تھیں۔“

نینسی کا شرمندگی سے برا حال ہوگیا اور وہ فریڈ پر الٹ پڑی تھی۔ اسے دل بھر کر برا بھلا کہنے کے بعد نینسی نے دھمکی دی۔ ”تمہیں جیل جانا پڑے گا۔“
فریڈ اور ریچھ نے یوں قہقہہ لگایا جیسے نینسی نے کوئی لطیفہ سنایا ہو ”مائی ڈیئر نینسی!“ فریڈ نے استہزائیہ انداز میں کہا ”میں یہاں رہوں گا تو تم مجھے جیل بھجواؤگی اور ویسے بھی تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے ہی تم سے کہا تھا۔ یہ طیارہ تم نے ہی چارٹر کیا تھا۔ مجھے کوئی نہیں جانتا۔“
”احمق ہو تم۔ یہ پائلٹ سب بتائے گا۔ کیوں تم بعد میں گواہی دوگے ناں؟“
”میں۔۔۔“ پائلٹ گڑبڑا گیا۔ وہ ایسے مجرم کے سامنے کیونکر کہہ سکتا تھا کہ وہ بعد میں اس کے خلاف گواہی دے گا۔ جس نے اسے پستول کے بل پر طیارے سمیت اغوا کیا تھا اور اب بھی اس کے سامنے پستول لیے موجود تھا۔ ”میں۔۔۔ میں۔ کس بات کی گواہی دوں گا۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔
فریڈ اور ریچھ نے ایک اور بلند قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے فضا میں کسی دوسرے طیارے کی آواز گونجی اور کچھ دیر بعد ایک چھوٹا سا وائی کنگ ان کے سامنے رن وے پر اتر گیا اور ٹیکسی کرتا ان کی طرف آنے لگا اسی لیے ہائی وے کی طرف سے پولیس سائرن گونجنے کی آواز آئی اور درجن بھر پولیس کاریں نہایت تیزی سے رن وے کی طرف آنے لگیں۔
”میرے خدا!“ فریڈ کے منہ سے نکلا۔
”خدا کو بعد میں یاد کرنا۔“ ریچھ نے اس کی جیکٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا اور پھر دونوں تیزی سے آنے والے طیارے کی طرف دوڑے۔ پائلٹ نے اضطراری طور پر چند قدم ان کی طرف بڑھائے تھے لیکن ریچھ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی جگہ منجمد سا ہوگیا اور جب اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ ریچھ نے فائر کیا تو نینسی سمجھی کہ اس نے پائلٹ کو گولی ماردی اور اب اس کی باری ہے۔ اپنی وفات کے تصور سے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی

لیکن ریچھ نے ایک فائر مناسب سمجھا اور دوبارہ طیارے کی طرف لپکا۔ نینسی منہ پر ہاتھ رکھے چیخے جارہی تھی اور اب پولیس سائرن کی آواز چاروں طرف سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ معاً" کسی نے اسے جھنجوڑا۔

"خدا کے لیے تم تو چپ ہوجاؤ۔" یہ پائلٹ تھا جو زندہ سلامت نظر آرہا تھا۔ "وہ خبیث جاتے ہوئے میرے طیارے کا ٹائر پھاڑ گیا ہے۔"

ظاہر ہے اس کا مقصد ان کو تعاقب سے روکنا تھا۔ پولیس کاریں رن وے پر آچکی تھیں اور اب وائی کنگ کی طرف جارہی تھیں۔ دو کاریں ان کے پاس آکر رکیں اور پولیس والوں نے مخصوص انداز میں پوزیشن لے کر انھیں ہاتھ اوپر کرنے اور ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ہاتھ اوپر کرلیا، لیکن ان کے پاس کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں جسے وہ پھینکتے۔ سیکنڈوں میں پولیس نے ان کی تلاشی لے کر انہیں ہتھکڑیاں پہنادیں۔

"تم لوگ احمق ہو۔" نینسی نے برہمی سے کہا "اصل مجرم وہ ہیں کے سامنے فرار ہورہے ہیں۔"

"شٹ اپ میڈم۔ وہ فرار نہیں ہوسکتے۔" پولیس لیفٹیننٹ نے اسے جھڑک دیا۔

اس کی بات درست نکلی تھی۔ ایک پولیس کار برق رفتاری سے وائی کنگ سے آگے نکل گئی اور عین اس وقت اس کا راستہ روک لیا جب وہ اڑنے کے لیے پرتول رہا تھا تصادم سے بچانے کے لیے پائلٹ نے طیارے کو دائیں طرف گھمادیا اور طیارہ رن وے سے اتر کر کچے میں دوڑنے لگا۔ بدقسمتی سے وہاں چوہوں نے بل بنا رکھے تھے اور ایسے ہی کسی بل کے منہ پر طیارے کا ایک پہیا گیا۔ طیارے نے زبردست جھٹکا لیا اور الٹ گیا۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ طیارے کی رفتار کم ہونے کی وجہ سے معاملہ صرف ٹوٹ پھوٹ پر ٹل گیا۔ طیارے میں فریڈ اور ریچھ کے علاوہ صرف پائلٹ ہی تھا اور وہی سب سے کم نقصان میں رہا کیونکہ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ فریڈ اور

مسکرائیے

ہالی ووڈ کے قریب ایک گلی کے کونے پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو۔"

"میں اپنی دوست کا انتظار کررہا ہوں۔" دوسرے کتے نے جواب دیا۔

"کیسی ہے وہ" پہلے کتے نے تجسس سے پوچھا۔

"سفید رنگ کی ہے، دو فٹ لمبی ہے، دم چھوٹی ہے، لیڈی کہہ کے آواز دو تو متوجہ ہوجاتی ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"اچھا..... اچھا، اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبا ہے، اور ذرا لنگڑا کر چلتی ہے۔" پہلے کتے نے مزید نشانیاں بتائیں۔

"ہاں..... ہاں وہی" دوسرے نے تائید کی۔

"میں تو خود اسی کا انتظار کررہا ہوں۔" پہلا کتا بولا۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

"کیا زمانہ آگیا ہے..... ہماری مادائیں بھی ہالی ووڈ کی عورتیں ہوتی جارہی ہیں۔"

☆

شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی میں پہلا جھگڑا ہوا۔ غصے سے بے قابو ہوکر شوہر نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا پہلا گھونسا رسید کیا۔

اتفاق سے پادری صاحب وہاں سے گزر رہے تھے، انہوں نے کھڑکی سے گھونسا پڑتے دیکھا تو فوراً دوڑے بیچ بچاؤ کے لیے۔

شوہر نے دیکھا کہ پادری صاحب گھر میں آگئے ہیں تو سنبھل کر اس نے بیوی کی پیٹھ پر ازدواجی زندگی کا گھونسا نمبر دو رسید کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

"اب بھی چرچ جانے سے انکار کرو گی۔"

☆☆

ریچھ کو اس کا موقع نہیں ملا تھا لہٰذا وہ خاصے زیر و زبر ہوئے اور جب پولیس نے انہیں طیارے سے برآمد کیا تو ریچھ اپنے آگے کے چار دانتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کی دائیں کہنی اور بایاں ٹخنہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ فریڈ کا حال اس سے بھی برا تھا۔ اس کی چھ پسلیاں اور ہنسلی کی ہڈی کے علاوہ ناک کا بانسا بھی ٹوٹ گیا تھا اور طیارے سے نکالے جانے پر وہ مضحکہ خیز آواز میں روتا ہوا ریچھ کو گالیاں دے رہا تھا اور مزے کی بات تھی کہ وہ اسے شیرف کہہ رہا تھا۔

نینسی دور سے یہ سب دیکھ کر خوش ہو رہی تھی جب ایک کار جھٹکے سے آکر اس کے نزدیک رکی اور اس میں سے جان برآمد ہوا۔ ''جان۔'' نینسی نے چلا کر کہا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کے ساتھ وہ اس سے معافی بھی مانگ رہی تھی۔ پولیس والے یہ منظر خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جان نے نینسی کو خود سے الگ کیا۔

''یہ کام تم گھر چل کر کرنا۔'' اور پولیس لیفٹیننٹ سے مخاطب ہوا۔ ''وہ خبیث کہاں ہے۔ میری مراد شیرف سے ہے۔''

''وہ رہا۔'' لیفٹیننٹ نے دور زمین پر پڑے افراد کی طرف اشارہ کیا۔

نینسی دم بخود رہ گئی تھی۔ ''وہ شیرف ہے۔'' اس نے چلا کر کہا ''وہی قاتل...''

''جی خاتون' جسے آپ فرار میں مدد دے رہی تھیں۔'' لیفٹیننٹ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا یہ شیرف ہے۔'' نینسی پھر چلائی۔ ''یہ ساری فریڈ کی کمینگی ہے۔''

''یہ فریڈ کون ہے؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''وہ جو وہاں زمین پر پڑا ہے۔ کاش کہ وہ زمین کے نیچے ہوتا۔''

''خدا کرے۔'' جان بولا ''لیفٹیننٹ میری بیوی نادانستگی میں اس غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔''

''غلطی نہیں یہ جرم ہے۔'' لیفٹیننٹ نے تصحیح کی ''جب ہم تفتیش کریں گے تو سب پتا چل جائے گا۔''

''تفتیش۔'' نینسی خوف زدہ لہجے میں بولی ''تم مجھے گرفتار کرو گے؟''

''دیکھیے خاتون' شیرف کی گرفتاری آپ کے شوہر کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔ اگر یہ آپ کی ضمانت دیں تو میں آپ کو گرفتار نہیں کروں گا۔''

''جان خدا کے لیے۔'' نینسی گھگیائی ''تم میری ضمانت دے رہے ہو نا؟''

''وہ کس خوشی میں۔ تاکہ تم کل پھر ''ذات کے اظہار'' کے چکر میں کسی اور مصیبت میں پھنس جاؤ۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔ آئندہ اس قسم کا کوئی خیال بھی ذہن میں نہیں لاؤں گی۔''

''اگرچہ تمہارے وعدے پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا لیکن میں تمہیں جیل جاتے بھی نہیں دیکھ سکتا اس لیے میں تمہاری ضمانت لیتا ہوں۔''

نینسی نے خوشی سے چیخ ماری اور جان کا گال چوم لیا پھر اسے خیال آیا ''ویسے تم میرے پیچھے کیسے آ گئے۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔''

''میں نے تمہیں گھر سے روانہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔'' جان نے گال صاف کیا ''مجھے خیال آیا تو میں تمہارے پیچھے لگ گیا۔ راستے میں ذرا سی دیر کی بنا پر میں وقت پر ایئر فیلڈ نہ پہنچ سکا اور طیارہ تم سب کو لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے پولیس سے رابطہ کیا۔ تمہاری خوش قسمتی کہ ان کا ایک ہیلی کاپٹر علاقے میں پرواز کر رہا تھا۔ اس نے طیارے کا تعاقب کیا۔ تمہارے طیارے کے پائلٹ نے چالاکی سے کام لے کر ریڈیو آن رکھا تھا۔ اس سے ہم تم لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ لیفٹیننٹ نے آواز سن کر شیرف کو شناخت کر لیا تھا۔ اسی بنا پر پولیس نے اتنی تندہی دکھائی ورنہ صرف تمہارے لیے پولیس والے اتنی تیزی سے حرکت میں نہ آتے۔''

جان کی اس بات پر نینسی منہ بنا کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼